پیار کی خوشبو

ہما کوکب بخاری

پیار کی خوشبو

رشتے ختم ہو جانے سے انسان بے چہرہ اور بے شناخت نہیں ہو جاتے۔ ہم زندگی میں محبت و بہت سے خانوں میں تقسیم کر دیتے ہیں اور ہر کسی کو اس کے حصے کی محبت دیتے ہیں اس لیے کہ ہم اس کے پابند بنا دیئے گئے ہیں۔ انسان کی کتاب زندگی میں ہر لمحہ کی اہمیت ہوتی ہے۔

ایک ایسی لڑکی کا قصہ جو ہر کسی کو اس کے حصے کی محبت دینے کی قائل تھی۔

''جھوم کر گاؤ۔ رقص فرماؤ۔'' اسد نے غزالہ کیانی کے کمرے میں داخل ہوتے ہی تالی بجا کر تان لگائی تو اس نے مسکراتے ہوئے اپنے گھنے لانبے سیاہ بالوں کو ایک ادا سے جھٹکا۔

''آج ان ریشمی گھٹاؤں کو!

یوں نہ بکھراؤ کہ......''

''تھینکس۔ تم ہمیشہ بہت اچھے کمپلی مینٹس دیتے ہو۔''

اس نے بیگ اپنی کرسی کے ساتھ لٹکایا۔

''حادثے روز ہوتے رہتے ہیں۔

بھول بھی جاؤ۔''

اور اس کی اس بات پر پورے فیچرز سیکشن میں قہقہے گونج اٹھے۔ غزالہ کی آمد پر ہونے والی ہلچل نئی نہیں تھی۔ جب وہ اپنی ہیل کی ٹک ٹک کی ردھم پر بالوں کو جھٹکتی شولڈر بیگ کو ایک سے دوسرے کاندھے پر منتقل کرتی آفس میں داخل ہوتی تھی تو تالاب کے ٹھہرے پانی میں کوئی کنکر پھینک کر ایسی ہی ہلچل مچاتا تھا اور اس وقت تو یہاں اسد بھی موجود تھا جس کی موجودگی میں یوں بھی تالاب کی سطح ساکن نہیں رہتی تھی۔

میں نے کن اکھیوں سے غزالہ کی جانب دیکھا۔ اس کا مسحور کن حسن جسے کسی میک اپ کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر بھی وہ اسے سنوار کر رکھتی تھی۔ خوبصورت بال جنہیں وہ گفتگو کے ہر فقرے کے اختتام پر ایک ادا سے جھٹکتی تھی۔ کمپیوٹر کی بورڈ سے الجھتی خوبصورت انگلیاں اس کے باوجود میں اسے دیکھ کر الجھ جاتی تھی۔ معلوم نہیں مجھے دیکھتے ہی اسے کیا ہو جاتا تھا۔ اس

کی شخصیت کی دلکشی ایک عجیب سی کرختگی میں بدل جاتی تھی۔ اکثر وہ بلا وجہ مجھے گھورنے لگتی تھی۔ یہ بات صرف میں نے ہی نہیں تقریباً سبھی نے محسوس کی تھی۔

''تمہیں دیکھتے ہی غزالہ کیانی کے چہرے پر زلزلے کے آثار کیوں نمودار ہو جاتے ہیں؟'' ناہید نے یہ بات محسوس ہونے کے بعد پوچھا تھا۔

''میری سمجھ سے بالاتر ہے یہ بات۔ اچھی بھلی شکل کے زاویے مجھے دیکھتے ہی بگڑ جاتے ہیں۔''

''تم اس سے کلیئر کرا لو یہ بات۔''

''کیا ضرورت ہے۔'' میں نے کندھے اچکائے۔ ''میں اسے بری لگتی ہوں۔ جبھی تو اس کا موڈ بگڑ جاتا ہوگا۔''

''لیکن ہر بات کا کوئی معقول جواز ہوتا ہے۔''

''بعض اوقات پسند یا ناپسند کا کوئی معقول جواز نہیں ہوا کرتا۔ جس طرح پہلی نظر کی محبت کے فلسفے کو مانا جاتا ہے، ایسے ہی پہلی نظر کی ناپسندیدگی کا نظریہ بھی قبول کرنا پڑے گا۔''

''لیکن تمہارے آنے کے شروع دنوں میں اس کا تمہارے ساتھ رویہ ایسا نہیں تھا۔'' ناہید جرح کرنے پر مُصر تھی۔

''ہو سکتا ہے پہلے اس کی شدت ایسی نہ ہو۔'' میں نے خیال ظاہر کیا۔ ''اس کے علاوہ تو کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔''

''پھر بھی اسے بلا جواز ایسا رویہ نہیں اپنانا چاہیے۔ وضع داری بھی آخر کسی چیز کا نام ہے۔''

''کیا ہونا چاہیے اور کیا ہوتا ہے میں بہت فرق ہے۔'' میں نے ٹائپ رائٹر سے صفحہ نکالا۔ ''ویسے ایک بات طے ہے۔''

''وہ کیا؟'' ناہید نے میرے لکھے ہوئے فیچر کو الٹنا پلٹنا شروع کیا۔

''وہ یہ کہ پسندیدگی اور ناپسندیدگی دوطرفہ عمل ہوتی ہے۔ میرا مطلب ہے کم از کم نوے فیصد کیسوں میں۔ جسے ہم ناپسند کرتے ہیں وہ بھی عموماً ہمیں ناپسند کرتے ہیں اور جسے ہم پسند کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس کے خیالات بھی ہمارے بارے میں ویسے ہی ہوتے ہیں۔'' میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ ''چند لوگوں کو چھوڑ کر۔''

''ان دس فیصد لوگوں کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟''

''بات کچھ نفسیاتی ہو جائے گی۔ نو فیصد یہ مخالف صنف کے لیے کہی جا سکتی ہے اور ایک فیصد اپنی صنف کے لیے۔ مثلاً بہت سے لڑکے ایسی لڑکیوں سے محبت کیے جاتے ہیں جو انہیں ناپسند کرتی ہیں اور بہت سی ایسی لڑکیاں بھی ہیں جو ایسے مردوں سے محبت کیے جاتی ہیں جو ان سے محبت نہیں کرتے۔'' میں نے تفصیل سے کہا۔ ''رہ گئے آخری ایک فیصد۔ یہ زیادہ تر فرسٹریٹیڈ معاشرے کی اسکول کی عمر کی لڑکیوں کے ساتھ ہوتا ہے جو اپنی ہی کسی کلاس فیلو یا ٹیچر کو اس قدر پسند کرنے لگتی ہیں اور اس کے اعصاب پر اتنی زیادہ سوار رہتی ہیں کہ بجائے وہ شفقت اور محبت سے پیش آنے کے ایسی لڑکی کو دیکھتے ہی بدکنے لگتی ہیں۔''

''بس بس۔'' ناہید نے ہاتھ اٹھائے۔ ''نفسیات میرا مضمون نہیں ہے۔''

''وہ تو میرا بھی نہیں ہے۔ بس عام تجزیہ ہے۔''

''میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ تم بھی غزالہ کو اسی قدر ناپسند کرتی ہو جتنی وہ تمہیں۔''

''بالکل، لیکن میری ناپسندیدگی بلا جواز بھی نہیں ہے۔ کسی کی شکل آپ کو دیکھ کر بگڑ جائے تو ظاہر ہے آپ اس پر صدقے واری تو نہیں ہوں گے ناں۔''

اور اسی وقت دروازہ ایک جھٹکے سے کھول کر غزالہ کیانی اندر داخل ہو گئی تھی۔ میں کہہ نہیں سکتی کہ اس نے میری اور ناہید کی گفتگو سنی تھی یا نہیں۔ اگر سنی تھی تب بھی اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔

کمرا اب تک اسی طرح تھا۔ اسد غزالہ کی میز پر بیٹھا اس سے باتیں کر رہا تھا۔ ناہید ایک انٹرویو کے سلسلے میں تیاری کر رہی تھی۔ خالد پوسٹر کے ساتھ الجھ رہا تھا۔ میں ایک مرتبہ پھر اپنے ٹائپ رائٹر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ بجلی والوں کی مہربانی کی وجہ سے میں کمپیوٹر استعمال کرنے سے قاصر تھی۔

''ہری اَپ آشا میں بہت لیٹ ہو رہا ہوں۔'' عامر نے ٹائپ رائٹر پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ شاید ابھی کیبن میں داخل ہوا تھا۔

''آشا نہیں عائشہ۔'' میں نے ہمیشہ کی طرح اس کی تصحیح کی۔

''ایک ہی بات ہے۔'' اس نے بھی بے نیازی سے ہمیشہ والا جواب دیا۔

''ایک نہیں ہے۔'' وہ گفتگو تھی جو تقریباً ہر روز دہرائی جاتی تھی اور آج بھی ہماری

ملاقات کا آغاز ایسے ہی ہوا تھا۔

"اچھا بی بی، ایک نہیں ہے لیکن اٹھو تو۔"

"لیکن جانا کہاں ہے؟"

"بہت اہم پریس کانفرنس کور (Cover) کرنی ہے۔"

"اور یقیناً تمہاری بائیک کے اسپارک پلگ میں کچرا آ گیا ہوگا۔ اس کا کلچ ٹوٹ چکا ہوگا۔ اس کا ٹائر ڈھیلا ہو گیا ہوگا۔ یا وہ اسٹارٹ نہیں ہو رہی ہوگی۔"

"تمہارے سب انداز سے غلط ہیں۔" وہ متانت سے مسکرایا۔ "میں نے پسٹن ڈلوایا ہے۔"

"شکر ہے تمہاری بائیک میں کوئی نئی چیز تو پڑی۔" میں نے کلمۂ شکر ادا کیا۔

"لیکن مسئلہ یہ ہے کہ نئے پسٹن کی وجہ سے میں بائیک معمول کی رفتار سے چلانے سے قاصر ہوں۔ کم از کم ایک ہزار کلومیٹر کچھوے کی رفتار سے مکمل کرنے ضروری ہیں۔"

"کاش میں وہ وقت دیکھ سکتی جب تمہاری بائیک مکمل طور پر ٹھیک ہوا کرتی تھی کیونکہ اب ایسا وقت کبھی نہیں آ سکتا۔" میں نے اپنے بیگ سے کار کی چابی نکال کر اس کی جانب بڑھائی۔ "یہ لو۔"

"کیا مطلب ہے تم ساتھ نہیں چلو گی؟"

میری نظریں خود بخود غزالہ کیانی کی میز کی طرف اٹھ گئیں۔ اپنی کرسی سے پشت ٹکائے وہ ہماری جانب ہی متوجہ تھی اور میک اپ کی دبیز تہیں بھی اس کے تاثرات کی راہ میں رکاوٹ نہیں ڈال سکی تھیں۔ میز پر بیٹھ کر ٹانگیں ہلاتے اسد کے چہرے پر شریری مسکراہٹ تھی۔

"نہیں، میں اس وقت بہت اہم فیچر لکھ رہی ہوں۔" میں عامر کی طرف متوجہ ہوئی۔

"مجھ سے زیادہ اہم نہیں ہے تمہارا فیچر۔ چلو اٹھو۔" اس نے ٹائپ رائٹر سے صفحہ کھینچ نکالا۔

"اوہو، یہ کیا کر رہے ہو عامر۔ حد ہوتی ہے کسی چیز کی۔"

"میں بھی یہی کہہ رہا ہوں کہ حد ہوتی ہے کسی بات کی۔ بے کار کی ضد کر رہی ہو تم۔" وہ بھی ایک ہی چیز تھا۔ "اٹھو میں لیٹ ہو رہا ہوں۔"

اور مجھے اٹھنا ہی پڑا۔ یہ نہیں کہ مجھے اس کے ساتھ جانا پسند نہیں تھا۔ بات صرف اس

قدر تھی کہ اخبار میں "ڈیڈ لائن" کی اہمیت بہت زیادہ تھی، خاص کر اس صورت میں جب غزالہ کیانی سیکشن انچارج ہو۔

"اگر مجھے نامکمل فیچر پر ڈانٹ پڑی تو میں نے تمہیں سامنے کر دینا ہے۔" اس کا ساتھ دیتے ہوئے تیزی سے سیڑھیاں اُتر رہی تھی۔

"کر دینا سامنے۔" وہ بے نیازی سے بولا۔ "ویسے اگر یہاں آس پاس حاتم طائی کی قبر ہوتی تو میں اس پر لات مار کر تمہارا فیچر مکمل کرنے کا وعدہ بھی کر لیتا۔"

"اچھا ایک منٹ۔" میں واپس جانے کے لیے پلٹی۔

"کدھر چل دیں؟" وہ مڑا۔ "دیر ہو رہی ہے۔"

"میں حاتم طائی کی قبر کا انتظام کرنے جا رہی تھی۔"

"جلدی آؤ۔ قبر کے بغیر بھی کام چل جائے گا۔"

"وعدہ؟" اس وقت اس سے اپنا مطالبہ منوایا جا سکتا تھا۔

"وعدہ۔"

اور میں نیچے اتر آئی۔

"بیوقوف لڑکی اس وقت کچھ اور مانگ لیتیں تو میں وہ بھی پورا کر دیتا۔ اس وقت میرا شاہی مزاج پورے جوبن پر تھا۔"

"اپنے پاس رکھو اپنے وعدے۔" میں نے کہا۔

وہ کار اسٹارٹ کر کے پرل کانٹی نینٹل ہوٹل کی طرف بڑھا۔ یہ بات بالکل خاموشی سے ہمارے درمیان طے پا گئی تھی کہ میرے ساتھ میری کار پر جانے کی صورت میں وہی ڈرائیو کیا کرتا تھا۔ وہ اسے میرا حق قرار دیتا تھا جو ایک طاقتور مرد کے لیے ایک کمزور عورت کو دینا ضروری ہو اور میں اس بات کو اس کی شاؤنیزم کی تسکین پر محمول کرتی تھی۔

میری اور عامر کی دوستی کا آغاز اسی اخبار میں آ کر ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے ایک سال قبل اخبار جوائن کیا تھا اور اب لاہور کے بہترین صحافیوں میں سے ایک سمجھا جاتا تھا۔ مجھے بھی اخبار سے منسلک ہوئے آٹھ ماہ ہونے کو آئے تھے اور اس دوران میں نے بھی کافی ترقی کر لی تھی۔ میں زیادہ تر سیاسی تجزیہ نگاری کرتی تھی اور مجھے ایک بڑے حلقے میں پڑھا اور سراہا جاتا تھا۔ ہمارے اخبار کا ماحول بہت اچھا تھا اور وہاں خاصی دوستانہ فضا بھی تھی اس لیے میں جلد

ہی سب میں گھل مل گئی تھی۔ عامر رپورٹنگ میں تھا جب کہ میں فیچرز سیکشن میں۔ یوں تو وہاں سب ہی میرے اچھے دوست تھے لیکن میری اور عامر کی دوستی کی بات ہی اور تھی۔

عامر مجھے اس لیے بھی اچھا لگتا تھا کہ اس کے سانولے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ حلیہ اس کا عام رپورٹروں والا ہی تھا یعنی ایک جینز اور مختلف اوقات میں بدلی جانے والی دو چار قمیصیں۔ ہاں اگر کسی خاص تقریب میں جانا ہوتا تو اس دن سب رپورٹرز خاصے اہتمام سے آیا کرتے تھے لیکن ایسا بہت کم ہوتا تھا کیونکہ اکثر و بیشتر ایسی تقاریب میں شرکت کرنے کے لیے روزمرہ کے کام سے ہی وقت نکالنا پڑتا تھا۔

یہاں ہر طرف ہر لحاظ سے سکون ہی سکون تھا۔ بس ایک غزالہ کیانی کی بات مختلف تھی۔ پہلے پہل میں نے اس کے رویے کے متعلق بہت سے اندازے لگائے تھے لیکن اب اس پر توجہ دینی چھوڑ دی تھی۔

اور اب آج پرل کانٹی نینٹل سے واپسی پر جب عامر نے اس کی سبز سہارو کے ساتھ ہی کار پارک کی تو اپنی کار کا دروازہ بند کرتے کرتے اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور بغیر وش کیے اندر چلی گئی۔

''خیریت تو ہے۔'' عامر نے حیرت سے کہا۔ ''تمہیں دیکھتے ہی اس کے نتھنے کیوں پھولنے لگتے ہیں۔''

میں کندھے اُچکا کر رہ گئی۔ اپنے کیبن میں داخل ہونے سے پہلے ہی میری چھٹی حس مجھے آنے والے حالات کے بارے میں خبردار کر چکی تھی۔ ابھی میں ٹھیک سے اندر داخل بھی نہ ہو پائی تھی کہ غزالہ کیانی نے مجھے غضبناک انداز میں گھورا۔

''فیچر مکمل ہو گیا؟''

''نہیں۔'' میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

''کب ہو گا مکمل اور کب پیسٹنگ کے لیے جائے گا۔ تمہاری وجہ سے صفحہ رکا ہوا ہے۔ اخبار یوں سیر سپاٹے ہوتے ہوئے نہیں چلا کرتے۔ تمہارا کام سب سے آخر میں ختم ہوتا ہے۔'' وہ غصے سے بل کھا رہی تھی۔

''شاید سب سے آخر میں ہی ختم ہوتا ہو لیکن ڈیڈ لائن سے پہلے تمہیں مل جاتا ہے، اس لیے زیادہ شور کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے بازو پہ بندھی نازک سی گھڑی دیکھی۔

''اور ابھی میرے پاس پورا ایک گھنٹہ ہے۔''

میرے اطمینان اور ٹھنڈے مزاج پر وہ جل کر رہ گئی۔ اگر وہ اپنی بات کے جواب میں مجھ سے کسی فرمانبردارانہ رویے کی توقع کر رہی تھی تو میرے جواب نے یقیناً اسے مایوس کیا تھا۔ میں اپنا ادھورا آرٹیکل لے کر رپورٹنگ کی طرف بڑھی۔ عامر ''پرل'' میں ہونے والی پریس کانفرنس کی خبر بنا رہا تھا۔

''فیچر پورا کرو۔'' میں نے کاغذات اس کے سامنے رکھ دیے۔

''میرا اتنا زیادہ کام پڑا ہوا ہے۔ ایسا کرتے ہیں کہ۔'' پھر وہ پُرخیال انداز میں بولا۔

''پرامس (Promise) اگلا فیچر میں پورے کا پورا لکھ دوں گا لیکن آج کا خود پورا کر لو۔'' وہ کمپیوٹر کے کی بورڈ (Key Board) پر تیزی سے انگلیاں چلانے لگا۔

''میرا فیچر مکمل کرو ابھی اور اسی وقت۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر۔''

''میں نے پرامس تو کیا ہے کہ اگلا......''

''فیچر مکمل کر دو ورنہ یہ پیپر ویٹ سیدھا تمہارے سر میں لینڈ کرے گا۔''

''افوہ لڑکی۔ تم نے تو تنگ ہی کر مارا ہے۔'' اس نے کاغذات اٹھا لیے۔ ''یہ کس چیز کے متعلق؟''

''دیکھ لو خود ہی اور میرے لیے چائے منگواؤ۔'' میں ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

''گل خان! دو چائے لانا کڑک سی۔'' اس نے چپڑاسی کو آواز دی اور ایک بار پھر کاغذات کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''اب تو تھوڑا ہی رہ گیا ہے۔''

''زیادہ ہوتا تو تمہیں نہ دیتی۔''

وہ میرا فیچر مکمل کرنے لگا اور میں نے ایک کپ چائے اس کے لیے اور ایک اپنے لیے بنالی۔

''ہیلو بوائز۔'' غزالہ کیانی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ ''کیا ہو رہا ہے؟''

''کام ہو رہا ہے۔'' اس نے کہا۔

''عامر کو اب فیچرز سیکشن میں آ جانا چاہیے، وہاں کا سارا کام سنبھال رکھا ہے اس نے۔'' اس نے واضح طور پر مجھ پر طنز کیا تھا۔

''قسم سے ایسا کر لو۔'' میں نے اسے چڑانے کی غرض سے کہا۔ ''اگر تمہاری جگہ عامر

اور عامر کی جگہ تم آ جاؤ تو کم از کم ایک سیکشن بہتر ہو سکتا ہے۔''

میری بات پر وہاں موجود تمام لوگ ہنس دیے۔ غزالہ بس گھور کر ہی رہ گئی۔

پھر چند دن بعد یہ عقدہ کھلا کہ اس کے اس رویے کی وجہ کیا ہے۔ جب میں، عامر اور ناہید آفس میں بیٹھ کر بیڈن روڈ سے حلوا پوری لا کر کھانے کا پروگرام بنا رہے تھے، باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ایسے موسم میں یوں بھی اس قسم کی چیزیں کھانے کا اپنا ہی لطف ہوتا ہے۔ ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ وہ اندر داخل ہوئی۔

''کب سے تمہیں ڈھونڈ رہی تھی عامر۔'' اس نے مجھے اور ناہید کو یکسر نظر انداز کر دیا۔

''خیریت؟'' عامر نے پوچھا۔

''آج لکھنے کا بالکل دل نہیں چاہ رہا۔ پلیز میرا تھوڑا سا کام کر دو۔'' وہ اس کی کرسی کی ہتھی پر ٹک گئی۔ اس کے کھلے لہراتے بال عامر کے شانوں سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے اور اس کی خوشبو سے سارا کمرہ معطر ہو رہا تھا۔

''میں مصروف ہوں۔'' عامر نے رکھائی سے کہا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''آؤ آشا پوریاں لے آئیں۔''

''یہ ہے تمہاری مصروفیت۔'' وہ بالکل ہی تپ گئی۔ ''تمہارے پاس حلوا پوریاں لانے کا وقت ہے لیکن میرا کام کرنے کا وقت نہیں ہے۔ ابھی یہی کام عائشہ نے کہا ہوتا تو تم اس کا کام سر کے بل کرتے۔''

میں ایک لمحے کے لیے بالکل سُن رہ گئی۔ وہ ایسی بات بھی کہہ سکتی ہے۔ یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ اس کی بات سن کر میں چپ کی چپ رہ گئی۔

''ہاں اس کا کام میں سر کے بل کروں گا۔ یہ تو بندے بندے پر منحصر ہوتا ہے۔'' اس نے پہلے کی طرح رکھائی سے کہا۔ ''چلو آشا!''

''تم چلو۔ مجھے کچھ کام ہے۔'' میں نے بمشکل اس شاک سے سنبھلتے ہوئے کہا۔

''میں کر دوں گا تمہارا کام تم چلو۔''

اس کے بعد غزالہ کیانی کے پاس وہاں کھڑے رہنے کا جو کچھ بھی جواز تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ وہ زور سے دروازہ بند کر کے باہر نکل گئی۔

''تمہارے منہ پر بارہ کیوں بجنے لگے؟'' وہ بولا۔

''کچھ نہیں۔ یہ لو چابی اور سب کے لیے پوریاں لے آؤ۔''

''تم نے غزالہ کی بات مائنڈ کی ہے؟''

''ظاہر ہے اس قسم کی فضول بات کون برداشت کر سکتا ہے۔''

''چھوڑو یار یہ یونہی کرتی ہے۔ تم کیوں اپنا دل جلاتی ہو۔'' ناہید نے مجھے تسلی دینے کی غرض سے کہا۔

''ایک تعلیم یافتہ اور اس ماحول میں کام کرنے والے شخص کو ایسی بات زیب نہیں دیتی۔'' میں بولی۔

''کچھ لوگ پڑھے لکھے جاہل ہوتے ہیں۔''

''آشا میرے ساتھ چلو۔ مجھے تم سے کچھ بات بھی کرنی ہے۔'' عامر جو اس وقت سے کی چین انگلی میں گھما رہا تھا، بولا اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی کمرے سے نکل گیا۔

میں نے بے بسی سے ناہید کی طرف دیکھا۔

''میری طرف کیا دیکھ رہی ہو۔ پوریاں لاؤ۔ قسم سے بہت بھوک لگ رہی ہے۔''

''تم نہیں چلو گی؟'' میرے لہجے میں سوال سے زیادہ مدد کی پکار تھی۔

''مشکل ہے۔'' اس نے میز پر بکھرے کاغذوں اور ڈکٹا فون کی طرف اشارہ کیا۔ ''ابھی کل کے لیڈ پیج (Lead Page) کے لیے انٹرویو تیار کرنا ہے اور پھر آج گھر بھی جلدی جانا ہے۔''

میں چپ چاپ بیگ کاندھے پر ڈال کر باہر نکل آئی۔ عامر میرا ہی انتظار کر رہا تھا۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے کار اسٹارٹ کر دی۔

''چڑ جانے یا پریشان ہونے سے بہتر ہے کہ دوسروں کو چڑا دو یا پریشان کر دو۔'' اس نے چیرنگ کراس عبور کر کے اسمبلی ہال کی سڑک پر کار بڑھائی۔ ''افسردہ یا پریشان ہونے کے بجائے اگر تم اس سے ٹھنڈے لہجے میں بات کرتیں تو وہ یقیناً تپ جاتی۔''

''لیکن اس نے بات ہی ایسی کی تھی کہ میں......'' میں خود ہی چپ ہو گئی۔

''خیر اب اس بات کو بھول جاؤ۔'' وہ ونڈ شیلڈ کے پار دیکھ رہا تھا۔ ''مجھے تم سے کچھ اور کہنا تھا۔''

''کیا؟''

''میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔''

اس کی یہ بات اس قدر اچانک اور اتنی غیر متوقع تھی کہ مجھے یہ تک سمجھ میں نہ آیا کہ میرا ردِعمل کیا ہونا چاہیے۔

''پہلی نظر کی محبت نہیں۔ اس پر میں یقین ہی نہیں رکھتا میں نے تمہیں بہت اچھی طرح دیکھا ہے۔ تمہارے خیالات اور تمہاری عادات جاننے کے بعد میں نے خود میں یہ جذبہ بیدار ہوتے محسوس کیا ہے۔'' اس نے میری طرف دیکھا، میں حیرت سے اسے تکے جا رہی تھی۔

''تم کیا محسوس کرتی ہو؟''

ایک اور غیر متوقع سوال۔

''میں؟'' میرے ذہن میں برسوں پہلے دیکھے ہوئے ایک شخص کی پرچھائیں لمحہ بھر کو آئی۔ ''پتا نہیں۔''

''میں تمہیں پروپوز کرنا چاہتا ہوں لیکن مزید کوئی قدم اٹھانے سے پہلے تمہاری رائے لینا ضروری سمجھتا ہوں۔'' اس نے کار روکی۔ ''میرا خیال ہے کہ تم نے کبھی اس موضوع پر سوچا ہی نہیں۔ آرام سے سوچ کر جواب دینا۔''

وہ کار سے اُتر کر دکان کی طرف بڑھ گیا۔ اس سے اتنی بے تکلفی کی مجھے توقع ہی نہیں تھی۔

میں نے بوندوں سے بھیگے شیشے کے اس پار اسے دیکھا جو اب دکاندار سے مصروفِ گفتگو تھا۔ اونچا لمبا قد، سانولی رنگت اور مسکراتا ہوا چہرہ، کبھی کبھی بے خیالی میں ماتھے پر آ جانے والے بال، پینٹ کی اُڑی رنگت کے اوپر کراتی کی خوبصورت قمیص۔ وہ اچھا تھا، بہت اچھا۔ گو کہ میں عمر کے اس دور سے نکل آئی تھی جب لڑکیاں اپنے ہم سفر میں ملز اینڈ بون کے ہیرو جیسی خوبیاں دیکھنے کی خواہش مند ہوتی ہیں۔ پھر بھی اس میں شک نہیں کہ وہ ظاہری طور پر ویسا ہی تھا۔

میرے اور اس کے خیالات بہت حد تک ملتے جلتے تھے۔ اس میں وہ سب خوبیاں موجود تھیں، جو مجھے پسند تھیں اس کا علم وسیع تھا۔ انگریزی اچھی تھی، اردو پر عبور تھا، شاعری پسند تھی، کرنٹ افیئر سے دلچسپی تھی۔ اپنے ذہن سے سوچنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس کی لائبریری میں خوبصورت کتابیں تھیں۔ وہ نہ صرف اچھا لکھتا بلکہ اچھا بولتا بھی تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ صحافی تھا۔

لیکن اس کا گھر کہاں ہے؟ گھر والے کیسے ہیں؟ قسم کی باتوں کا مجھے بالکل علم نہیں تھا۔ اس نے خود بھی کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا۔ نہ ہی کبھی میرے سامنے کسی نے اس سے یہ

بات پوچھی تھی۔

میں اسی کی جانب دیکھ رہی تھی جب وہ دکان سے مطلوبہ چیزیں لے کر مڑا میں نے ایک دم نگاہوں کا زاویہ تبدیل کر دیا۔ میرے برابر سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس کے وجود سے نکلتی One man Show کی بھینی بھینی خوشبو پوری کار میں پھیل گئی۔ واپسی پر ہمارے درمیان کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔

رات کو سونے سے پہلے میرے ذہن میں یہی واقعہ گردش کرنے لگا۔ ماضی میں جو ہوا میں اسے کب کی بھول چکی تھی لیکن عامر کی بات نے ایک بار پھر خوابیدہ یادوں کو بیدار کر دیا تھا۔ میں نے ذہن سے ماضی کی سوچیں جھٹک دیں۔ یہ حال تھا اور میرے سامنے مستقبل تھا۔ میں نے حال میں جینا تھا اور پھر عامر ہر لحاظ سے اچھا تھا، میری اس کے ساتھ کافی زیادہ انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ ہم ایک دوسرے کے عادی تھے۔ وہ بہت خوش خلق اور ملنسار تھا لیکن ساتھ ہی اپنے حقوق کی حفاظت کرنا بھی جانتا تھا۔ اس کا رویہ ہر ایک کے ساتھ اچھا تھا۔ تاوقتیکہ کوئی خود ہی اس سے نہ اُلجھ پڑے۔

آج میں محسوس کر رہی تھی کہ غزالہ کیانی اکثر و بیشتر اس سے قریب ہونے کی کوشش کرتی رہتی تھی شاید غزالہ اسے پسند کرتی تھی۔ میں نے سوچا اور مجھے درمیان میں آتا دیکھ کر بپھر گئی تھی۔ ہاں یہی ہو سکتا ہے اس کے رویے کا منطقی جواز لیکن تب تک تو مجھے احساس ہی نہیں تھا۔

عامر کی باتیں اور اس کی عادات اس وقت مجھے یاد آ رہی تھیں۔ پتا نہیں کیسے بالکل چپکے سے وہ میرے دل میں چلا آیا تھا۔ شاید میرا لاشعور پہلے ہی اسے قبول کر چکا تھا۔ تبھی تو شعور نے بغیر کسی اعتراض کے لاشعور کے فیصلے پر مہر ثبت کر دی۔ آج کے اظہار کے بعد وہ خود بخود ہی میرے دل میں چلا آیا تھا۔ یہ واقعہ یاد کر کے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

رات ڈھائی بجے کا وقت تھا۔ سب سوئے ہوئے تھے۔ میں آہستگی سے لیونگ روم سے ٹیلی فون اٹھا لائی۔

''اس وقت عامر آفس میں ہی ہو گا۔'' میں نے سوچا اور آفس کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

اتفاق سے دوسری طرف وہی تھا۔

''ہیلو۔'' اس کی خوبصورت آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''مجھے پتا چل گیا ہے۔''

''کیا؟'' اس نے میری آواز پہچان لی تھی۔

''یہی کہ میں بھی وہی محسوس کرتی ہوں جو تم کرتے ہو۔''

''ہرے۔'' اس نے نعرہ لگایا اور میں نے ہنس کر فون بند کر دیا۔

اس سے یہ بات کہہ کر میں بہت ہلکی پھلکی ہو گئی تھی اور خود وہ کتنا خوش ہوا تھا۔ میں نے تکیے میں منہ چھپا لیا۔ چاہنا اور چاہے جانا اور اپنانا اور اپنائے جانا کس قدر خوبصورت اور خوش کن احساس ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ مجھے آج ہوا تھا۔ ماضی کے تجربے کے باوجود بھی۔ اچھا اس وقت بھی لگا تھا لیکن یہ احساس نہیں ہوا تھا۔ اس سے چند باتیں کرنے کے بعد میں نے بھابی اور امی سے بھی بات کرنی تھی۔ وہ اکثر و بیشتر مجھ سے اس موضوع پر بات کیا کرتی تھیں۔ پہلے میرے پاس پڑھائی کا بہانا تھا اس کے فوراً بعد نوکری کی مصروفیات میں یہ بات گول کر دیتی تھی۔ بڑی بھابی کے ساتھ میری بہت دوستی تھی۔

''اگر کوئی پسند ہے تو بتا دو، میں سب سے منوالوں گی۔'' وہ اکثر کہتیں۔

''بھابی! سب سے پہلے آپ کو بتاؤں گی۔'' میں ہنستی۔ ''لیکن پہلے کوئی ملے تو۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم جیسی کیوٹ لڑکی کو کوئی ملا نہ ہو۔''

''مجھے تو بہت ملے ہیں لیکن میں ابھی تک کسی کو نہیں ملی۔'' میں پھر ہنستی۔ ''میرا مطلب ہے، اب تک اس سے نہیں ٹکرائی جس سے اصل میں ٹکرانا چاہیے تھا۔''

''میں ڈھونڈوں؟''

''بھابی! ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ جب میری شادی کا وقت آئے گا تب ہو جائے گی۔ نہ اس سے پہلے ہو گی نہ بعد میں۔''

''چلو، میں انتظار کروں گی لیکن اپنا وعدہ یاد رکھنا اور سب سے پہلے مجھے بتانا۔''

اور اب میں صبح کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی تاکہ بھابی کو عامر کے متعلق بتاؤں۔ نہ مجھے نیند آ رہی تھی اور نہ رات بیت رہی تھی۔ ساری رات میں عامر کے متعلق سوچتی رہی۔

''شاید وہ بھی میرے متعلق سوچ رہا ہو۔'' یہ سوچ کر میں مسکرا دی۔

ہر صحافی کی طرح میں بھی صبح دیر تک سونے کی عادی تھی لیکن رات نیند کہاں آئی تھی مجھے۔ ناشتے کی میز پر مجھے موجود پا کر سبھی کو حیرت ہوئی۔

''یہ تم صبح سویرے منہ اندھیرے صبح آٹھ بجے کیسے اٹھ گئیں۔'' بڑے بھیا کو واقعی

حیرت تھی۔

''کل جلدی آ گئی تھی ناں۔''

''پہلی مرتبہ تو جلدی نہیں آئیں۔'' عمران نے چائے پیالی میں انڈیلی۔ ''لیکن نوکری کرنے کے بعد پہلی مرتبہ تمہیں ناشتے کی میز پر سب کے ساتھ دیکھ رہے ہیں۔''

''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے جناب۔'' میں نے کرسی گھسیٹی۔

میز پر میری ذات اور میرے آرٹیکل ہی موضوع گفتگو تھے لیکن میں سب باتوں سے بے خبر اپنے سلائس اور چائے کی پیالی سے کھیل رہی تھی۔ امی، ڈیڈی اور بھائیوں کے اٹھنے کے بعد بھابی میرے پاس چلی آئیں۔

''کچھ چپ چپ ہو اور ایکسائیٹڈ بھی۔'' انہوں نے میرے چہرے کا جائزہ لیا۔

''آپ نے یہ اندازہ کیسے لگایا؟''

''میں پچھلے ساڑھے چار سال سے اس گھر میں ہوں اور تم سے میری دوستی بھی کم نہیں ہے۔ تمہارے مزاج کو اچھی طرح جانتی ہوں میں۔''

''اس میں کوئی شک نہیں۔'' میں مسکرائی۔ ''میں نے آپ کو کچھ بتانا تھا۔''

''بتاؤ، میں سن رہی ہوں۔''

میں نے انہیں گزشتہ روز کا تمام واقعہ تفصیلاً بتا دیا اور عامر کو کیا ہوا فون بھی۔

''بہت اچھا لڑکا ہے وہ۔'' بھابی چہکیں۔ وہ متعدد بار اس سے مل چکی تھیں۔ میرے سب کولیگز سے ان کا کسی نہ کسی صورت تعارف تھا۔

''پتا نہیں ایک رات میں کیا ہو گیا۔ وہ مجھے اچھے سے بھی زیادہ اچھا لگنے لگا ہے۔''

''کروں امی ڈیڈی سے بات؟'' انہوں نے پوچھا۔

''ابھی اس سے تو تفصیلاً بات ہو جائے پھر ظاہر ہے آپ کو ہی کرنا ہو گا یہ کام۔''

''جلدی کرو جو کچھ کرنا ہے۔ مجھے یوں بھی اپنی گڑیا کو دلہن بنے دیکھنے کا بہت شوق ہے۔'' انہوں نے محبت سے مجھے دیکھا۔

آفس میں یوں تو سب کچھ ویسا ہی تھا۔ گل محمد نے روز کی طرح کھٹاک کر کے سیلوٹ نما سلام کیا تھا۔ سیڑھیوں کے کونوں میں ویسے ہی کچرا پھنسا ہوا تھا۔ رپورٹنگ سیکشن خالی تھا۔ غزالہ کیانی کے چہرے کے زاویے بھی حسب سابق مجھے دیکھتے ہی بگڑ گئے تھے۔ اس کے

باوجود بھی ہر چیز نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ غزالہ کو نظر انداز کر کے میں کمپیوٹر میں فلاپی ڈسک ڈال کر پرسوں کیا ہوا انٹرویو ٹائپ کرنے لگی۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھ کر مجھے مسلسل گھور رہی تھی۔

پتا نہیں کیا بات ہے کہ جب بھی کوئی بغور میری سمت دیکھے مجھے علم ہو جاتا ہے۔ چاہے اس شخص کی جانب میری پشت ہی ہو۔

''تمہارا کیا ہوا انٹرویو بالکل بے کار ہے۔'' بالآخر اس نے لب کشائی کی۔

''اس کا مطلب ہے کہ یہ انٹرویو کی کیسٹ سن چکی ہے۔'' میں نے دل میں سوچا اور پھر کی بورڈ کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''بہت سے پوائنٹس۔ تم نے ڈسکس نہیں کیے۔''

میں نے Space Problem کی طرف اس کی توجہ مبذول کروانے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ یہ وہ خود بھی جانتی تھی اور میں ایک فضول قسم کی بحث میں الجھنا نہیں چاہتی تھی۔

''تم آج کل بالکل بھی اپنے کام کی طرف توجہ نہیں دے رہیں۔'' اس نے ایک اور کمنٹ دیا۔ لگتا تھا کل کی گرما گرمی سے ابھی تک تپی ہوئی ہے۔

''اچھا۔'' میں نے ایسے کہا کہ میری بات میں حیرت کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ یوں جیسے کسی نے کچھ کہہ دیا اور آپ نے سن لیا۔

''یوں بھی آج کل تمہاری دلچسپی کام کے بجائے کہیں اور ہے۔'' وہ کہہ رہی تھی۔ ''یوں اخبار میں کام نہیں چلتا۔''

''اچھا۔'' میں نے پھر صرف اسی قدر کہنے پر اکتفا کیا۔

''اس اچھا اچھا سے کام نہیں چلے گا۔'' وہ مکمل طور پر جھلا گئی۔ ورنہ اس کا طرز تخاطب کبھی ایسا نہ ہوتا۔ ''مجھے ٹھیک کام چاہیے۔ تمہارے ان یکسانیت کے شکار فیچرز سے اب یہ صفحہ زیادہ دن نہیں چل سکتا۔ لوگ سیاست اور آئین سے ہٹ کر کچھ پڑھنا چاہتے ہیں۔ تم کنٹری بیوٹر نہیں اخبار کی ملازم ہو اس لیے انہیں وہ کچھ پڑھنے کے لیے دو جو وہ پڑھنا چاہتے ہیں۔ لوگوں کے نزدیک چار روپے کی اہمیت ہوتی ہے اس قسم کے بور آرٹیکل چار روپے دے کر پڑھنے سے کہیں بہتر ہے کہ انہیں ڈسٹ بن میں پھینک دیا جائے۔''

میں جانتی تھی کہ اس کی بات کتنی پھس پھسی اور دلیل کس قدر بے وزن ہے۔ بے چاری کو غصہ اتارنے کا موقع نہیں ملا تو ایک فضول سی بات کو ایشو بنا لیا۔

''انگریزی اخبار پڑھے لکھے لوگوں کے لیے ہوتا ہے اور کوئی بھی تعلیم یافتہ شخص اس انداز میں نہیں سوچتا۔ رہ گئے پڑھے لکھے جاہل تو میں ان کے لیے لکھتی بھی نہیں۔''

''You are Getting Personal (تم ذاتیات پر آ رہی ہو) تم مجھے پڑھا لکھا جاہل کہہ رہی ہو۔'' گرمی اس کے دماغ تک پہنچ چکی تھی۔

''تمہارے پاس اس قسم کی باتوں کے لیے وقت ہوگا لیکن میرے پاس اتنی فضول بحث کے لیے وقت نہیں ہے اور میرا اتنا مغز بھی نہیں ہے کہ تم سے سر پھٹول کر سکوں۔'' میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اگر واقعی کوئی کام کی بات کرنی ہو تو میں رپورٹنگ میں ہوں گی۔''

اس کے چہرے پر میرے لیے سوائے نفرت کے کچھ نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد ناہید آ گئی۔

''پھر کچھ ہوا؟'' اس نے پوچھا میرے اور غزالہ کیانی کے جھگڑے کے وقت وہ آفس میں موجود نہیں تھی۔

''وہی روز کی بحث۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

''اور بات یقیناً کچھ نہیں ہوگی۔'' وہ میز ہی کے ایک کونے میں ٹک گئی۔ ''مسئلہ صرف اس قدر ہے کہ وہ عامر کو پسند کرتی ہے اور عامر کی تم سے دوستی ہے۔''

''اب اگر ایسا ہے تو میں کیا کر سکتی ہوں۔'' میں نے کندھے اُچکائے۔ ''میں نے عامر سے نہیں کہا کہ وہ اسے نظر انداز کر کے مجھ سے دوستی کرے۔''

''لیکن کانٹا تو تم ہی ہو، اس لیے تم ہی اس کی آنکھ میں کھٹکو گی بھی۔''

''میرے پاس اتنی فضول باتیں سوچنے کا وقت بھی نہیں ہے۔'' میں ایک بار پھر کی بورڈ سے الجھ گئی۔ مجھے کام کرتا دیکھ کر ناہید وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ہمارا کمپیوٹر استعمال کرنے کے پیسے لگتے ہیں۔'' کام کرتے اسد کی آواز سن کر میں چونک گئی۔

''شرم کر یار، اپنی ہونے والی بھابی سے بھی پیسے لے گا۔'' اس کے پیچھے عامر بھی تھا۔ وہ اور اسد بہترین دوست تھے۔

''فضول گپ نہ چھوڑا کرو۔'' میں پھر دوسری طرف متوجہ ہوگئی، اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لیے۔

''روز ایسی گپ نہیں لگ سکتی کیا؟'' اسد بولا۔ ''رات ڈھائی بجے بھی پتا نہیں جانے

کہاں سے کیک لے آیا تھا منہ میٹھا کرانے کے لیے۔''

اسد کے انکشاف پر میں نے عامر کو گھورا۔

''قسم سے اور کسی کو پتا نہیں ہے کہ تمہاری وجہ سے منہ میٹھا کیا گیا ہے۔ میں نے صرف یہ کہا تھا کہ جس سے میں نے اظہار کیا تھا اس سے اقرار کی خوشی میں منہ میٹھا کراؤں گا۔'' اس نے فوراً صفائی پیش کی۔

''ہوناں رپورٹر۔ زبان بند نہیں ہوئی تمہاری۔ سارے زمانے میں خبر نشر کر دینا۔'' میں نے دانت پیسے۔

''تو حرج ہی کیا ہے۔''

''کوئی حرج نہیں ہے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

اسد ہمیں لڑتا دیکھ کر باہر جانے لگا۔

''آپ کہاں چل دیے شہد لگا کے؟'' عامر نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی جانب گھسیٹا۔

''تمہارا اس قسم کی لڑائیوں کا وسیع تجربہ ہے جب کہ میری پہلی بار ہے۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

''تم دونوں ایک دوسرے کی مدد کرو۔ میں اس کا پرنٹ نکال آؤں۔'' میں فلاپی ڈسک لے کر چل دی۔

شام کو میں تقریباً فارغ ہی تھی جب عامر فیچرز کے کیبن نما کمرے، جسے ہم شاہانہ انداز میں فیچرز سیکشن کہا کرتے تھے، میں داخل ہوا۔

''چلو، آواری چلنا ہے۔''

''کیوں؟''

''بھئی پریس کانفرنس ہے۔'' اس نے آنکھ سے اشارہ کیا۔

''آج کس کی اتنی اہم پریس کانفرنس ہے کہ چیف رپورٹر بہ نفس نفیس اسے کور کرنے جا رہے ہیں۔'' غزالہ کیانی میز پر کہنیاں ٹکا کر بولی۔

''پیر کرم الٰہی آف چک ایک سو بیس کی پریس کانفرنس ہے۔'' عامر نے اتنے اطمینان سے کہا کہ میری ہنسی نکل گئی۔

''عامر یا تم فیچرز میں آجاؤ یا پھر عائشہ کو بھی رپورٹنگ میں لے جاؤ۔ الگ الگ تم

دونوں کا گزارا بہت مشکل ہے۔''

''ہاں، کچھ ایسا ہی سوچ رہا ہوں۔ خود آشا بھی یہی چاہتی ہے۔''

''چلیں عامر۔'' میں اس کے قریب آگئی۔

''چلو۔''

''بے چاری جل کر کباب ہوئی جا رہی تھی۔'' میں باہر نکل کر بولی۔

''جلنے دو اور اگر بہت ہمدردی ہے تو برنال دے دو۔''

کمرز میں عامر نے چائے اور سینڈوچ کا آرڈر دیا اور میری طرف متوجہ ہوا۔

''کل رات تمہارا فون آنا بہت اچھا لگا۔ اگر تم اس کے لیے صبح کا انتظار کرتیں تو مجھے لگتا کہ تم میرے لیے اتنی شدت سے نہیں سوچ رہی ہو جتنی شدت سے میں سوچ رہا تھا۔''

میں مسکرائی۔ اسے میری شدتوں کا اندازہ ہی کہاں تھا۔ ''میں نے بھابی سے بات کی ہے۔''

''پھر ان کا ردعمل کیا تھا؟''

''بہت خوش تھیں وہ۔''

''میرے ساتھ ایک مسئلہ ہے آشا جو میں تمہیں پہلے ہی بتا دینا چاہتا ہوں۔''

''ایک اور بار، نہیں عامر۔'' میرے دل کے نہاں خانوں نے صدائے احتجاج بلند کرنی چاہی لیکن میں نے دھڑکتے دل سے صرف اسی قدر کہا۔ ''بتاؤ۔''

''بہت بچپن میں میرے ممی اور پاپا میں علیحدگی ہوگئی تھی۔ اس وقت میں صرف چھ سال کا تھا۔ میری ممی کو گھر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور میں آیاؤں کی نگرانی میں پرورش پا رہا تھا۔ انہیں کسی سے محبت نہیں تھی، سوائے اپنی ذات کے۔ پاپا بھی کچھ کم نہیں تھے۔ ان کی دلچسپی بزنس اور عورتیں تھیں۔ اس گھر میں کسی کو دوسرے کی پروا نہیں تھی۔ کسی کو بھی کسی سے محبت نہیں تھی۔ پیار نہیں تھا۔ اب سوچتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ اتنے عرصے بھی یہ رشتہ نہ جانے کیسے قائم رہا ہوگا۔ ان دونوں میں سے کسی کے وجود میں محبت تھی ہی نہیں۔ ضرورت کا ایک تعلق تھا جسے بالآخر توڑ دیا گیا۔'' وہ چپ ہوگیا۔

''پھر؟''

''دونوں نے دوسری شادی کر لی۔ کافی عرصہ دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی غرض سے مجھ پر حق جماتے رہے اور میں شٹل کاک کی طرح کبھی ایک اور کبھی دوسرے کورٹ

میں گرتا رہا۔ پھر مجھے بورڈنگ میں داخل کر دیا گیا۔ میں نے آشا، آج تک حقیقی گھر نہیں دیکھا۔ کبھی کسی نے مجھ سے ایسی محبت نہیں کی جسے میں واقعی محبت کہہ سکوں۔'' اس کے لہجے میں دکھ، حسرت اور نہ جانے کیا کیا تھا۔

''اب ایسا نہیں ہے اور نہ ہی ایسا ہوگا۔ جو زیادتی تمہارے ساتھ ہوگئی، اس کی تلافی تو کوئی بھی نہیں کر سکتا لیکن ہم مستقبل کو تو بہتر بنا سکتے ہیں۔''

''ہاں۔'' اس کے سانولے چہرے پر مسکراہٹ لوٹ آئی۔ ''مجھے تم اسی لیے اچھی لگی تھیں کہ تم مہربان اور محبت کرنے والی ہو۔ تم کسی کو دکھ اور تکلیف میں مبتلا نہیں دیکھ سکتیں۔''

''تمہارا آگے کا کیا پلان ہے؟''

''میں یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد بھی ممی اور پاپا کے پاس نہیں گیا اور نہ ہی وہاں جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ کالج کے وقت سے اب تک میں نے اخراجات کے نام پر ان سے ایک دھیلا بھی نہیں لیا اور نہ ہی کبھی انہوں نے اس بات پر استفسار کیا، اس لیے اب ان کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرا کوئی اور ایسا قریبی رشتے دار بھی نہیں ہے جو پرپوزل تمہارے گھر لے جاسکے۔ اس لیے یہ فرض مجھے ہی ادا کرنا ہوگا۔ شادی سے پہلے ایک مکان کرائے پر لینا ہوگا کیونکہ آج کل میں ہوسٹل میں رہ رہا ہوں۔ اصل میں چھڑا چھانٹ دیکھ کر کوئی مکان کرائے پر دینے کو تیار نہیں ہوتا۔''

میں مسکرائی۔ ''چلو اب چھڑا چھانٹ ہونے والا مسئلہ تو ختم ہو جائے گا۔''

''تمہیں میری تنخواہ کے ساڑھے پانچ ہزار روپے میں گزارا کرنا پڑے گا۔ ویسے اس میں اضافے کا مسئلہ زیرِ غور ہے۔''

''بہت بہتر۔ کیونکہ میری تنخواہ بھی ساتھ لگ جائے گی۔''

''اوں۔ ہوں۔ ہرگز نہیں۔ میری چیز تمہاری اور تمہاری چیز بھی تمہاری۔''

''یہ بھلا کیا بات ہوئی؟''

''یہ ایسے ہی رہے گا۔ بولو شرط منظور ہے یا نہیں؟''

''بالکل منظور ہے۔'' میں ہنسی۔

''اور آنے جانے کے لیے یہی کھٹارا موٹر سائیکل استعمال کرنی ہوگی جسے تم دن میں کم از کم بیس مرتبہ صلواتیں سناتی ہو۔''

''اور میری جان سے پیاری کار؟''

''وہ تم استعمال کرتی رہنا۔''

''اور تم؟''

''موٹر سائیکل۔''

''تم شاؤنسٹ۔ جیسے ابھی تو اپنی بائیک پر ہی آئے ہو یہاں۔''

''اس وقت تم میری دوست ہو۔ تب بیوی ہوگی۔''

اور ہم لڑتے جھگڑتے کار میں بیٹھ گئے۔

''شادی سے پہلے اس آرام دہ گاڑی کا خوب مزا لے لوں۔'' اس نے تنگ کرنے والے انداز میں کہا۔

''اُتر جاؤ، ابھی اور اسی وقت۔''

اس نے کار بنس کر کار گیئر میں ڈالی اور مال روڈ پر لے آیا۔

''مجھ غریب غرباء کے پاس کوئی کیسٹ پلیئر بھی نہیں ہے۔ شادی سے پہلے اس ڈیک پر خوب گانے سنوں گا۔''

میں نے غصے سے اسے گھورا۔ اس نے ڈیش بورڈ سے ایک کیسٹ نکال کر سین سوئی کے ڈیک میں لگا دی استاد امانت علی کی آواز سپیکرز سے ابھری۔

''آ میرے پیار کی خوشبو
منزل پہ تجھے پہنچائے
تُو چنتا صرف مجھی کو
پہچان تجھے گر ہوتی!
انصاف سے تُو خود کہتا
یہ کنکر ہے یہ موتی
میرا پیار مجھے سمجھائے
آ میرے پیار کی خوشبو

☆=====☆=====☆

غزالہ کیانی کو بھی غالباً کسی گڑبڑ کا احساس ہوگیا تھا۔ اسی لیے عامر کے گرد اس کے چکر

بڑھ گئے تھے۔ مجھے عامر کے ساتھ دیکھ کر وہ بالکل ہی تہذیب کا چولا اتار پھینکتی تھی اور کونین کی گولی کو تہذیب کا شوگر کوٹ کرنا بھی بھول جاتی تھی اس کے سامنے تو وہ کم ہی بولتی تھی لیکن اس کی غیر موجودگی میں وہ ضرور کوئی نہ کوئی ریمارک دیتی رہتی تھی۔

میں بنیادی طور پر صلح جُو اور امن پسند قسم کی لڑکی تھی۔ اسی لیے اس کی بہت کم باتوں کا جواب دیتی تھی۔ میرے نزدیک وہ باتیں درخورِ اعتنا ہی نہیں تھیں لیکن اس بات پر مجھے حیرت ہوتی تھی کہ عامر کے روکھے رویے کے باوجود بھی وہ کمال ڈھٹائی سے اس پر اپنا امپریشن جمانے کی کوشش میں مصروف رہتی تھی۔ کبھی میں خود کو اس کی جگہ رکھ کے سوچتی کہ اگر کوئی مجھ سے اتنی رُکھائی سے پیش آئے تو میں تو دوبارہ اس بندے کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہ کروں۔ لیکن وہ لگتا تھا کسی اور ہی مٹی کی بنی ہوئی ہے۔

''پتا ہے عامر! انکل ریاض چوہدری بتا رہے تھے کہ کچھ فارن اسکالر شپ (Scolarship) آئے ہیں۔'' اس نے اپنے ایک سیاستدان انکل کا حوالہ دیا۔

''اچھا'' عامر نے اس سے کچھ معلوم کرنے کی بھی کوشش نہیں کی لیکن لگتا تھا کہ وہ بھی ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں ہے۔

''ابھی تک اناؤنس نہیں ہوئے پبلک کے لیے۔''

اس مرتبہ عامر نے جواب دینے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔

''تم کہو تو تمہیں مل سکتا ہے۔'' اس نے ایک جھٹکے سے اپنے بال پیچھے کیے۔ ''یوں بھی تم اتنے لائق ہو۔ قسم سے فارن میں پڑھنے سے انسان کی زندگی بن جاتی ہے۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

''مذاق مت کرو۔'' وہ اس کے چہرے کے قریب میز پر کہنیاں ٹکا کر ہتھیلیوں کے پیالے میں اپنا خوبصورت چہرہ رکھ کے اس سے مخاطب ہوئی تو میرا خون کھول اٹھا۔ غصے سے میں نے کی بورڈ پر تیزی سے انگلیاں چلانی شروع کر دیں۔ اس کا معطر خوشبوئیں بکھیرتا وجود اس وقت مجھے زہر لگ رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ اسے ایک جھٹکے کے پیچھے کھینچ لوں۔ آخر ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ وہ اسے پسند نہیں کرتا، اس سے بات نہیں کرنا چاہتا اور یہ ہے کہ گھسی چلی آ رہی ہے۔

''بس میرے کہنے کی دیر ہے کہ ویزا تمہارے گھر پہنچ جائے گا۔'' وہ بالوں کو جھٹکا دے کر کہہ رہی تھی۔ قریب ہونے کی وجہ سے اس کے بال عامر کے چہرے کو چھوتے ہوئے

اس کے کندھے سے پیچھے چلے گئے۔

اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا، ہاتھ میں پکڑی ہوئی آئین کی کتاب میں نے میز پر پٹخی اور کرسی گھسیٹ کر باہر دروازے کی جانب چل دی۔

''مِس کیانی میرے اتنا قریب آنے کا حق صرف ایک لڑکی کو ہے اور وہ آپ نہیں ہیں۔'' عامر نے سخت لہجے میں کہا۔

شرمندگی اور خجالت سے غزالہ کا چہرہ لال پڑ گیا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے سیدھی ہوئی اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ میں نے گہری سانس لے کر پشت دیوار سے ٹکائی۔ کمرے میں موجود سب لوگ چپ تھے۔

''اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی۔'' بعد میں عامر نے مجھ سے کہا۔

''مجھے ڈر لگتا ہے۔''

''پاگل ہو۔''

''نیا انکشاف نہیں ہے میرے لیے۔'' میں نے منہ بنایا۔

''ہاں جانتا ہوں کہ یہ جراثیم کافی پہلے سے تم میں موجود ہیں اور اب تمہاری اس بیماری کا علاج کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ بولا۔ ''میری زندگی میں تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں آ سکتی یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا' غزالہ کیانی کے مزاج کی لڑکیاں تو مجھے یوں بھی ناپسند ہیں۔''

''وہ بہت خوبصورت ہے۔''

''میں ظاہر کے حسن کے بجائے باطن کا حسن زیادہ پسند کرتا ہوں اور یوں بھی انسان کو وہی شخص سب سے خوبصورت دکھائی دیتا ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے۔'' وہ بولا تو میں مسکرا دی۔

''ویسے لگتا تو نہیں ہے کہ تم کسی سے یوں بھی جل سکتی ہو۔'' اس نے مجھے تنگ کرنے کے لیے کہا۔

''میں جلی نہیں ہوں۔ تم آفس کی یا باہر کی کسی لڑکی سے باتیں کرو میں بالکل مائنڈ نہیں کروں گی لیکن عامر! غزالہ کیانی نہیں۔ وہ چھیننے کا، حاصل کرنے کا ہنر جانتی ہے۔ ہم عام سی لڑکیاں یہ کچھ نہیں جانتیں۔ ہم غزالہ کیانی جیسی لڑکیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔''

''بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔ اب چھن جانے کا کیا سوال' آخر مجھے دو سال ہونے والے ہیں یہاں کام کرتے ہوئے۔ وہ لڑکی مجھے تب متاثر نہیں کر سکی تھی جب تم میری زندگی

میں نہیں آئی تھیں تو اب کیا کرے گی؟"

"ویسے اب میرا اس سیکشن میں کام کرنا مشکل ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"تمہارا سیکشن تبدیل کرنے کے لیے میں انتظامیہ سے بات کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے تم میگزین میں آ جاؤ۔" اس نے مشورہ دیا۔ "اور جب تک سیکشن نہیں تبدیل ہو جاتا تب تک غزالہ کیانی پر زیادہ توجہ ہی مت دو۔"

اور دو دن بعد ہی غزالہ کیانی ایک نئے چہرے کے ساتھ آفس میں داخل ہوئی۔

"Meet this gentleman جاوید مغل۔" اس نے تعارف کروایا۔ "یہ میری یہ دریافت ہے۔" میں نے ایک نظر نو وارد کا جائزہ لیا۔ وہ دیکھنے میں خاصا اسمارٹ تھا اور چہرے سے ذہین بھی لگتا تھا۔

"یہ بہترین سیاسی تجزیہ نگاری کرتا ہے۔" اس نے ایک اور اعلان کیا۔ "عائشہ پر کام کا بوجھ بہت زیادہ تھا اور پھر اس کے آرٹیکل بھی یکسانیت کا شکار ہوتے جا رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ اس کا بوجھ ہی کچھ کم کر دوں۔ جاوید مغل کافی کام سنبھال سکتا ہے۔"

وہ ہر طرح سے میری اہمیت ختم کرنا چاہتی تھی لیکن مجھے کوئی پروا نہیں تھی۔ میری اپنی ایک اہمیت تھی جس سے انتظامیہ کو انکار نہیں تھا۔ میرے نام کی مارکیٹ تھی جسے ہر کوئی تسلیم کرتا تھا۔ جاوید مغل کی آمد کے متعلق میں نے عامر کو بتایا۔

"روشنی اور خوشبو کے پاؤں میں بیڑیاں کس نے ڈالی ہیں۔" اس نے کہا۔

لیکن غزالہ نے اسی پر بس نہیں کیا۔

"عائشہ میرا خیال ہے کہ تم کچھ عرصے کے لیے ریلیکس کرو۔" وہ خوشبو کے جھونکے کی طرح میرے پاس آئی۔

"تم کس طرح مجھے ریلیکس کروانا چاہتی ہو؟"

"انسان کی شخصیت کو متنوع ہونا چاہیے۔ اس طرح تو تم پر ایک ہی چھاپ لگ جائے گی۔"

"اچھا!"

"میرا خیال ہے کہ تم اب ذرا مختلف سا موضوع لو۔" وہ مشورہ دینے والے کے سے انداز میں بولی۔ "مثلاً لاہور میں کھانوں کے مختلف مراکز کے بارے میں فیچر خاصا دلچسپ رہے گا۔"

وہ مجھے دودھ سے مکھی کی طرح نکال پھینکنا چاہتی تھی لیکن میں نے زیادہ پروا نہیں کی۔

عامر نے بات کر لی تھی اور چند دن میں میرا سیکشن تبدیل ہونے والا تھا۔ ایسے وقت میں، میں نے غزالہ کیانی کو مایوس کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

"بہت بہتر۔ ہو جائے گا۔" میں نے جواب دیا۔

فیچر واقعی کافی دلچسپ تھا اور مزیدار بھی۔ ہر جگہ مزے مزے کے کھانے کھانے میں بھلا کس کو اعتراض ہو سکتا ہے۔ لاہور تو یوں بھی طرح طرح کے لذیذ کھانوں کے سلسلے میں مشہور ہے۔

"کہاں تک پہنچا تمہارا فیچر؟" عامر نے پوچھا۔

"بڑے ہوٹل، چائنیز اور پوش علاقوں کے ریسٹورنٹ کور کر لیے ہیں لیکن لاہور کے کھانوں کی اصل دلکشی تو لکشمی چوک یا اندرون شہر ہے۔" میں نے کہا۔ "پر وہاں اکیلے جانا مشکل ہے۔"

"ہم کس لیے ہیں؟" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکا۔

"ہاں۔ مجھے وہاں جانے کے لیے ایک ڈرائیور اور محافظ کی ضرورت ہے۔" میں شرارت سے ہنسی۔

"کہہ سکتی ہو کیونکہ تمہیں معلوم ہے کہ ہم کچے دھاگے سے بندھے آئیں گے۔"

اور پھر آدھا رپورٹنگ اور فیچرز سیکشن لکشمی چوک پہنچ گیا۔ رپورٹرز کے متعلق تو یوں بھی مشہور ہے کہ ان کے کپڑوں میں بڑی بڑی جیبیں ہوتی ہیں۔ کھانے کا کوئی آئیٹم واپس نہیں جانے دیتے لیکن اس سلسلے میں ہمارا رپورٹنگ سیکشن غالباً سب سے آگے تھا۔ باقیوں کے کھانے پر تو اللہ میاں نے مہر لگا دی تھی لیکن لگتا تھا کہ یہ اپنی مہر جیب میں لیے پھرتے ہیں۔ جہاں کھانا دیکھا جھٹ اپنے نام کی مہر لگا لی۔ ظاہر ہے وہ لکشمی چوک جانے کا اتنا اچھا موقع کیسے ضائع کر سکتے تھے۔ وہاں حسب معمول ہم ورلڈ پالیٹکس، بڑی طاقتوں کی گلوبل پالیسیز، مسئلہ کشمیر اور ادب و فلسفے پر بحث کر رہے تھے کہ بات ملکی مسائل کی چل نکلی۔

"سب فریقین کو شامل کیے بغیر سندھ کے مسئلے کو حل نہیں کیا جا سکتا۔"

"لیکن کچھ سیاستدانوں کی سیاست چمک ہی اس مسئلے کی وجہ سے رہی ہے اور وہ کبھی ایک میز پر بیٹھ کر مسئلہ حل کرنے پر تیار نہیں ہو سکتے۔"

ہم سب اپنی اپنی رائے دے رہے تھے۔ جب تنور پر روٹیاں لگاتا ہوا ایک شخص ہماری طرف متوجہ ہوا۔

"آپ لوگ وہ بات کر رہے ہیں جو ہر کوئی جانتا ہے اور جسے ثابت کرنے کی کوئی

ضرورت نہیں ہے۔" وہ بولا۔ "آپ لوگ رپورٹرز ہیں۔ انویسٹی گیٹو رپورٹنگ بھی کرتے ہوں گے۔ کیا کبھی کسی نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ دہشت گرد کہاں سے آتے ہیں۔ آخر ان کا کوئی ٹھکانا ہوگا۔ وہ کسی عمارت، کسی مکان میں رہتے ہوں گے۔ Suddenly out of now here تو نہیں آجاتے وہ، اور پھر وہ فائرنگ کر کے کہیں جاتے بھی ہوں گے۔ ہوا میں تو تحلیل نہیں ہو جاتے ناں۔"

تنور پر روٹیاں لگاتے ایک عام شخص کے منہ سے اتنی رواں اردو اور شستہ انگریزی سن کر ہم ایک لمحے کے لیے تو اسے منہ کھولے دیکھتے ہی رہ گئے۔

"بھائی ایک مرتبہ پھر کہنا۔" عامر نے تحیر سے کہا۔ "کھانا کھاتے ہوئے ہماری سب حسیں ہمارا ساتھ چھوڑ جاتی ہیں۔"

"آسان سی بات ہے کہ دہشت گرد زمین سے اُگتے ہیں اور نہ ہی فضا میں تحلیل ہوتے ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ وہ کہیں سے نکلتے اور کام ختم کر کے کہیں جاتے دکھائی نہیں دیتے۔ ان کے اس طرح بھاگ جانے پر تو انتظامیہ بال برابر کلیو بھی حاصل نہیں کر سکتی۔ اس سے اچھا نہیں ہے کہ ایسے چند لوگوں میں ایک آدھ کو موقع پر ہی گولی ماردی جائے۔ اس طرح کچھ نہ کچھ سراغ تو ملے گا اور اگر سراغ نہیں ملتا تب بھی کم از کم ایک دہشت گرد تو ختم ہوگا۔"

"ویری انٹرسٹنگ۔" اسد نے کہا۔ "آپ نے ہمیں ایک نہایت اچھا آئیڈیا دیا ہے۔ ہم اس پر ضرور کام کریں گے۔"

"کیا آپ اپنے متعلق کچھ بتانا پسند کریں گے؟" ناہید نے پوچھا۔ جسے یکا یک اس نوجوان سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ فیچر رائٹر کو یوں بھی اس قسم کے بندوں کی تلاش رہتی ہے۔

"میں ایک عام سا انسان ہوں۔ اس کے علاوہ میرا کوئی حوالہ نہیں۔" وہ بے نیازی سے کہہ کر تنور پر جھک گیا۔

سب کے اصرار کرنے کے باوجود بھی اس نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

باقی سب اس کے بارے میں حیران تھے لیکن میں الجھن میں مبتلا تھی جب سے ہم یہاں آئے تھے تب سے وہ مسلسل میری جانب متوجہ تھا۔ میں باتیں کرتے کرتے اسے دیکھتی تو وہ یوں پوز کرتا جیسے اپنے کام میں مصروف ہو مجھے بھی اس کی صورت جانی پہچانی سی لگ رہی تھی لیکن بالکل یاد نہیں آرہا تھا کہ اسے کہاں دیکھا ہے۔ میرے لیے یہ ناممکن نہیں تب بھی

مشکل ضرور تھا کہ میں نے لکشمی چوک میں تنور پر روٹیاں لگاتے شخص سے کبھی ملاقات کی ہو یا اسے اس حد تک دیکھا ہو کہ اس وقت اس کی صورت پر شناسائی کے آثار دیکھ سکوں۔

وہ یقیناً دراز قد تھا اس بات کا اندازہ اس کے بیٹھے ہونے کے باوجود بھی لگایا جا سکتا تھا۔ اس کی رنگت دھوپ میں جلی ہوئی تھی اس کے کپڑے میلے اور مسلے ہوئے تھے۔ اس کے بال بری طرح الجھے ہوئے تھے، اس کی صحت تباہ حال تھی اور چہرے پر مصائب اور اضطراب تحریر تھے۔ اس کی شخصیت کی سب سے قابل توجہ اور سب سے خوبصورت چیز اس کی ذہانت سے بھرپور نیلی آنکھیں تھیں۔ اس کی عمر چھبیس یا اٹھائیس سال ہو گی لیکن اس کے تھکے ہوئے چہرے پر اتنی اذیتیں اور تکالیف تحریر تھیں کہ اتنی کم عمری میں ان کا تصور ہی ناممکن تھا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ صورت میری جانی پہچانی تھی۔ رہ رہ کے اس کی نگاہوں کی حدت میں اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی۔ پہلے تو میں نے اپنا وہم سمجھا تھا لیکن کچھ دیر بعد مجھے یقین ہو گیا کہ وہ مجھے ہی دیکھ رہا ہے۔ "کیوں؟" میں نے خود سے سوال کیا۔

"شاید میری صورت بھی اسے شناسا محسوس ہو رہی ہو۔" میں نے خود ہی جواب بھی دیا۔

وہ ایک تسلسل سے مجھے دیکھ رہا تھا اور جب میں اس کی جانب دیکھتی تھی تو وہ نگاہیں چرا لیتا تھا۔ دوسری جانب سب ایک مرتبہ پھر اپنے میں مگن ہو چکے تھے۔ میرے علاوہ سب ہی نے اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ یوں اپنے کام میں مصروف تھا گویا ہم میں سے کسی کو کسی کھاتے میں ہی نہ سمجھتا ہو۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ معصوم اور بے گناہ لوگوں کا قتل عام کیسے کر لیتے ہیں، کیا ان کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں پڑتا؟" ناہید بہت مہربان اور نرم دل تھی ہمیشہ یونہی الجھتی تھی۔ وہ لوگوں کے رویے بہت مشکل سے سمجھتی تھی۔

"کوئی عجب نہیں کہ تمہیں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔" میں نے پائے کے سالن میں نان ڈبویا۔ "ضمیر ہو تو کوئی بوجھ بھی ہو اس پر۔"

"ہاں انہوں نے شیطان کو اپنی روح بیچ رکھی ہے، ڈاکٹر فاؤسٹس کی طرح۔" عامر بولا۔

"ان کا اختتام بھی ڈاکٹر فاؤسٹس کی طرح ہونا چاہیے جنہیں جنت تو کیا قیامت تک جہنم بھی قبول کرنے سے انکار کر دے۔ تاقیامت شیطان کے چیلے رہیں جیسے اب ہیں۔"

"کیا آپ کے خیال میں ڈاکٹر فاؤسٹس کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا؟" وہی شخص روٹی

تنور میں لگاتے ہوئے ہماری جانب مڑا۔

ہم ایک مرتبہ پھر حیرت زدہ رہ گئے۔ ایک ایسے شخص کے منہ سے یہ بات سننا بہت حیرت ناک تھا۔

''بتائیں ناں کیا اس کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا؟'' اس مرتبہ اس نے اپنی بات پر زور دیا۔

''یہ انجام؟'' ناہید سنبھلی۔ ''میرے خیال میں مارلو نے فاؤسٹس سے بہت نرمی برتی تھی۔''

''نہیں ناہید، میں تم سے اتفاق نہیں کرتی۔ فاؤسٹس کو معافی ملنی چاہیے تھی۔'' میں نے کہا اور ہم دو گروپوں میں بٹ گئے۔ ایک گروپ کا خیال تھا کہ فاؤسٹس کا یہ انجام درست تھا جب کہ ہم اس کی مخالفت کر رہے تھے۔

''میرے نزدیک گوئٹے والا انجام زیادہ بہتر ہے۔ فاؤسٹ کو جنت میں جانا چاہیے تھا۔''

''کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ ان دہشت گردوں کو معافی مل جانی چاہیے؟'' ناہید ابھی تک اپنی بات پر ڈٹی ہوئی تھی۔

''ہرگز نہیں۔ فاؤسٹس بہت نیک تھا۔ میں نے ان دہشت گردوں کو فاؤسٹس کے ساتھ نہیں ملایا۔ اگر تم بغور مطالعہ کرو تو تمہیں محسوس ہوگا کہ بے چارا فاؤسٹس ظالم نہیں تھا۔ اس نے کسی پر ظلم نہیں کیا تھا اور خدا تعالیٰ اپنے حقوق تو معاف کر سکتا ہے لیکن اپنے بندوں کے نہیں۔ یہ دہشت گرد تو ظالم ہیں، انہیں معافی ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''یہ تم لوگ کہاں پہنچ گئے۔ بات یہ تھی کہ فاؤسٹس کو بھی گوئٹے کے فاؤسٹ (Foust) کی طرح معافی ملنی چاہیے تھی یا نہیں؟'' اسد بولا۔

تنور والا ہماری اس بحث کو بغور سن رہا تھا تاہم اس نے ہماری بحث میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ یہ ایک ایسی ڈسکشن کا آغاز تھا جس میں دونوں فریقین کے پاس دلائل کی کمی نہیں تھی۔

ہمارا کھانا ختم ہو چکا تھا لیکن بحث جاری تھی۔

''میں تو صرف اس قدر جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات غفور و رحیم ہے، وہ انصاف تو کرتا ہے لیکن رحمت کے تقاضے بھی فراموش نہیں کرتا۔'' وہی شخص بولا۔ اس کی آواز میں بہت کرب تھا۔ اس کا وجود یہاں تھا لیکن اس کی نیلی آنکھوں کی سوچ شاید کسی دوسری دنیا کی تھی۔

''اوئے عمیرے روٹیاں لا۔ کتھے صاحب لوگاں دیا گلاں وچ ٹائم خراب کرداا ے۔''

شاید وہ دکان کے مالک نے کہا تھا۔ ''ایہہ جیہاں گلاں روٹیاں تھاپن والے دے کم نہیں

آندیاں۔ توں کیہڑا کوئی پروفیسر لگنا اے۔'' (اوئے عمیرے روٹیاں لگا۔ توں کیوں صاحب لوگوں کی باتوں میں وقت برباد کرتا ہے۔ ایسی باتیں روٹیاں لگانے والے کے کام نہیں آتیں۔ کون سا تُو نے پروفیسر لگ جانا ہے۔)

وہ جیسے ایک دم اپنی دنیا میں واپس لوٹ آیا اور جلدی جلدی روٹیاں لگانے لگا۔

''اوئے عمیرے۔'' دکان کے مالک کی آواز میرے ذہن میں گونج رہی تھی اور پھر جیسے تمام پردے میری نگاہوں کے سامنے سے اٹھ گئے۔ بہت عرصہ پہلے کے دھیمے دھیمے دن اچانک میرے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

☆=====☆=====☆

ہیرے کی نازک سی انگوٹھی چپکے سے امی نے میری انگلی سے اتار لی۔ بغیر کچھ کہے۔ میں ان سے پوچھنا چاہتی تھی کہ یہ اچانک ہی کیا ہو گیا ہے۔ جتنی دھوم دھام سے یہ انگوٹھی پہنائی تھی اتنی ہی خاموشی سے اتار لی گئی، میری آنکھوں میں موجود تمام سوالات کو جانتے بوجھتے نظر انداز کر کے۔ یہ بات نہیں کہ امی یا ڈیڈی اس فیصلے سے خوش تھے۔ دکھ، افسوس اور میرے مستقبل سے متعلق اندیشے ان کی آنکھوں میں بھی تھے اور لبوں پر گہری خاموشی کی مہر۔

گزشتہ رات سے ان کی یہی حالت تھی۔ شام کو وہ بہت خوشی سے عمیر کے گھر گئے تھے۔ یوں بھی امی اور ڈیڈی ان لوگوں میں سے تھے جو خزاں میں بھی پھول کھلا دیا کرتے ہیں۔ گھر کی تمام رونق ان کے دم سے تھی اور پھر وہ اپنی اکلوتی بیٹی کے ہونے والے سسرال جا رہے تھے۔ خوشی تو قدرتی بات تھی۔ ان کے جانے کے بعد میں اپنی پڑھائی میں مصروف ہو گئی۔ وہ چھ بجے گھر سے گئے تھے، زیادہ سے زیادہ آٹھ بجے تک انہیں آ جانا چاہیے تھا لیکن نو بجے پھر ساڑھے نو ہو گئے۔ میری پریشانی میں دم بدم اضافہ ہو رہا تھا۔

''فون کر کے معلوم کرنا چاہیے۔'' میں نے سوچا۔

لیکن قباحت یہ تھی کہ میں نے پہلے کبھی وہاں فون نہیں کیا تھا۔ ابھی اسی اُدھیڑبُن میں تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

''ہیلو۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''بیٹا میں ہوں۔'' ڈیڈی نے کہا۔ ''ہم شاید لیٹ ہو جائیں۔''

''ڈیڈی آپ پہلے ہی کافی لیٹ ہو گئے ہیں۔'' میں نے شکوہ کیا۔

"مجبوری ہے۔" وہ بولے۔ "میں بھائی کو گھر بھیج رہا ہوں۔"

"بڑے بھیا اور عمران آپ کے ساتھ ہی ہیں؟"

"ہاں عمران آ گیا تھا، میرے ساتھ ہی تھا وہ۔ بڑے بھیا کام سے گئے ہیں۔"

میں بھائی کا انتظار کرنے لگی۔ وہ آئے تو خاصے چپ چپ تھے۔ خلافِ معمول انہوں نے آتے ہی چائے کی فرمائش بھی نہیں کی تھی۔

"خیریت تو ہے۔" میں مہکی۔ "یہ آپ کا منہ دس مرلے سے دس کنال کا کیوں ہو گیا۔"

"کچھ نہیں۔" وہ بیزاری سے بولے۔

"چھپانا چاہیں تو اور بات ہے، ورنہ دال میں کچھ کالا ہے ضرور۔"

"تم سو جاؤ دیر ہو گئی ہے۔" انہوں نے ٹالنے کی غرض سے کہا۔

"کیا؟ دس بجے ہی سو جاؤں؟ واقعی دال میں کچھ کالا ہے ضرور آج۔"

"بابا جو مرضی کرنا ہے کرو، بس میرا مغز نہ چاٹو۔"

"موجود ہے؟" میں نے ہنس کر ان کے سر کی طرف اشارہ کیا۔

"گھر آتے وقت تھا۔ اب نہیں رہا۔" وہ بھنا گئے۔

امی اور ڈیڈی وغیرہ رات کو کافی دیر سے گھر لوٹے سب ہی چپ تھے اور کچھ تھکے ہوئے بھی۔ رات گئے تک امی اور ڈیڈی کے کمرے میں کانفرنس ہوتی رہی۔ بڑے بھیا، بھائی اور عمران بھی شریک تھے۔ یہ سب غیر معمولی صورتِ حال کی نشانی تھی۔ میں یہ سب کچھ دیکھ کر پریشان ہو گئی لیکن یہ بات اس وقت بھی میرے وہم و گمان میں نہ تھی کہ آنے والے دن کا سورج میرے لیے کیا پیغام لانے والا ہے۔

منگنی سے پہلے سب نے میرے سامنے عمیر کی اس قدر تعریفیں کی تھیں کہ میں حیران تھی کہ اس دنیا میں اتنا پرفیکٹ انسان بھی کوئی ہو سکتا ہے۔

"ماشاءاللہ بہت اچھا ہے عمیر۔ اسکول کے زمانے سے اب تک پوزیشن لیتا آ رہا ہے۔ آخر یونہی تو کسی کو انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ نہیں مل جاتا۔ وہ بھی الیکٹریکل میں۔ ہے بھی بہت خوش باش قسم کا اور ذمہ دار اتنا کہ ایک مرتبہ کہنے کی دیر ہے چھوٹی سے چھوٹی ذمہ داری پوری کرتا ہے۔ روشن مستقبل ہے اس کا۔ روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں۔ پڑھا لکھا کر امریکہ بھجوانے کا ارادہ ہے اس کے باپ کا۔ بس عمیر ہی تو واحد امید ہے باپ کی۔ چھوٹا سا تھا تب ہی والدہ کی وفات ہو گئی تھی۔ بھائی

اکرام نے بالکل ماں بن کر پالا ہے اسے۔" اس کے متعلق بات کرتے ہوئے ان کی آنکھیں جگمگا اٹھتی ہیں۔ امی وقتاً فوقتاً میرے سامنے کہتی رہتی تھیں۔ "اللہ ایسے بیٹے سب کو دے۔"

پھر جب دیکھتیں کہ میں ابھی تک باربرا کارٹ لینڈ کے ناول میں محو ہوں تو میری دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیتیں۔

"اور ہے ایسا خوبصورت اور اسمارٹ کہ کیا بتاؤں۔"

"خوبصورت اور اسمارٹ یا ہینڈسم؟" میں سیدھی ہو جاتی۔

"ایک ہی بات ہے۔" وہ کہتیں۔ "چھ فٹ قد ہے پورا۔"

اور میں جو قد کے معاملے میں بے حد کریزی ہوں۔ ایک دم ہمہ تن گوش ہو جاتی اور مجھے متوجہ پا کر امی جان ایک مرتبہ پھر وہی کتھا شروع کر دیتیں۔

گھر میں عمیر کا ذکر بڑھنے لگا اور سمیعہ آپا کے چکر بھی۔ یہ رشتہ وہی لائی تھیں۔ وہ عمیر کی رشتے کی بھابی تھیں۔ مجھے یہ سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ہر کوئی میری جانب ہی متوجہ تھا جیسے میں کوئی وی آئی پی ہوں۔ سمیعہ آپا کا اصرار بڑھ رہا تھا۔ امی اور ڈیڈی بھی راضی تھے۔ صرف ایک مسئلہ تھا۔

"ابھی عائشہ بہت چھوٹی ہے۔" ڈیڈی کا مؤقف تھا۔

"تو عمیر کون سا بہت بڑا ہے، ابھی تو پڑھ ہی رہا ہے۔ پھر شادی میں بھی کچھ عرصہ لگے گا۔" سمیعہ آپا جواب دیتیں۔ "یوں بھی لڑکیوں کے بڑھنے کا کیا پتا چلتا ہے۔"

"ویسے اکرام بھائی کو اتنی جلدی کیا ہے؟"

"بس نفسیاتی سی بات ہے۔ کہتے ہیں کہ عمیر کی ممی کی وفات سے اب تک یہ گھر خوشیوں کو ترس رہا ہے۔ چاہتے ہیں کہ اپنی زندگی میں بیٹے کی خوشیاں دیکھ لیں۔" وہ بولیں۔

"ہم نے کہا بھی کہ اللہ آپ کی زندگی رکھے، آپ جلدی کیوں کرتے ہیں لیکن انہوں نے بھی ضد باندھ لی ہے۔"

"ہم اتنی چھوٹی عمر میں بچی کا رشتہ کرنے کے قائل نہیں ہیں۔" امی ٹال کرتیں۔

"بچیاں تو اپنے گھروں میں ہی اچھی لگتی ہیں اور پھر کم از کم چار سال تو لگیں گے ہی۔ تب تک عائشہ بی اے کر کے فارغ ہو جائے گی۔ زیادہ تر لڑکیوں کی شادی اسی عمر میں ہوتی ہے۔ ابھی تو صرف منگنی ہو گی۔"

"آپ لوگوں نے عمیر سے بھی پوچھ لیا ہے؟"

"تبھی تو میں یہاں ہوں۔" وہ مسکرائیں۔ "اسے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"بچیوں کا دل بہت نازک ہوتا ہے۔" ڈیڈی نے کہا۔ "ہم آپ پر بھروسا کر رہے ہیں۔"

"آپ اعتماد کر کے تو دیکھیں۔" سمیعہ آپا بہت خوش ہوگئیں۔ "اپنے طور پر بھی جس قدر چاہیں چھان بین کر لیں۔"

اور یوں میرا رشتہ طے ہوگیا۔ اس وقت میں میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی۔ مقررہ دن پر سمیعہ آپا نے آکر میری انگلی میں عمیر کے نام کی انگوٹھی پہنا دی۔ امی، ڈیڈی اور تینوں بھائیوں نے خوب دھوم دھام سے یہ فنکشن کیا۔ امتحانوں کے بعد میری اکثر سہیلیاں چھٹیاں منانے کی غرض سے شہر سے باہر تھیں۔ انہیں جب منگنی کا علم ہوا تو میرے سر پر پہنچ گئیں۔

"کب ہوئی؟ کس سے ہوئی؟" ایک اور بے تابانہ سوال۔

"سمیعہ آپا سے۔" میں نے ہنسی چھپاتے ہوئے معصومیت سے کہا۔

"کیا مطلب؟ طریقے سے بتاؤ ناں؟"

"بھئی اس میں کچھ بھی غلط نہیں ہے۔ انگوٹھی سمیعہ آپا نے ہی پہنائی تھی۔"

اور سب ہنس دیں۔

"مجھے وہ دن بھی یاد آیا جب عید کے دن وہ ہمارے گھر آیا تھا۔ وہ اسے دیکھنے کا میرا پہلا اور آخری موقع تھا۔ اس کی آمد کی اطلاع ظاہر ہے مجھے بھی تھی۔ بیل کی آواز کے ساتھ ہی میرے دل میں کھد بد شروع ہوگئی۔ میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا اور اس وقت اسے چپکے سے دیکھنے کا بہترین موقع تھا۔ میں ڈرائنگ روم کے دروازہ کی جھری سے اندر کا جائزہ لینے لگی۔ وہ واقعی زبردست تھا۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا، بات کرنا، مسکرانا اور سب سے بڑھ کر اس کا قد بھی کچھ بہترین تھا۔ اس کی شخصیت سحر انگیز تھی اس نے مجھے مکمل طور پر اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا جب اچانک کسی نے میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے میری ہلکی سی چیخ نکل گئی اور دروازہ ایک ہلکے سے دھکے سے آدھا کھل گیا۔

"کیا ہو رہا ہے؟" وہ عمران تھا جس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

"کچھ نہیں۔" میں ایک دم چور بن گئی۔ اب تک مجھے دروازہ کھلنے کا علم ہی نہیں تھا۔

"اتنا ہی شوق ہے دیکھنے کا تو اندر چلی جاؤ۔"

اسی وقت میری نظر کھلے ہوئے دروازے سے اندر ڈرائنگ روم میں موجود عمیر پر پڑی جو پُرشوق نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"پرے ہٹو عمران مجھے اپنے کمرے میں جانا ہے۔" میں اسے ہٹا کر ہنستی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔

کمرے میں پہنچ کر میری دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ ایک تو میرے لیے اس کے سحر سے نکلنا ہی مشکل تھا، پھر اس کی پُرشوق نگاہوں کی حدت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میری چوری رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی۔

اور اچانک ہی بغیر کوئی وجہ بتائے یہ منگنی توڑ دی گئی تھی۔ میں بہت دن تک چپ چپ رہی۔ ایک عجیب سی بے کلی تھی کچھ کھو دینے کا احساس تھا، افسردگی تھی۔ سب گھر والوں کو بھی میری اس کیفیت کا احساس تھا۔ تب ہی تو بھائی ہر طرح میری دل جوئی میں لگے رہتے تھے۔ کبھی پکنک، کبھی آئس کریم پارٹی، کبھی چائنیز میں ڈنر۔ رفتہ رفتہ سب کچھ معمول پر آ گیا۔ میرے ذہن نے بھی اس فیصلے کو قبول کر لیا کیونکہ میں جانتی تھی کہ میرے محبت کرنے والے ماں باپ اور بھائیوں نے یہ فیصلہ بلا وجہ نہیں کیا ہوگا۔ میں نے ان سے کوئی سوال نہیں کیا کیونکہ مجھے ان کے اس اقدام کی نیک نیتی پر شک نہیں تھا۔ سوال کر کے میں انہیں افسردہ نہیں کر سکتی تھی۔ ان دنوں میں سیکنڈ ائیر کی طالبہ تھی۔ کچھ عرصہ بعد بڑے بھیا کی شادی ہوگئی۔ بڑی بھابی کے ساتھ میری بہت گہری دوستی تھی۔ ان کے بعد چھوٹے بھائی کی بھی شادی ہو گئی۔ بھابی بہت اچھی تھیں لیکن اس سے میری زیادہ دوستی اس لیے نہیں ہو سکی کہ وہ شادی کے فوراً بعد بھائی کے ساتھ بیرون ملک چلی گئیں لیکن ان سے جب بھی ملاقات ہوتی یا فون پر بات ہوتی تو وہ بہت پیار سے ملتیں اور بات کرتیں۔ میں ایک بار پھر پڑھائی میں مصروف ہوگئی اور ایم اے جرنلزم کر کے میں ایک انگریزی اخبار کے ساتھ منسلک ہوگئی۔

☆=====☆=====☆

اور اب وہی عمیر میرے سامنے تھا۔ ایک لمحے میں جیسے ہر یاد میرے ذہن میں تازہ ہو گئی تھی۔

"لیکن یہ یہاں کہاں؟ کیسے؟ کس طرح؟ بات کیا تھی؟ میں نے منگنی ٹوٹنے کی وجہ دریافت نہیں کی تھی، کیا اس کی موجودہ حالت کا اس بات سے کوئی تعلق ہے؟" بہت سے

سوال میرے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔

میری آنکھوں میں شناسائی دیکھ کر وہ ایک دم نظریں چرا گیا۔

"کیا تھا آخر؟" مجھے کچھ خبر نہ تھی، میں تو بس مسلسل اسے دیکھ رہی تھی۔

"چلیں آشا؟" عامر نے مجھے متوجہ کر کے کہا۔

"ہاں چلو۔" میں جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ زیادہ دیر تک وہاں ٹھہرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔

سارا راستہ ناہید اسی کے متعلق مسلسل بولتی رہی۔ "بہت دلچسپ شخص ہے۔ اس کی ذہین ذہین آنکھیں دیکھ کر ہی مجھے سمجھ جانا چاہیے تھا کہ وہ تعلیم یافتہ ہے۔ ضرور کسی مسئلے یا مشکل سے دوچار ہوگا ورنہ تنور پر روٹیاں کیوں لگاتا بھلا۔ آج کل تو میٹرک پاس بھی میز کرسی والی نوکری مانگتے ہیں، یہ تو پھر اچھا خاصا مہذب لگ رہا تھا۔ اسے ادب اور سیاسیات سے بھی دلچسپی تھی۔ کچھ خاص بات ضرور ہے۔"

میں چپ بیٹھی سنتی رہی۔

"اسے جو کچھ بھی ہوا اس سے بھلا میرا کیا تعلق؟" میں نے راہِ فرار ڈھونڈی۔ "اس کا مجھ سے ایک رشتہ تھا جو اب ختم ہو چکا ہے۔ اب مجھے ایک ہی سورج کے گرد گھومنا ہے۔"

لیکن یہ کہہ دینا آسان تھا اس پر عمل کرنا بے حد مشکل تھا۔ اس بات کا احساس مجھے رات سونے کے لیے لیٹنے کے وقت ہوا۔ اس بات میں تو کوئی شک نہیں تھا کہ مجھے عامر سے محبت تھی، بہت شدید اور دنیا ادھر کی اُدھر ہو جاتی لیکن میرے دل اور میری زندگی میں عامر کے علاوہ کوئی نہیں آ سکتا تھا۔ پھر وہ کیا جذبہ تھا جو میں عمیر کے لیے محسوس کر رہی تھی؟ ہمدردی یا محض تجسس؟ اس بات کا فیصلہ میں اب تک نہیں کر سکی تھی۔ اس صدمے سے میں اب تک سنبھلی نہیں تھی جو مجھے عمیر کو اس حالت میں دیکھ کر ہوا تھا۔ میرے دل و دماغ میں بہت کشمکش تھی۔

"کیا ایک انسان جو کسی بھی حیثیت میں، ہماری زندگی میں آیا ہو، کیا اس سے تعلق ٹوٹنے کے بعد وہ ہمارے لیے ویسا ہی ہو جاتا ہے جیسا کہ کوئی اجنبی؟ جیسے شاہراہوں، بازاروں اور دکانوں میں یہاں سے آتے ہوئے بے شمار لوگ جو ہمارے لیے بے شناخت اور بے چہرہ ہوتے ہیں۔" میں خود سے سوال کر رہی تھی۔

"نہیں ایسا کیسے ممکن ہے؟" میں نے خود ہی جواب دیا۔ "شاید کسی اصول، کسی اخلاقی

ضابطے کے تحت ایسا ہی ہو یا ہی کرنے کی توقع کی جاتی ہو، لیکن عملاً ایسا ہونا ناممکن ہے۔ کم از کم میری حد تک۔ بلکہ ننانوے فیصد کیسوں میں یہ ناممکن ہی ہوگا۔ ہاں اگر تعلق کا اختتام تلخی پر یا کسی جھگڑے پر ہوا ہو تو ایسا ممکن ہو سکتا ہے لیکن میرے اور عمیر کے تعلق کا اختتام ایسے نہیں ہوا۔ ایک انگوٹھی تھی جو بڑوں نے اپنی مرضی سے پہنا دی اور پھر اتار بھی دی۔ میں نہیں سمجھتی کہ عمیر میرے لیے کسی بھی لحاظ سے بے چہرہ یا بے شناخت ہے۔ یہ اور بات کہ اب اس کے حصے میں وہ مقام اور پذیرائی نہیں آ سکتی کیونکہ اب اس تعلق کی تجدید ممکن نہیں۔"

میں سوچتی رہی کہ اس کے چہرے اور لفظوں میں گُندھے ہوئے کرب کو کیا عنوان دوں؟ اس کے چہرے پر تحریر اذیت اور اضطراب کو کیا سمجھوں؟ اس کی تباہ حال ظاہری شخصیت کا کیا جواز دے کر خود کو مطمئن کروں؟

میری نگاہوں میں اس کا بھرا بھرا کھلتی رنگت والا چہرہ، اس کے مسکراتے ہوئے ہونٹ اور اس کی نیلی ساحر آنکھیں۔ وقت نے بہت کچھ خزاں رسیدہ پتیوں کی طرح ہوا میں بکھیر دیا تھا یا پیوند خاک کر دیا تھا۔ میں نے ساری رات کروٹیں بدلتے ہوئے گزار دی۔

منگنی ہونے اور پھر ٹوٹنے کے وقت میں ناپختہ ذہن کی ایک عام سی لڑکی تھی جس کا آئیڈیل ملز اینڈ بون یا باربرا کارٹ لینڈ کے ناول کا ہیرو تھا۔ وقت نے یہ ہیرو ان صفحات سے نکال کر میری ہتھیلی پر رکھ دیا تھا اور پھر مجھ سے چھین بھی لیا تھا۔ اس کے آنے کی خوشی بھی مجھے ہوئی تھی اور جانے کا افسوس بھی لیکن میں خوش گمان تھی اور وقت کو خود پر بہت مہربان سمجھتی تھی۔ رفتہ رفتہ ذہن پختہ ہو گیا اور خیالات میں بھی تبدیلی آتی گئی۔ پھر پسند ناپسند اور آئیڈیل بھی تبدیل ہو گئے۔ پھر وقت نے ایک اور مہربانی کی اور میں ایک ایسے شخص کے سنگ چلنے لگی جس کا قرب میرے لیے باعثِ تسکین ہی نہیں، باعثِ فخر بھی تھا۔

لیکن شاید عمیر کے لیے وقت اس قدر مہربان ثابت نہیں ہوا تھا۔ اسے کیا ہوا تھا؟ میں یہ جاننے کے لیے بے چین تھی۔ اس وقت میں نے کسی سے کچھ نہیں پوچھا تھا لیکن اب میں اس فیصلے کا محرک جاننا چاہتی تھی۔ اب میں سیکنڈ ائیر میں پڑھنے والی ناپختہ ذہن لڑکی نہیں بلکہ میچورڈ اَپ ووٗمن تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں صبح امی جان سے یہ بات ضرور پوچھوں گی۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں اطمینان سے سو گئی۔

اگلے دن امی جان کو اکیلے بیٹھے دیکھ کر میں ان کے کمرے میں چلی آئی۔

"امی میں نے آپ سے برسوں پرانی ایک بات پوچھنی ہے۔ پوچھنے میں تو اس وقت بھی حرج نہیں تھا لیکن اس وقت شاید آپ کو دکھ ہوتا، مجھ میں اس کا حوصلہ نہیں تھا اور تب شرم و حیا کا مفہوم بھی میرے نزدیک مختلف تھا۔"

امی ایک دم میری طرف متوجہ ہو گئیں۔ "کیا پوچھنا ہے تمہیں؟"

"میری منگنی کیوں ٹوٹی تھی؟"

میرا سوال غالباً امی جان کے لیے غیر متوقع تھا۔ "آج تمہیں اچانک کیسے خیال آیا؟"

"کوئی خاص وجہ نہیں ہے، لیکن میں جاننا چاہتی ہوں۔"

"چھوڑو گڑیا۔ یوں سمجھو کہ یہ باب تمہاری زندگی میں آیا ہی نہیں، خواہ مخواہ دل برا ہو گا تمہارا۔"

"اس سے زیادہ برا نہیں ہو گا جتنا......" میں کہتے کہتے رک گئی اور بات بدل دی۔ "امی آپ بتائیں۔ یہ واقعہ میری زندگی کا ایک کبھی جدا نہ ہونے والا حصہ ہے۔ میں کیسے سوچ سکتی ہوں کہ میری زندگی میں آیا ہی نہیں۔"

امی نے بغور میری جانب دیکھا پھر بولیں۔ "گڑیا رانی اگر تم جاننا چاہتی ہو تو میں چھپاؤں گی نہیں۔ یوں بھی چھپانے کا کوئی جواز نہیں ہے کیونکہ ہمارے پاس منگنی توڑنے کی معقول وجہ تھی۔" وہ ایک لمحے کے توقف سے بولیں۔ "ہمیں اطلاع ملی تھی کہ عمیر نے سگریٹ نوشی شروع کر دی ہے۔ یہ کوئی ایسی تشویش ناک بات نہیں تھی کیونکہ اکثر لڑکے اس عمر میں یہ کیا ہی کرتے ہیں۔ ہم نے اس بات پر کوئی توجہ نہیں دی لیکن اس شام جب ہم اکرام بھائی کی طرف پہنچے تو ایک ہنگامہ برپا تھا۔ عمیر کی حالت غیر تھی اور وہ چیخ چیخ کر اکرام بھائی سے پیسوں کا مطالبہ کر رہا تھا، خود وہ بھی حواس باختہ کھڑے تھے۔

"کیا ہوا اکرام بھائی۔ خیریت تو ہے؟" تمہارے ڈیڈی نے پوچھا۔

"خیریت ہے، بالکل خیریت ہے۔" وہ جلدی سے بولے۔ "بچہ کچھ پریشان ہو گیا ہے۔"

لیکن تمہارے ڈیڈی اور بھائی اس بات سے مطمئن نہیں ہوئے۔ عمیر کی لحہ بہ لحہ بگڑتی حالت نے بھی ہمیں بہت کچھ بتا دیا تھا۔

"کیا یہ نشہ کرنے لگا ہے؟" تمہارے ڈیڈی نے بہت کرب سے پوچھا۔

"ہاں۔" اب کے اکرام بھائی نے بھی ندامت سے سر جھکا لیا۔

تمہارے بڑے بھیا اور بھائی اسے فوراً کلینک لے گئے لیکن وہاں جا کر علم ہوا کہ انہوں نے ابھی مہینہ بھر پہلے ہی اس کا علاج کر کے اسے گھر بھجوا دیا تھا۔ ڈاکٹر کے خیال کے مطابق اس کے ٹھیک ہونے کے بہت کم امکانات تھے کیونکہ ہیروئن کا استعمال چھوڑنے کے لیے جس بھرپور قوتِ ارادی کی ضرورت ہے، وہ اس میں نہیں تھی۔ انہوں نے واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ ایک مرتبہ علاج کے باوجود بھی اگر یہ ہیروئن کی طرف بڑھ گیا ہے تو یہ ہر مرتبہ ایسا ہی کرے گا۔ تمہارے ڈیڈی کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا وہ تو بالکل گم صم کھڑے رہ گئے لیکن بھائی غصے سے ابل رہے تھے۔

"آپ نے اتنا عرصہ ہمیں تاریکی میں کیوں رکھا؟ یہ بھی نہ سوچا آپ نے کہ ایسا کرنے سے آپ ایک معصوم لڑکی کی زندگی داؤ پر لگا رہے ہیں، اسے زندہ درگور کر رہے ہیں۔ ہم اپنی نازوں میں پلی اکلوتی بہن کا رشتہ ہرگز یہاں نہیں دے سکتے۔"

"یہ ٹھیک ہو جائے گا ہم اس کا علاج کروا رہے ہیں۔" انہوں نے منت کی۔ "پلیز آپ لوگ یہ رشتہ نہ توڑیں۔ ایک مرتبہ موقع دے دیں۔"

ایک طرف باپ گڑگڑا رہا تھا دوسری جانب عمیر نشہ کی طلب کی وجہ سے چیخ رہا تھا۔ ہیروئن کے لیے ایک ایک کی منت کر رہا تھا۔" امی جان چپ ہو گئیں۔ ان کے لہجے میں دکھ اور کرب تھا۔ میں بھی بالکل گم صم تھی۔

کافی دیر بعد وہ پھر بولیں۔ "مجھے عمیر اور اکرام بھائی پر بہت ترس آ رہا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ عمیر کا علاج ہو جائے تا کہ وہ اس اذیت سے چھٹکارا پا سکے لیکن تمام تر ہمدردی کے باوجود بھی میں تمہارا ہاتھ اس کے ہاتھ میں پکڑانے کو قطعاً تیار نہیں تھی۔ اس کے ساتھ انسانیت کی بنیاد پر میں اس قدر ہمدردی نہیں کر سکتی تھی کہ اس کے عوض تمہیں قربان کر دوں۔"

میں چپ چاپ وہاں سے اٹھ آئی اور ڈیک پر اونچی آواز میں Metalka کی کیسٹ لگا کر آفس جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔ در و دیوار لرزا دینے والی اور کھڑکیاں دروازے کھڑکا دینے والی یہ موسیقی مجھے پسند تو نہیں تھی لیکن اندر کے شور کو دبانے کا کوئی طریقہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں یہ سب باتیں اپنے ذہن سے جھٹک دینا چاہتی تھی۔ امی کی بات سن کر اصولاً میرا تجسس ختم ہو جانا چاہیے تھا لیکن نہ جانے کیوں سلگتی چنگاری بھڑکتی آگ بنتی جا رہی تھی۔ اس جیسے شخص کے لیے یہ بہت بڑی ٹریجڈی تھی۔

میری کار مال روڈ پر بڑھ رہی تھی۔ چیرنگ کراس سے بائیں جانب کوئینز روڈ کی طرف آفس کے لیے مڑنے کے بجائے دائیں ہاتھ اسمبلی ہال اور کوپر روڈ سے ہوتی ہوئی چوک لکشمی جا نکلی۔ مجھے خود اس بات کا احساس نہیں تھا کہ میں وہاں کیوں جا رہی تھی۔ میں اب وہاں نہیں جانا چاہتی تھی۔ رات کی تاریکی میں جو سوچ آسیب کی طرح میرے ذہن پر سوار تھی صبح کی روشنی میں اسے خود پر سے جھٹک دینا چاہتی تھی۔ صبح کی روشنی انسان کو حوصلہ دیتی ہے۔ رات کی تاریکی میں جو بات مہیب آسیب کی طرح ہمارے گرد منڈلاتی رہتی ہے، صبح کے وقت وہ ہمیں بے ضرر اور معمولی لگتی ہے۔

پر یہاں الٹا حساب تھا۔ ہر نیا لمحہ مجھے اپنی گرفت میں لے رہا تھا۔ آکٹوپس کی طرح، جس کی ان گنت ٹانگوں میں جکڑی ہوئی میری روح بچ نکلنے کے لیے جدوجہد کر رہی تھی لیکن ہر بار یہ آکٹوپس پہلے سے زیادہ سختی سے اپنی گرفت مضبوط کر دیتا۔ پتا نہیں کیوں کس جذبے کے تحت میں تندور پر پہنچ گئی۔ اس وقت یہاں عمیر کے بجائے کوئی اور شخص بیٹھا ہوا تھا۔ میں کار سے اتر کر اس شخص کی طرف بڑھی۔ یہاں تک تو مجھے کوئی نامعلوم جذبہ کھینچ کر لایا تھا لیکن اب میرے ذہن میں یہ بات بالکل واضح تھی کہ میں نے آگے کیا کرنا ہے۔

''کل رات آپ کی جگہ جو صاحب روٹیاں لگا رہے تھے، وہ کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا۔

''مجھے ان سے کچھ کام تھا۔'' میں نے جلدی سے اضافہ کیا۔

''خیر تو ہے ناں باجی، جی اس نے آپ کی کوئی چیز تو نہیں چرا لی۔'' اس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''ویسے عمیر ایسا نہیں ہے، یہ بات میں سچ کہتا ہوں کہ وہ اللہ لوگ ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔''

ظاہر ہے اس کے لیے یہ سوچنا بے حد مشکل تھا کہ مجھ جیسی کوئی لڑکی اس سے ملنے آ سکتی ہے۔

''نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے مجھے کچھ اور کام تھا۔''

''اچھا!'' اس نے سر ہلا کر یوں کہا جیسے ساری بات سمجھ گیا ہو۔ ''آپ ادھر ٹھہرو، میں اسے بلواتا ہوں۔''

اس نے چھوٹے کو بلا کر کچھ ہدایات دیں اور عمیر کا پتا کرنے کے لیے بھجوایا۔ پندرہ

بیس منٹ بعد پہلے چھوٹا اور پھر عمیر آتا دکھائی دیا۔

''یہ باجی جی تمہیں پوچھ رہی تھیں۔'' اس نے میری جانب اشارہ کیا۔

عمیر ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر رہ گیا پھر میری جانب بڑھا۔

''کہیے۔'' اس کے انداز میں اجنبیت لیکن آنکھوں میں شناسائی تھی۔

''یہاں تو بات کرنا مشکل ہوگا، کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ آپ کچھ دیر کے لیے میرے ساتھ چلیں۔''

اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار تھے۔

''یہ کوئی زبردستی نہیں، میری خواہش ہے۔''

اب اس کے چہرے پر رضامندی کی تحریر تھی میں کار کی طرف بڑھ گئی، وہ میرے پیچھے آ رہا تھا۔ میں نے اس کے لیے فرنٹ ڈور کھولا۔

''بی بی میں پیچھے بیٹھ جاؤں گا۔'' اس نے اپنے ہونٹ کاٹے۔

''میں اپنے ملازم کے ساتھ نہیں جا رہی۔''

''ملازم؟'' وہ استہزائیہ انداز میں ہولے سے ہنسا۔ ''میں تنور پر روٹیاں لگاتا ہوں، اس لحاظ سے آپ کا ہی نہیں سب کا ملازم ہوں۔''

''چاہے تنور پر روٹیاں لگائی جائیں یا کوئی اور کام کیا جائے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اصل چیز حلال رزق ہے اور اپنی محنت سے حلال رزق کمانے والا کسی کا ملازم نہیں ہوتا۔''

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر اپنا ارادہ ملتوی کر کے بغیر کچھ کہے ہی کار میں بیٹھ گیا۔ میں نے کار اسٹارٹ کی۔

''آپ کو مجھ سے ملنے نہیں آنا چاہیے تھا۔'' کچھ دیر بعد وہ بولا۔

''کیوں؟''

''شاید۔'' وہ رکا۔ ''شاید عامر اس بات کو پسند نہ کریں۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

''وہ مائنڈ نہیں کرے گا۔'' میں نے بالآخر کہا۔

''پھر بھی آپ کو نہیں آنا چاہیے تھا۔ آپ سے کوئی بھی یہ بات پوچھ سکتا ہے کہ تنور پر روٹیاں لگانے والا ایک انتہائی عام سا آدمی، آپ کے ساتھ آپ کی کار میں فرنٹ سیٹ پر

کیوں بیٹھا ہوا تھا؟ کس تعلق کس رشتے کی بنیاد پر؟''

''تعلقات کا کسی رشتے پر استوار ہونا ضروری نہیں کیونکہ سب سے پہلا تعلق انسان کا انسان ہونا ہے، رشتے ناتے بعد میں آتے ہیں۔''

''کیا آپ انسان اور انسان کے تعلق کو ہر ایک سے استوار کرتی ہیں؟'' وہ ایک دم تلخ ہو گیا۔ ''نہیں ناں۔ تو پھر یہ تعلق مجھ سے کیوں استوار کر رہی ہیں؟ ہمارے درمیان اگر کوئی تعلق واسطہ تھا تو وہ کبھی کا ختم ہو چکا ہے۔''

''میں مانتی ہوں کہ میں انسانیت کے ناتے قائم ہونے والا تعلق ہر ایک سے قائم نہیں کرتی، کوئی بھی ایسا نہیں کر سکتا، لیکن کیا تعلقات ختم کر دینے سے واقعی ختم ہو جاتے ہیں؟''

''آپ میری وجہ سے خیانت کی مرتکب ہو رہی ہیں۔''

''نہیں۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میں ساری دنیا کے سامنے یہ بات کہہ دینے کو تیار ہوں کہ میری محبت کا مرکز صرف اور صرف عامر ہے۔''

اس کے چہرے پر بہت سے تاریک سائے پھیل گئے۔ ''اور یہ کہہ دینے کو بھی تیار ہو کہ ہمدردی کے نام پر تم نے چند سکے میرے کاسے میں ڈالنے کی بھی کوشش کی تھی۔'' وہ ایک دم بھڑک گیا اور غصے میں ''آپ'' سے ''تم'' پر آ گیا۔ ''مجھے ہمدردی اور ہمدردوں سے نفرت ہے۔ میں زندہ ہوں اور جب تک زندہ ہوں اپنے بھروسے اور اعتماد کے ساتھ زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ تم آؤ گی سب کچھ جاننے کے لیے یا پھر سب کچھ جان کر تمہیں پرانا تعلق اور ہمدردی کھینچ لائے گی لیکن میرا نہ پرانے تعلق سے کوئی واسطہ ہے اور نہ ہی میں ہمدردی برداشت کر سکتا ہوں۔ جانتا ہوں کہ تم مجھ پر ترس کھا کر آئی ہو۔''

''ایزی عمیر ایزی۔'' میں نے کار کی رفتار کم کر دی۔ ''تم نے میری بات کو غلط سمجھا ہے۔''

''میں نے بالکل ٹھیک سمجھا ہے۔ تم مجھ پر ترس کھا رہی ہو۔ مجھ پر، ایک ہیروئن کے عادی نشے باز پر لیکن مجھے تمہارا یہ رحم منظور نہیں ہے۔ یہاں بہت سے لوگ پھر رہے ہیں سو نہیں تو کم از کم دس ضرور ہیروئن کے نشے کا شکار ہوں گے۔ ان کے پاس جاؤ۔ انہیں رحم کی یہ بھیک دو کیونکہ تم انسان کے تعلق کی بات کرتی ہو۔ یہ بھی انسان ہیں، ان سے ہمدردی کرو۔ میں زندہ ہوں اور جب تک میرے بازوؤں میں اپنا بوجھ اٹھانے کی سکت ہو گی تب تک زندہ رہوں گا۔''

''کیا تم مہربانی کر کے خاموش نہیں رہ سکتے۔'' میں نے بہت مشکل سے اپنے آپ پر

قابو پایا۔

اس نے میری طرف دیکھا اور ایک گہری سانس لے کر سیٹ بیک سے پشت ٹکا دی۔

''رشتے ختم ہونے سے انسان بے شناخت اور بے بہرہ نہیں ہو جاتے۔ ہمارا جو بھی کچھ تعلق تھا کم از کم ڈیڑھ سال تک قائم رہا تھا۔ کیا ہم یہ ڈیڑھ سال اپنی زندگی سے باہر نکال سکتے ہیں؟ شاید تمہارے لیے اس عرصے کی کوئی اہمیت نہیں ہو گی لیکن میرے لیے ہے۔ تم میرے لیے بے چہرہ وجود نہیں ہو۔ میں عامر سے محبت کرتی ہوں، تم وہ جگہ نہیں لے سکتے لیکن کیا انسان اپنی پوری زندگی میں ایک ہی شخص سے محبت کرتا ہے؟ اگر کوئی یہ کہنے کا دعویٰ کرے تو میرے نزدیک وہ بہت بڑا جھوٹا ہو گا۔

ہم تو مختلف حوالوں سے ساری زندگی محبت کرتے رہتے ہیں، بیک وقت بہت سے لوگ ہماری محبت سے اپنا حصہ وصول کرتے ہیں۔ ہم سب میں محبت بانٹتے ہیں۔ کسی سے خیانت کیے بغیر ہر شخص کو اس کا حصہ دیتے ہیں۔ ہم اس کے پابند ہیں، اگر ایسا نہیں کریں گے تو خائن کہلائیں گے۔ ہم ہزاروں میل دور تکلیف بھوگنے والوں کے لیے بھی افسوس کے چند بول کہہ دیتے ہیں جب کہ یہ تعلق تو ڈیڑھ برس تک قائم رہا تھا۔''

وہ چپ چاپ میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''پھر تم کیا چاہتی ہو؟'' بالآخر اس نے پوچھا۔

''میں تمہیں زندگی کی طرف لوٹتے دیکھنا چاہتی ہوں۔ میرے بہت سے واقف ڈاکٹرز ہیں وہ تمہاری مدد کریں گے۔''

''تم نے بہت دیر کر دی ہے۔''

''Its never to late'' میں نے کہا۔ ''اب بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے اگر تم واقعی اپنی قوت ارادی سے کام لو تو یہ کوئی مشکل کام نہیں ہو گا تمہارے لیے۔''

وہ تلخی سے ہنس پڑا۔

''میں شاید تمہیں اب بھی کچھ نہیں سمجھا سکی۔'' اس کی ہنسی سے میرا سارا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔

''تم بہت اچھی لڑکی ہو عائشہ۔'' اس نے پہلی مرتبہ مجھے نام سے مخاطب کیا تھا۔ ''میں تمہیں اپنی وجہ سے کوئی دکھ نہیں دینا چاہتا۔ میری وجہ سے تمہاری اچھی بھلی خوبصورت زندگی

میں دکھ کے سائے لہرانے لگیں، یہ میں نہیں چاہتا۔"

"پتا نہیں تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔" میں نے کندھے اُچکائے۔ "لیکن اگر تمہارے نزدیک میری تھوڑی سی بھی اہمیت ہے تو علاج سے انکار نہیں کرو گے۔"

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور منہ دوسری طرف کر کے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ میں نے کار کا رخ جیل روڈ پر واقع ایک پرائیویٹ کلینک کی طرف موڑ دیا۔ اتفاق سے ڈاکٹر فرخ وہیں موجود تھے۔

"آپ کے پاس ایک مریض لائی ہوں۔"

"ہیروئن ایڈکٹ؟" انہوں نے عمیر کا جائزہ لے کر پوچھا۔

"جی۔"

"لگتا ہے آپ کافی عرصہ سے نشے کے عادی ہیں؟"

"جی ہاں۔ تقریباً ساڑھے چھ سال سے۔"

"کوئی علاج وغیرہ کروایا؟"

"بہت مرتبہ۔"

"فی الحال ہم اسے ایڈمٹ کر رہے ہیں۔" انہوں نے کہا۔ "کل آپ پھر رابطہ کیجیے گا۔"

"تھینک یو ویری مچ۔" میں نے گرم جوشی سے کہا۔ "عمیر، میں کل پھر آؤں گی۔"

"میری بات سنو عائشہ۔" وہ میرے پیچھے لپکا۔

"ہوں۔"

"یہ کافی مہنگا کلینک ہے جسے میں افورڈ نہیں کر سکتا۔"

"اس قسم کی فضول بحث غیر ضروری ہے، یہ سب تم پر احسان نہیں میری طرف سے قرض ہے۔ تم کما رہے ہو اس لیے قرض واپس کر سکتے ہو اور خدا کے لیے اب یہ بات نہ کرنا کہ اس سے تمہاری پرائڈ یا انا مجروح ہوتی ہے یوں بھی مجھے جلدی سے جا کر فیچر لکھنا شروع کرنا ہے ورنہ غزالہ کیانی میری جان کو آ جائے گی۔ بائے۔" میں جلدی سے باہر نکل آئی۔

آفس پہنچ کر سب سے پہلے میں نے رپورٹنگ میں جھانکا وہاں عامر موجود نہیں تھا۔ پھر میں اپنے سیکشن کی طرف بڑھی۔ عامر میری کرسی پر بیٹھا دوسرے انگریزی اخباروں کی خبروں کے ساتھ اپنے اخبار کا موازنہ کر رہا تھا۔

"ہیلو۔" میں نے دروازے سے اندر جھانکا۔

"ہیلو۔" اس نے سر اٹھایا۔ "بڑی دیر کر دی تم نے آج۔"

"دیر؟" میں نے اندر داخل ہوتے ہوئے گھڑی دیکھی۔ "ہاں دیر تو واقعی ہو گئی ہے۔"

عامر کو دیکھتے ہی میری تمام تھکن کافور ہو گئی تھی۔

"تمہیں جیل روڈ پر دیکھا تھا میں نے۔"

"تو روکا کیوں نہیں؟"

"کوشش کی تھی روکنے کی لیکن تم کافی تیزی سے جا رہی تھیں اور میری بائیک میں نیا پسٹن پڑا ہے اس لیے اس کا تیزی سے چلنا مشکل ہے۔" اس نے اخبار سمیٹے۔ "اس وقت سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔"

"آئی ایم سوری۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آج تمہاری صبح اتنی جلدی ہو جائے گی، میرا مطلب ہے ابھی تو صرف پون بجا ہے۔"

"اب ہوسٹل میں دل نہیں لگتا اس لیے بھاگا چلا آتا ہوں اور اب تمہیں بھی بتا دوں کہ اپنے گھر والوں سے بات کر لو، مجھ سے مزید انتظار نہیں ہو رہا۔"

"میں نے بات کرنی ہے یا تم نے؟" میں ہنسی۔ "کسی بھی وقت آ جاؤ اور بات کر لو۔"

"تمہارے گھر والے میرے فیملی بیک گراؤنڈ پر تو اعتراض نہیں کریں گے؟"

"نہیں، اس میں بھلا اعتراض کی کیا بات ہے، خاص طور پر اس صورت میں کہ اب تمہارا ان سے تعلق ہی نہیں رہا۔"

"آج کل خبروں کے معاملوں میں ذرا گرما گرمی ہے اس لیے میں چھٹی نہیں لے سکتا۔ میرا خیال ہے ایک دو مہینے انتظار کرنا پڑے گا۔"

"تم بات تو کر لو امی اور ڈیڈی سے۔"

"ہاں وہ تو میں جلد از جلد کرنا چاہتا ہوں۔ اتوار کو میرا آف ہوتا ہے، اتوار کو آؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔"

"ہیلو بوائز اینڈ گرلز۔" ناہید آفس میں داخل ہوئی۔

"ہیلو۔"

"کب آئیں تم؟ میں تو اس وقت سے تمہارا انتظار کر رہی تھی جب سے عامر نے جتایا

تھا کہ تم کل والے تنور والے کے ساتھ جا رہی تھیں۔''

میں نے عامر کی طرف دیکھا جو ایک مرتبہ پھر اخباروں کے ڈھیر کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

''بہت دلچسپ شخص تھا وہ، مجھے تو اسے دیکھ کر بہت حیرت ہوئی تھی۔'' وہ کل بھی کتنی ہی مرتبہ یہ فقرہ بول چکی تھی۔

میں چپ چاپ اپنے قلم کے ساتھ کھیلتی رہی۔

''میں اس پر فیچر لکھنا چاہتی تھی۔ وہ یقیناً تعلیم یافتہ شخص تھا۔ اس کا لہجہ اور اندازِ گفتگو یہ ثابت کرنے کے لیے کافی تھا لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ وہاں تنور پر کیا کر رہا تھا۔''

ناہید پُر خیال انداز میں بولی۔ ''یقیناً اس کے پیچھے ایک زوردار قسم کے فیچر کا مواد ہوگا۔''

''مجھے تم سے ایسی توقع نہیں تھی ناہید تم انسانوں کو کب سے اپنے زوردار اور مصالحے دار فیچرز کے ترازو میں تولنے لگیں؟ تمہیں اس کی پرسنل لائف کو عوام کے سامنے لانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ تمہیں اس فیچر پر شاباش ملے گی، تعریف کے خطوط کا ڈھیر لگ جائے گا، تمہارے سامنے اور عمیر کو کیا ملے گا؟ ہمدردیاں؟ نفرتیں؟ وہ جو شاید اب تو کسی صورت بچ جائے لیکن تمہارا فیچر اسے مار ڈالے گا۔ مجھے تم سے ایسی بے حسی کی توقع نہیں تھی۔'' میں اس کی چھوٹی اور بے ضرری بات پر پھٹ پڑی تھی۔ میرے اندر کا لاوا باہر نکلنے کو بے چین تھا اور اس کے لیے یہ بہانا کافی تھا۔

وہ دم بخود میری جانب دیکھ رہی تھی۔ اسے غالباً مجھ جیسی صلح جُو اور امن پسند لڑکی سے اس قسم کے ردِعمل کی توقع نہیں تھی۔ دوسری جانب عامر تھا جس نے میرے منہ سے ''عمیر'' سنتے ہی چونک کر میری جانب دیکھا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہے لیکن چپ رہا۔

''آئی ایم ریئلی سوری۔'' بالآخر ناہید نے کہا۔ ''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تمہیں میری بات بری لگے گی۔ میں نے تو یونہی ایک خیال کا اظہار کیا تھا بلکہ میرا خیال تھا کہ وہ تمہارے ساتھ بھی تمہارے فیچر کی وجہ سے ہے مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اسے کسی دوسرے حوالے سے بھی جانتی ہو۔'' ناہید کے لہجے میں معذرت تھی۔ پھر وہ وہاں زیادہ دیر رکی بھی نہیں۔

''تم اسے جانتی ہو؟'' عامر نے اس کے جانے کے بعد پوچھا۔ اس کے لیے بھی میرا ردِعمل قطعاً غیر متوقع تھا۔

''ہاں۔'' میں نے اب بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ میں اب بھی مسلسل اپنے قلم سے کھیل رہی تھی۔

''کیسے؟ میرا مطلب ہے کوئی کزن وغیرہ ہے تمہارا؟''

''کزن نہیں ہے۔''

''پھر کون ہے؟ میرا خیال ہے میں یہ جاننے کا حق رکھتا ہوں۔''

''تمہارے پاس سب حقوق ہیں۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔ ''لیکن جو کچھ تم پوچھ رہے ہو، وہ میں تم پر واضح کرنے سے قاصر ہوں۔ تم ایک نہیں بے شمار سوالوں کے جواب طلب کرو گے اور فی الحال الفاظ میرے قابو میں نہیں ہیں۔''

میں اس کے پاس سے اٹھ کر کمپیوٹر پر چلی آئی اور فیچر لکھنے لگی۔ وہ وہیں بیٹھا میری طرف دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ ایک جھٹکے سے کھول کر غزالہ کیانی اندر داخل ہوئی۔

''اوہ سوری۔'' کہہ کر اس نے دروازہ بند کیا اور دستک دی۔

''یس۔'' عامر نے جواب دیا۔

''مجھے پتا نہیں تھا کہ تم لوگ اندر ہو، ورنہ میں ڈسٹرب نہ کرتی۔'' وہ ایک ادا سے بولی۔

''لیکن کام بھی ضروری تھا۔''

میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ اب میں اس سے کسی بھی گھٹیا بات کی توقع کر سکتی تھی۔ میں اسے نظر انداز کر کے بدستور کمپیوٹر کے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتی رہی۔ یوں جیسے مجھے خبر ہی نہ ہو کہ اس نے مجھے کیا کہا ہے۔ وہ اپنی میز کی دراز میں سے کچھ نکال رہی تھی۔ عامر چپ چاپ اٹھ کر باہر نکل گیا۔

''لگتا ہے خاصے ڈسٹرب ہوئے ہو۔'' اس نے اسے باہر جاتے دیکھ کر مجھے مخاطب کیا۔ ''لیکن یقین کرو مجھے واقعی ضروری کام تھا۔''

میں صرف اس کی جانب گھور کر رہ گئی اور وہ اطمینان سے اپنی ہیل کی ٹک ٹک کے ردھم پر باہر چل دی میں نے سر تھام لیا۔ مجھے عامر سے اس رویے کی توقع نہیں تھی جس کا اس نے کچھ دیر قبل مظاہرہ کیا تھا۔ میں نے اسے کچھ بتانے سے انکار نہیں کیا تھا، صرف کچھ دیر انتظار کرنے کو کہا تھا، تب تک، جب میں لفظوں کو اپنی گرفت میں لے کر اظہار کا جامہ پہنا سکوں۔ لیکن وہ نہ جانے کیوں ناراض ہو کر اٹھ گیا تھا۔ میری جذباتی کیفیت کو سمجھے بغیر ہی۔ ایسی بے سکونی میں بھلا کوئی کیسے لکھ سکتا ہے۔ میں نے گل محمد کو ایک کڑک چائے کا آرڈر دیا اور ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگی۔ میری سوچ کا تمام تر رخ عمیر کی بے بسی اور عامر کی ناراضگی کی

طرف تھا۔ میں نے عمیر سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ اس لعنت کا شکار کیسے ہوا تھا' لیکن میرے خیال میں اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ بعض اوقات بالکل نہ جانتے اور نہ چاہتے ہوئے بھی لوگ اس کا شکار ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات جانتے بوجھتے ہوئے بھی محض ہیرو بننے کی خاطر محض ایک تجربے سے گزرنے کی خاطر اور پھر یہ لعنت تمام زندگی کا روگ بن جاتی ہے۔

دوسری جانب عامر تھا۔ اس کو اس قسم کے بچپنے کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس نے ایک سخت ماحول بچپن ہی سے دیکھا تھا اور بہت بڑی بڑی تکلیفیں سہہ چکا تھا وہ، پھر پتا نہیں کیا بات تھی کہ میری ذرا سی بات پر ہی ناراض ہو گیا تھا۔ میں اپنی سوچوں میں گم تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟'' یہ جاوید مغل تھا۔

''آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔'' میں نے رُکھائی سے کہا۔ ''یہ گھر کا بیڈروم نہیں آفس ہے جسے آپ بھی شیئر کر رہے ہیں اور آفس کے دروازے پر یوں بھی دستک دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔''

جو غصہ میں اس وقت غزالہ کیانی پر نہیں نکال سکی تھی۔ وہ اب اس کی نئی دریافت پر انڈیل دیا۔ وہ کندھے اچکا کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک اپنی میز پر کھٹ پٹ کرنے کے بعد میری طرف چلا آیا۔

''میں نے محسوس کیا ہے کہ ہم دونوں کے درمیان پہلی ملاقات سے اب تک دوستانہ فضا قائم نہیں ہو سکی۔'' اس نے کہا۔ ''میں بہت امیدیں لے کر یہاں آیا تھا لیکن شاید میری آمد کو آپ نے اپنی سلطنت کی حدود میں مداخلت سمجھا ہے۔''

میں نے اس کا سرتاپا جائزہ لیا۔ پھر پیالی سے چائے کا آخری گھونٹ حلق سے اتار کر اسے پرچ میں رکھا۔

''میں کسی بہت بڑے سیاسی تجزیہ نگار سے پروفیشنلی حسد محسوس کروں تو ایک بات بھی ہے لیکن میرے پاس تو اس قدر فرصت بھی نہیں ہے۔ آپ کو ابھی بہت لمبا عرصہ درکار ہے میری پروفیشنل جیلسی کی حد میں داخل ہونے کے لیے۔''

''مجھ سے لفظوں کے انتخاب میں یقیناً غلطی ہوئی ہے۔'' وہ بولا۔ ''میرے کہنے کا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔ دراصل ابھی لفظوں پر میری گرفت کافی کمزور ہے۔ مجھے غزالہ نے یہاں

آنے کی آفر کی تھی۔ اس نے آپ کا ذکر کیا تھا اچھے لفظوں میں میرا خیال تھا کہ ہم مل کر اس موضوع پر کام کریں گے۔''

''اب تو غالباً یہ ممکن نہیں رہا۔'' میں بیگ اپنے کاندھے پر ڈال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں جلد ہی میگزین سیکشن میں چلی جاؤں گی۔ یہاں یہ میرا آخری فیچر ہے۔''

فیچر کی ڈیڈ لائن کل تھی اس لیے ابھی مزید لکھنے کا ارادہ ترک کر کے میں چل دی۔ رپورٹنگ میں عامر نہیں تھا۔

''اسد۔'' میں نے آواز دی۔ ''عامر کہاں ہے؟''

''باہر گیا ہے کسی اسٹوری کے سلسلے میں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''کل اس کا زبردست اسکوپ آ رہا ہے، اس لیے آج دو ڈھائی بجے رات تک مصروف رہے گا۔''

مجھے بہت افسوس ہوا کہ وہ مجھ سے بنا کچھ کہے، بنا بات کیے باہر چلا گیا تھا۔ پتا نہیں اس کا بائیک کس حالت میں تھا۔ ایسے موسم میں اس پنکچر پر نہ جانے کہاں کہاں پھر رہا ہو گا۔ میں چھٹی کر کے گھر چلی آئی۔ گھر آ کر میں نے سب سے پہلے ڈاکٹر فرخ کو رنگ کیا۔

''آپ نے چیک اپ کیا عمیر کا؟''

''ہاں۔'' وہ بولے۔ ''لیکن اس اسٹیج پر تو معجزہ رونما ہونا بھی مشکل لگ رہا ہے۔ اس کی حالت تباہ حال ہے۔''

میں چپکی رہ گئی اور خاموشی سے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ کچھ ہی دیر بعد بھابی چائے لے کر کمرے میں داخل ہوئیں۔

''تمہاری عامر سے بات ہوئی؟ کب آئے گا وہ یہاں؟''

''اس اتوار کا کہا ہے اس نے۔''

''اور شادی کا کب تک ارادہ ہے؟''

''شادی ایک دو ماہ بعد۔'' میں نے پیالی میں چینی مکس کی۔ ''آج کل خبریں ہی ایسی ہیں کہ ہم دونوں یہ موقع مس نہیں کرنا چاہتے۔''

''میں نے تمہارے بڑے بھیا سے بات کر لی ہے۔''

''پھر؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''پھر یہ کہ وہ بہت خوش ہیں۔ عامر انہیں بھی پسند ہے اور جب اس نے اتوار کو آنے کا

کہا ہے تو امی، ڈیڈی کو بھی بتانا ہوگا۔"

"وہ سب آپ کا کام ہے۔"

پھر کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد بھابی برتن لے کر چلی گئیں۔ میں ڈیک پر غزلیں سننے لگی۔ عامر سے میں نے بہت مرتبہ رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس سے بات نہیں ہوسکی۔ میں تقریباً ہر آدھ گھنٹے بعد آفس فون کر رہی تھی لیکن وہاں سے یہی جواب مل رہا تھا کہ وہ موجود نہیں ہے۔ یہاں تک کہ رات کے ڈھائی بجے جب میں نے فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ پریس کلب جا چکا ہے۔

"تھوڑی دیر پہلے میں نے کیا تھا تو پتا چلا تھا کہ وہ اب تک آفس نہیں آیا اور اب وہ پریس کلب چلا گیا ہے۔" میں تپ گئی۔ "کسی نے اسے میرے فون کے متعلق نہیں بتایا تھا؟"

"ایک منٹ ٹھہریں، میں پتا کرتا ہوں۔" دوسری جانب موجود رپورٹر نے کہا اور پھر کچھ دیر بعد بولا۔ "میں تو ابھی ہی آیا ہوں۔ میں نے پتا کیا ہے لیکن کسی کو معلوم نہیں ہے کہ اسے تمہارا میسج ملا یا نہیں۔"

میں نے غصے میں لائن کاٹ کر پریس کلب کا نمبر ملایا۔

"وہ یہاں تو نہیں آیا بلکہ ابھی ابھی اسد بھی ہوسٹل چلا گیا ہے۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے آیا تھا۔"

میں نے غصے میں ریسیور پٹخ دیا۔ کل سے مسلسل بے خوابی کی وجہ سے آنکھیں جل رہی تھیں اور سر میں بھی درد شروع ہوگیا تھا۔ میں سونا چاہتی تھی لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس وقت میں زیادہ بے بس ہوں یا عمیر۔ عامر سے مجھے یہ توقع بالکل نہیں تھی کہ وہ مجھے اس بری طرح نظر انداز کرے گا۔

صبح تک پریشانی اور بے خوابی کے باعث مجھے کافی تیز بخار ہو چکا تھا۔ بھابی نے مجھے آفس جانے سے روکا تھا لیکن میں ٹیبلٹ لے کر چلی آئی تھی۔ کوئی ایک پریشانی تو تھی نہیں۔ میں عامر سے بات کرنا چاہتی تھی۔ مجھے عمیر کے پاس کلینک جانا تھا اور آج فیچر بھی ہر حالت میں لکھنا تھا۔ چھٹی کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد میں نے حسب معمول سب سے پہلے رپورٹنگ میں جھانکا۔ عامر وہاں موجود نہیں تھا۔ میں نے اس کے لیے پیغام چھوڑا۔ "Please see me" اور اپنے کمرے میں آ کر لکھنے بیٹھ گئی۔ لکھتے لکھتے

میری نگاہ وال کلاک کی طرف اٹھی۔ میں پچھلے ایک گھنٹے سے پورے انہماک کے ساتھ لکھنے میں مصروف تھی اور اب بس آخری پیراگراف لکھنا رہ گیا تھا۔

"اوہو!" میں کرسی گھسیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اب تک تو عامر کو آ جانا چاہیے تھا۔"

میں تیزی سے رپورٹنگ کی طرف بڑھی۔ سامنے ہی اسد آ رہا تھا۔

"مبارک ہو۔" وہ اخبار میرے سامنے پھیلاتا ہوا بولا۔ "عامر کی اسٹوری کی آج دھوم مچی ہوئی ہے۔"

مجھے لیڈ پیج پر عامر کی بائے لائن سے زیادہ دلچسپی خود عامر میں تھی۔

"وہ کہاں ہے؟"

"تھوڑی دیر پہلے باہر گیا ہے۔" اسد نے کہا تو میرا دل چاہا اخبار اس کے ہاتھ سے لے کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں۔

"کہاں باہر گیا ہے؟"

"میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا کیونکہ میری اس سے سرسری بات ہوئی تھی۔ کہہ رہا تھا کہ اسے جیل روڈ جانا ہے ذاتی کام کے سلسلے میں۔"

"کیا؟" سب کچھ واضح طور پر سننے کے باوجود میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

"دیکھو، میں یقین سے نہیں کہہ سکتا، ہوسکتا ہے وہ کہیں اور گیا ہو۔"

میں تیزی سے پلٹ کر اپنے کمرے میں گئی۔ بیگ کندھے پر ڈال کر اور نوٹس دراز میں بند کر کے اسی تیزی سے رپورٹنگ میں پہنچی۔ میرے لکھے ہوئے پیغام کا پرچہ اس کے ڈیسک پر نہیں تھا۔ گویا اس نے وہ پڑھ لیا تھا۔ اس کے باوجود بھی وہ میرے پاس نہیں آیا۔ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے ایک مرتبہ پھر میری اسد سے مڈبھیڑ ہوگئی۔

"خیریت تو ہے عائشہ؟" اس نے مجھے پریشان دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں خیریت ہے۔" میں زبردستی مسکرائی۔ "بالکل خیریت ہے۔"

"لگتا تو نہیں ہے۔" اس نے مجھے بغور دیکھا۔ "کچھ اسی قسم کی بات میں نے عامر سے بھی پوچھی تھی۔"

میں چلتے چلتے رک گئی۔

"اس کے منہ پر بھی کل سے بارہ بجے ہوئے ہیں بالکل تمہاری طرح' لیکن یہ بات وہ

بھی ماننے پر تیار نہیں ہے۔'' میں چپ رہی۔

''لڑائی تو نہیں ہوئی تم لوگوں میں؟''

''یہی تو مسئلہ ہے کہ لڑائی بھی نہیں ہوئی۔'' میں بڑبڑائی۔

''کل سارا دن مارا ماری کرتا رہا اس اسٹوری کے پیچھے پھر ساڑھے تین بجے تک دفتر میں چائے کی پیالیاں پی پی کر اور سگریٹ پھونک پھونک کر ٹائپنگ کرتا رہا۔ وہاں ہوسٹل میں بھی یہی حالت تھی۔ مجھے نیند آ رہی تھی لیکن اس کی چارپائی اتنی زور زور سے مسلسل چرچرا رہی تھی کہ ایک بار تو دل چاہا کہ اسے اٹھا کر کمرے سے باہر پھینک دوں۔ خیر تھوڑی دیر بعد وہ خود ہی باہر چلا گیا۔''

میں گم صم کھڑی یہ سب تفصیل سن رہی تھی۔ وہ ساڑھے تین بجے تک آفس میں تھا تو پھر مجھے کیوں بتایا گیا کہ وہ پریس کلب چلا گیا ہے؟ ظاہر ہے اس کے ایما کے بغیر یہ پیغام مجھ تک نہیں پہنچا ہوگا اور اب بھی وہ مجھ سے ملے بغیر چلا گیا جیل روڈ پر ذاتی کام کے سلسلے میں۔ اس کا ذاتی کام میں جانتی تھی۔ ڈاکٹر فرخ کا کلینک وہیں تھا۔

یہ سب باتیں سوچ کر میرے سر کا درد اور بڑھ گیا۔ میں اسد پر دوسری نگاہ ڈالے بغیر ہی تیزی سے سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں تھا کہ میں وہاں جا کر عامر سے بات کیا کروں گی۔ ڈاکٹر فرخ کے کلینک کے سامنے کھڑی عامر کی بائیک نے میرے تمام خدشات درست ثابت کر دیے۔ مجھے اس کی بداعتمادی کا یہ مظاہرہ پسند نہیں آیا۔ کار پارک کر کے اندر داخل ہوئی تو سامنے ہی ریسپشن پر ڈاکٹر فرخ سے ملاقات ہوئی۔

''آپ نے مجھے ایک اچھا مریض لا کر دیا ہے۔ وہ ہماری ہر بات مان رہا ہے۔'' میں بحالت مجبوری ان کے پاس رکی تو وہ چہکے لیکن ان کی بات میرے لیے ایک گونہ تسکین کا باعث تھی۔

''کیا وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''بچانے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اسے ایک بہت طویل اور صبر آزما علاج سے گزرنا پڑے گا۔ جو صحت ساڑھے چھ سال میں ہیروئن نے برباد کی ہے، اسے واپس آنے میں بھی ایک عرصہ لگے گا۔''

''جب تک وہ صحت یاب نہیں ہو جاتا تب تک وہ یہیں رہے گا۔ مجھے آپ پر پورا

بھروسا ہے۔'' میں نے ممنونیت سے کہا۔ ''اس وقت میں مل سکتی ہوں اس سے؟''

''میرا خیال ہے وہ ابھی سویا ہوا ہے۔ بہرحال آپ اسے دیکھ لیں۔''

''اچھا۔'' میں بولی۔ ''عامر تو یہاں نہیں آیا؟''

''ہاں شاید ابھی یہیں ہے۔ آپ سے بمشکل ایک آدھ منٹ قبل آیا تھا۔ مجھ سے عمیر کے بارے میں ہی پوچھ رہا تھا۔''

میں ان سے معذرت کر کے کمرے کی طرف بڑھی دروازہ ہلکے سے دباؤ سے ہی کھل گیا۔ عمیر بے خبر سو رہا تھا۔ جب کہ عامر پائنتی کی جانب کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ کسی گہری سوچ میں گم ہے۔ شب بیداری اس کے چہرے پر تحریر تھی۔ میں قدم بڑھا کر اس کے مقابل کھڑی ہوگئی تو وہ چونکا۔

''تم نے رات میرے فون کا جواب کیوں نہیں دیا اور اب بھی مجھ سے ملے بغیر ہی چلے آئے؟''

وہ کچھ دیر بغیر پلکیں جھپکائے میری طرف دیکھتا رہا۔

''تم نے مجھے اپنی پہلی منگنی متعلق کیوں نہیں بتایا تھا؟'' بالآخر اس نے پوچھا۔

''کیا یہ ضروری تھا؟''

''اُن حالات میں شاید اس کی ضرورت نہیں تھی لیکن پرسوں رات تمہیں یہ بات بتا دینی چاہیے تھی۔''

''میرے لیے کل سے پہلے اس بات کی اہمیت نہیں تھی اور پھر منگنی ٹوٹے برسوں گزر چکے۔''

''لیکن تمہارے رویے نے ثابت کر دیا کہ اب بھی تمہارے لیے اس ٹوٹے ہوئے تعلق کی کیا اہمیت ہے۔''

''ہاں، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میرے لیے اس بات کی اہمیت ہے۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''کیونکہ میں گزرے ہوئے ڈیڑھ پل کو بھی اپنی زندگی سے نکالنے کا اختیار نہیں رکھتی۔ یہ تو پھر ڈیڑھ طویل سال ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ یہ بات درست ہے کہ عورت اپنی پہلی محبت کو کبھی نہیں بھولتی۔''

اس کی بات سن کر مجھے ایسے لگا جیسے کوہ ہمالیہ میرے سر پر آن گرا ہو۔

''مجھے تم سے ایسی بداعتمادی کی توقع نہیں تھی۔'' میں نے بے یقینی سے اس کی جانب

دیکھا۔ ''تم نے مجھ سے کچھ جانے بغیر ہی اتنی بڑی بات کہہ دی۔''

''تمہیں مجھ سے کیا توقع تھی؟'' اس کے لہجے میں سختی تھی۔ ''کیا میں نے تم سے پوچھا نہیں تھا اور کیا تم نے مجھے کچھ بتانے سے انکار نہیں کیا تھا؟''

''میں نے انکار نہیں کیا تھا۔ میں ایسی جذباتی کیفیت کا شکار تھی کہ چاہتے ہوئے بھی میں تمہیں کچھ نہ بتا سکی جس کی سزا تم نے یہ دی کہ بغیر کچھ بتائے غائب ہو گئے۔ میں سارا دن اور آدھی رات تم سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن تم نے جانتے بوجھتے ہوئے مجھ سے بات کرنا گوارا نہ کی اور اب بھی مجھ سے ملے اور بات کلیئر کئے بغیر ہی وہاں چلے آئے۔ تم آخر یہاں کیا کرنے آئے تھے؟''

''میں یہ دیکھنے آیا تھا کہ تمہاری پہلی محبت میں ایسی کون سی خوبی ہے جس کی وجہ سے تم اس حال میں بھی اس کے لیے سوچنے اور اس سے محبت کرنے پر مجبور ہو۔''

''عامر!'' میں چیخی۔ ''تمہیں مجھ پر کوئی اعتماد کوئی بھروسا نہیں۔ تم نے میری محبت پر شک کر کے میری تذلیل کی ہے۔ ہاں میری اس سے منگنی ہوئی تھی۔ میں اس رشتے پر خوش تھی اور اس کے ٹوٹنے پر رنجیدہ بھی لیکن میری محبت کا محور صرف وہ انگوٹھی تھی کیونکہ جس کے نام کی انگوٹھی میری انگلی میں جگمگاتی تھی میں تو اس سے بالکل ناآشنا تھی۔ مجھے انگوٹھی بھی اس نے نہیں سمیعہ آپا نے پہنائی تھی۔ اس لیے میں تو اس لمس سے بھی محروم تھی جو ایک انگوٹھی کے ذریعے دلوں کو جوڑتا ہے۔ پھر وہ انگوٹھی نہ رہی تو اس کے حوالے سے قائم ہونے والا تعلق بھی نہ رہا۔''

''تو پھر برسوں پرانا یہ تعلق استوار کیوں ہو گیا؟ ایک اجنبی جو بہت سے اور اجنبیوں کی طرح تمہیں سرِ راہ مل گیا، بالکل اتفاقاً وہ تمہارے اس قدر التفات کا مستحق کیوں ٹھہرا؟ عائشہ میں ہمیشہ محبت سے محروم رہا ہوں۔ مجھے یہ محرومی گوارا ہے لیکن محبت کا بٹوارا گوارا نہیں۔ میں تمہیں کسی اور کے لیے آنسو بہاتے یا پریشان ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ خاص طور سے جب تم سے اس شخص کا کوئی تعلق اور واسطہ نہ ہو۔''

وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا اور میں کچھ بھی نہ کر سکی لیکن وہ میرے روکے رکتا بھی کب؟ میں جب اس کی محبت میں اتنی آگے بڑھ چکی تھی کہ اب پیچھے ہٹنے کا تصور بھی میرے لیے موت کے برابر تھا۔ تب اس نے انتہائی سفاکی سے مجھے پیچھے دھکیل دیا تھا۔ مجھ پر بے وفائی کا لیبل چسپاں کر کے وہ میری بات سننے اور سمجھنے کی کوشش کرتا تو میں اپنا کیس بھی

نہ ہار سکتی تھی لیکن وہ بنا کچھ کہے سنے بنا کچھ سمجھے ہار میرا مقدر کر گیا تھا۔ آج پہلی مرتبہ اس نے مجھے آشا کے بجائے عائشہ کہا تھا جو ترکِ تعلق کی وارننگ تھی۔

☆=====☆=====☆

میں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی۔ عامر آفس میں موجود نہیں تھا۔ میں چپ چاپ اپنے نوٹس میز کی دراز سے نکال کر کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گئی۔

''عائشہ تم ٹھیک تو ہو؟'' ناہید نے تشویش سے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں زبردستی مسکرائی۔

''لیکن تمہارا چہرہ۔'' اس نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ ''اوہ مائی گاڈ اس قدر تیز بخار۔ تم آج کرنے کیا آئی ہو؟ فوراً چھٹی لو۔ اٹھو۔''

''کچھ نہیں ہوا مجھے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں نے اپنے لہجے سے بشاشت ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ ''اور پھر یہ فیچر بھی آج ہی مجھے مکمل کرنا ہے۔''

''بھاڑ میں گیا فیچر۔ اخبار اس کے بغیر بھی مکمل ہو جائے گا۔ تم فوراً اٹھو اور ابھی گھر چلو۔''

اس نے مجھے کھینچ کر کرسی سے اٹھا لیا اور میز پر پڑا میرا شولڈر بیگ بھی اپنے کندھے سے لٹکا لیا۔

''عامر کہاں ہے؟ وہ تمہیں گھر چھوڑ آئے گا۔''

''وہ تو ایک خبر کے سلسلے میں باہر گیا ہے۔'' میں نے جھوٹ بولا۔

''تو پھر میں ساتھ چلتی ہوں۔''

میری حالت دیکھ کر امی جان کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بھابی نے فوراً ڈاکٹر اور پھر بڑے بھیا کو فون کیا۔

''منع بھی کیا تھا میں نے کہ ایک دن آرام کر لو۔ بخار ٹھیک ہو جائے گا لیکن اس نے تو کسی کی سنی ہی نہیں۔'' امی ناہید سے کہہ رہی تھیں۔

''اس کا تو دماغ خراب ہے آنٹی!'' اس نے بھی امی کا ساتھ دیا۔ ''چاہے رسیوں سے باندھ کر رکھنا پڑے، اسے اس وقت تک نہ اٹھنے دیں جب تک یہ ٹھیک نہیں ہو جاتی۔''

پھر وہ مجھ پر جھکی اور کان میں بولی۔ ''اگر ایک دن اس کا دیدار نہیں کرو گی تو کوئی قیامت نہیں آ جائے گی اور وہ ایسا بندہ ہے بھی نہیں جسے غزالہ کیانی اپنی زلفوں میں جکڑ سکے تم بے فکر ہو کر آرام کرو۔''

کسی اور وقت اس نے یہ بات کی ہوتی تو عامر کے ذکر سے میری آدھی بیماری کافور ہو جاتی، لیکن اس وقت اس کی بے خبری میں کی ہوئی بات نے زخموں پر مرہم رکھنے کے بجائے انہیں ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ میں نے آنکھیں موند کر بہت مشکل سے اپنے آنسوؤں کو پیچھے دھکیلا جو ہر بند توڑ کر باہر نکل جانا چاہتے تھے۔

''امی۔ میرا خیال ہے کہ اسے آرام کرنے دیں۔'' بھابی نے کہا۔ ''میں اس کے لیے سوپ وغیرہ بنالوں۔''

''اچھا آنٹی اب میں چلتی ہوں۔'' ناہید بھی غالباً اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''چائے پی لو۔ پھر ڈرائیور آفس چھوڑ آئے گا۔'' امی نے شفقت سے کہا۔

وہ تینوں کمرے سے نکل گئیں تو میرے آنسوؤں نے آزادی کے ساتھ بہنا شروع کر دیا۔ پھر نہ جانے کب مجھے نیند آ گئی۔ جب آنکھ کھلی تو بخار کم ہو چکا تھا۔ امی، ڈیڈی، بڑے بھیا اور عمران سب میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنی محبتیں پا کر میں ہمیشہ شانت ہو جاتی تھی لیکن آج اتنی محبتوں میں بھی کوئی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ کھو دینے کا احساس بہت جان لیوا تھا۔

دو دن بعد بھابی کی تیمارداری اور ڈاکٹر کی دی ہوئی دواؤں کے استعمال سے میری حالت سنبھل گئی۔ اس دوران میں اس کے فون کا شدت سے انتظار کرتی رہی۔ آخر ناہید نے اسے بتایا تو ہوگا لیکن اس نے چند نمبر ڈائل کرنے بھی گوارا نہ کیے۔ کیا عمیر کا علاج کرانا اتنا ہی ناقابلِ معافی جرم تھا؟ کیا میں اتنی جلدی بھول جانے والی چیز تھی؟ میں نے تو محض ایک انگوٹھی کے تعلق کو بھی نبھایا تھا' لیکن اس نے تو دل کے رشتے بھی بھلا دیے تھے۔ میرے لیے اس کا سامنا کرنا بہت مشکل تھا۔ اس لیے نہیں کہ میں خود کو مجرم تصور کر رہی تھی بلکہ اس لیے کہ اسے سامنے دیکھ کر میرے لیے خود پر قابو پانا مشکل ہو جاتا۔ پھر بھی میں تیار ہو کر آفس کے لیے نکلی۔

سب کچھ ویسا ہی تھا۔ میری غیر حاضری کے چند دنوں نے کسی چیز پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ حسبِ عادت میں نے رپورٹنگ میں جھانکا۔ حسبِ سابق وہ خالی تھا۔ میں اپنے کیبن کی طرف بڑھی۔ ناہید اپنی میز پر جھکی کچھ پڑھنے میں مصروف تھی۔

''ہیلو ناہید!''

''ہائے، ہاؤ آر یو؟'' وہ گرمجوشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں نے کل فون کیا تھا کہ تمہارا پتا کرسکوں لیکن تم سوئی ہوئی تھیں۔''

''ہاں، مجھے بھابی نے بتایا تھا ہر فون کے متعلق جو میرے لیے آیا تھا۔'' میں نیل پالش کھرچنے لگی۔

''بہت کمزور ہو رہی ہو۔ چہرہ بھی اُترا اُترا لگ رہا ہے۔'' اس نے میرا جائزہ لیا۔

''کچھ دن میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔'' میں کرسی پر ٹک گئی۔

''تمہارا فیچر بہت اچھا تھا۔'' اس نے مجھ سے کہا۔

''میرا؟ لیکن وہ تو ادھورا تھا۔''

''وہ پورا کر دیا گیا تھا۔'' ناہید مسکرائی۔ ''یوں بھی صرف اختتامی پیراگراف ہی رہتا تھا۔''

میرا دل دھڑک اٹھا۔ اگر عامر نے فیچر پورا کیا تھا تو یقیناً وہ اپنے کیے پر پشیمان تھا۔ اور کچھ نہیں تب بھی اس کے دل میں میرے لیے جگہ تھی اور یہ احساس بہت فرحت بخش تھا۔

''عامر تو خود بھی مصروف ہوگا۔ آج کل تو یوں بھی خبروں کا سیلاب آیا ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔ میری آواز میں ڈھیروں خوشی موجود تھی۔ عامر نے میرا مان بڑھا دیا تھا۔

''وہ واقعی بہت مصروف تھا۔ اس لیے اس نے نہیں مغل نے تمہارا فیچر مکمل کیا ہے۔''

ایک لمحے کے لیے تو میں بالکل ہی سن رہ گئی۔

''جاوید مغل نے؟ لیکن کیوں؟''

''اس کا خیال ہے کہ تم کسی نامعلوم وجہ کے تحت اس سے رُکھائی برت رہی ہو۔ جب کہ وہ اچھے دوستوں کی طرح یہاں رہنا چاہتا ہے۔ وہ تمہارے لکھے ہوئے کو بہت پسند کرتا ہے اور تمہارے انداز میں لکھنے کا خواہش مند ہے۔''

یہ کیا ہو رہا تھا؟ میرا دماغ گھوم گیا مجھے جاوید مغل کے Gesture of Good will پر خوش ہونے کے بجائے اس بات کا دکھ زیادہ تھا کہ عامر کو میری ذرہ برابر پروا نہیں تھی۔ ٹھیک ہے کہ وہ مصروف تھا لیکن اس کی مصروفیت مجھ سے، یا میری ذات سے بھی زیادہ تھی؟ میرے چہرے پر دکھ کے گہرے سائے پھیل گئے۔ ناہید مسلسل میرا جائزہ لے رہی تھی۔

''تم دونوں میں کس بات پر لڑائی ہوئی تھی؟'' اس نے بالکل اچانک پوچھا۔

''ہماری لڑائی نہیں ہوئی۔'' میں نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر اپنی نیل پالش کھرچنے میں مصروف ہو گئی۔

''بتانا نہ چاہو تو اور بات ہے لیکن پلیز مجھ سے جھوٹ نہ بولو۔ ہم دونوں کی دوستی ایسی

نہیں ہے کہ اس میں جھوٹ کا عمل دخل ہو۔''

میں شرمندہ ہوگئی۔ میری اس کی کالج کے زمانے سے دوستی تھی۔ پھر ایم اے بھی ہم نے اکٹھے کیا تھا۔ میں نے سب کچھ بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

''تم کس قدر جانتی ہو؟''

''یہی کہ تم دونوں ایک دوسرے کو بے حد چاہتے ہو اور اب تم۔''

''تم یہ کیسے جانتی ہو۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔

''یہ اخبار کا دفتر ہے محترمہ! اگر یہاں باہر سے اسکوپ (Scoop) آ سکتے ہیں تو اندر سے کیوں نہیں نکل سکتے؟ ہے تو یہ غیر مہذب بات لیکن حقیقت یہی ہے کہ صحافی تو لوگوں کے بیڈروم سے بھی خبر نکال لاتے ہیں۔ یہاں تو پھر سب کچھ سامنے تھا۔''

''اچھا پھر؟''

''پھر یہ کہ اب تم دونوں میں بول چال بند ہے لیکن کسی چھوٹی سی بات پر نہیں۔'' وہ بولی۔ ''میں نے اسے تمہاری بیماری کا بتایا تو اس نے سرسری سی تشویش بھی ظاہر نہیں کی۔ اور سامنے پھیلائے ہوئے اخباروں کی خبروں کی خبریں انڈر لائن کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس وقت یہاں بہت سے لوگوں کو علم ہو چکا ہے کہ تم دونوں کی دوستی ٹوٹ گئی ہے اور سب وجہ پر بھی حسب توفیق بحث کر چکے ہیں۔''

''کیا کہا سب نے؟''

''کچھ غزالہ کیانی کو اس کا ذمہ دار ٹھہرا رہے ہیں کیونکہ آج کل اس کے چکر عامر کے گرد بہت بڑھ گئے ہیں اور کچھ کا خیال ہے کہ اس کی وجہ جاوید مغل ہے۔''

''جاوید مغل؟ اس طرف کس کا ذہن گیا؟''

''شاید خود غزالہ کیانی کا اور ہونٹوں نکلی بات تو گھڑی بھر میں کوٹھوں چڑھتی ہے۔''

''لیکن کیوں؟ میں نے تو کبھی اس سے زیادہ بات نہیں کی۔''

''لیکن غزالہ کا خیال ہے کہ یہ سب عامر کے سامنے کی بات تھی۔ ویسے اس کی بات سے کوئی بھی متفق نہیں ہے لیکن اگلی توجیہہ بہت سے لوگ مانتے ہیں۔'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔

''ان کا خیال ہے کہ تم نہ سہی لیکن جاوید مغل تمہاری محبت میں ضرور گرفتار ہے جس کا

ثبوت وہ فیچر ہے جو اس نے ڈیڈ لائن سے پہلے ہی پیسٹر کے حوالے کر دیا تھا اور عامر نے جیلسی میں یہ ترکِ تعلق کیا ہے۔''

''میرے خدا۔'' میں نے سر پکڑ لیا۔'' رائی کا پہاڑ بنانے کے لیے کم از کم رائی کی تو ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں تو بغیر رائی کا پربت بن گیا ہے۔ اور غزالہ کا جہاں تک تعلق ہے تو اس سے میں ہر قسم کی بات کی توقع کر سکتی ہوں۔''

''سب سے زیادہ اس نے بھس میں چنگاری چھوڑی ہے۔'' ناہید نے کہا۔ ''اس نے ایسے ایسے طریقے سے تمہارے خلاف باتیں کی ہیں کہ میں تو بالکل دنگ رہ گئی۔''

''کیا کہا اس نے؟''

''کوئی ایک بات تو نہیں کی۔ ہم لوگ رپورٹنگ میں بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے، گپیں لگ رہی تھیں جب وہ کمرے میں داخل ہوئی۔

خراماں خراماں معطر معطر۔

''نسیم آ رہی ہے کہ وہ آ رہے ہیں۔'' اسد نے حسب معمول اسے دیکھ کر تان لگائی۔

''تھینکس فار دا کمپلی منٹ۔'' وہ مسکرائی۔ ''کیا باتیں ہو رہی ہیں؟''

''کوئی خاص نہیں تم سناؤ کوئی نئی تازی۔'' خالد نے کہا۔

''میں؟'' وہ ہنس پڑی۔ ''میں نے کیا سنانی ہیں میں تو خود سن کر آ رہی ہوں۔ جہاں جاؤ ایک ہی ذکر ہے، میں تو گھبرا کر ادھر آ گئی۔''

''کون سا ذکر؟'' اسد نے دلچسپی سے پوچھا۔

''اب یہاں بھی نہ شروع کر دینا وہی ذکر۔'' اس نے ایک ادا سے بالوں کو جھٹکا۔ ''میں تو صبح سے عائشہ اور مغل کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سن کر بور ہو گئی ہوں۔''

عامر کا ٹائپ کرتا ہاتھ ایک لمحے کے لیے کی بورڈ پر رکا لیکن پھر اسی تیزی سے چلنے لگا۔

''یار سمجھ میں نہیں آ رہا عائشہ کو مغل کے ساتھ کون لوگ نتھی کر رہے ہیں۔'' اسد جھنجھلا گیا۔

''دھواں وہیں سے اٹھتا ہے جہاں کچھ نہ کچھ آگ ہو۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔ وہ تو وہاں آئی ہی اسی غرض سے تھی کہ یہ موضوع چھیڑ سکے ورنہ صبح سے یہی ذکر سن سن کر بور ہو جانے کے بعد اب اتنی دلچسپی سے اس گفتگو میں حصہ لینا کیا معنی رکھتا تھا؟

''یعنی تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ مغل اور عائشہ کے درمیان کوئی بات ہے۔'' خالد نے بے

یقینی سے کہا۔ ''ممکن ہی نہیں۔ ہم عائشہ کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ تو بہت نائس اور مختلف قسم کی لڑکی ہے۔''

''یہ بھی تم نے ایک ہی بات کی خالد۔'' غزالہ نے کہا۔ ''اس سے کس نے انکار کیا ہے کہ وہ نائس ہے لیکن کیا اچھے لوگوں پر ایک دوسرے کو پسند کرنے پر کوئی پابندی ہے؟ وہ نائس رہتے ہوئے بھی کسی کو پسند کر سکتی ہے۔ اس سے اس کی اچھائی میں کیا فرق پڑتا ہے۔''

''لیکن وہ تو۔'' خالد نے کن اکھیوں سے عامر کی طرف دیکھا جو آفس کے ایک کونے میں کمپیوٹر کی بورڈ سے الجھا ہوا تھا۔

''وہ کیا؟'' غزالہ بولی۔

''وہ تو کمٹڈ تھی۔'' خالد نے آہستگی سے کہا۔ ''اس لیے وہ ایسا نہیں کر سکتی۔''

غزالہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ ''بے وقوف ہو تم۔ کمٹڈ وہ تب تک تھی جب تک مغل نہیں آیا تھا۔ اگر کوئی زیادہ بہتر شخص سامنے آ جائے تو رائے بدلنا کوئی بری بات تو نہیں۔ کم از کم میرے نزدیک تو یہ کوئی غلط بات نہیں ہے۔''

''غزالہ بہت ہو چکی۔'' میں نے کہا۔ ''تم بالکل بے پر کی اُڑا رہی ہو۔ مغل کو اس نے کبھی گھاس بھی نہیں ڈالی۔ پتا نہیں تم کیا الٹی باتیں کر رہی ہو۔''

''میں کب کچھ کہہ رہی ہوں۔ میں نے بس رائے دی ہے اور وہ بھی خود عائشہ کے حق میں۔ بھلا اس میں کیا غلط ہے کہ آپ کسی اچھے شخص کی طرف قدم بڑھا دیں۔ میں اسے کوئی الزام تو نہیں دے رہی۔''

''تم کیا کہنا چاہتی ہو یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔'' میں اس سے الجھ پڑی۔ غصہ مجھے عامر پر بھی تھا جو خبر بنانے میں مصروف تھا اور منہ سے کچھ پھوٹ ہی نہیں رہا تھا۔ ''صاف اور واضح طور پر سن لو کہ اس کا مغل کے ساتھ کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ دوستی تک کا نہیں۔''

''او کے۔ ایسا ہی ہوگا۔'' اس نے کندھے اچکائے۔ ''اس کا مغل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوگا لیکن ہو سکتا ہے کہ مغل کا اس کے ساتھ کوئی تعلق ہو۔''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟'' اسد نے اسے گھورا۔

''میں نے کیا کہنا ہے۔ اب کیا یہ بھی میں نے کہا ہے کہ مغل نے عائشہ کا فیچر مکمل کیا ہے۔''

اس وقت تک کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس نے تمہارا فیچر مکمل کیا ہے۔

''کیا؟ اس نے عائشہ کا فیچر مکمل کیا ہے؟'' خالد نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، اچھے دوست ایسا کیا کرتے ہیں۔'' وہ بے نیازی سے بولی۔ ''اب عامر بھی تو اس کے فیچرز لکھ دیا کرتا تھا۔''

''صرف ایک مرتبہ لکھ کر دیا تھا۔'' میں نے اپنے غصے کو دبایا۔ ''اگر اس کی بیماری میں مغل نے اس کا یہ کام کر دیا ہے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''میں کب کہہ رہی ہوں کہ فرق پڑتا ہے۔ تم خواہ مخواہ ناراض ہو رہی ہو۔ بھئی اگر دوست ہی دوست کے کام نہ آئے تو پھر دوستی کس کام کی؟'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''ویسے اس موضوع کی زد سے بچنے کے لیے میں ادھر آئی تھی لیکن یہاں بھی یہی باتیں ہو رہی ہیں۔ اب کوئی اور کونہ کھدرا تلاش کرنا پڑے گا جہاں تھوڑی دیر سکون سے وقت گزر سکے۔ بائے۔''

وہ ہوا کے جھونکے کی طرح باہر نکل گئی۔ خالد اور اسد بھی چپ ہو گئے تھے اور عامر بدستور اپنے کام میں مصروف تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں کام سے باہر گئے تو میں عامر کے پاس چلی گئی۔

''تم اتنے آرام سے اس کی بکواس سنتے رہے۔ اسے چپ کیوں نہیں کرایا تم نے؟'' میں اس پر برس پڑی۔

''میں اسے چپ کیوں کراتا؟''

اس کا ردِعمل میرے لیے غیر متوقع تھا۔ ''کیا مطلب؟ اس نے عائشہ کے متعلق اتنی گھٹیا باتیں کی ہیں اور تم پوچھ رہے ہو کہ تم اسے چپ کیوں کراتے؟''

''ایزی ناہید ایزی۔ غزالہ کیانی نے غلط نہیں کہا۔ اسے بہتر کی طرف جانے کا پورا حق ہے خواہ وہ مغل ہو یا عمیر۔''

اس وقت فوری طور پر میرے ذہن میں عمیر کا خیال نہیں آیا۔ مجھے بھول ہی گیا تھا کہ وہ کس عمیر کا ذکر کر رہا ہے۔

''عامر! تم ہوش میں تو ہو؟'' میں حیرت سے بولی۔ ''میں نہیں جانتی کہ تم کس عمیر کا ذکر کر رہے ہو لیکن جہاں تک جاوید مغل کی بات ہے تو وہ صرف اور صرف غزالہ کیانی کے ذہن کی اختراع ہے جسے وہ ہر جگہ پھیلاتی پھر رہی ہے۔ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے؟''

''ناہید! میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتیں۔ پھر جب میں نہیں تو وہ کوئی بھی ہو

"اس سے میرے لیے کیا فرق پڑتا ہے۔"

اور وہ بھی کمرے سے باہر چلا گیا۔ میری تو عقل حیران تھی کہ وہ کیا کہہ گیا ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ غزالہ کیانی نے بہت غیر محسوس انداز میں تمہارے خلاف جس مہم کا آغاز کیا تھا اس میں وہ بہت حد تک کامیاب رہی ہے۔"

میں نے ایک گہری سانس لے کر کرسی کی پشت سے کمر ٹکا دی۔ جتنے منہ اتنی باتیں کا مفہوم آج ہی میری سمجھ میں آیا تھا۔ لوگوں نے کہاں کہاں کی باتیں نکالی تھیں۔ وہ بھی جن کا سرے سے وجود ہی نہیں تھا۔

"ناہید! تم ہی میری دوست ہو۔ میں تمہیں وہ باتیں بھی بتا رہی ہوں جو میں نے اب تک اپنی عزیز از جان بھابی کو بھی نہیں بتائیں۔" میں نے بالآخر کہا۔ "میں تو اتنے دن سے اپنی غلطی ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی ہوں لیکن کچھ پتا ہی نہیں چلتا کہ کہاں میرا قدم غلط پڑا ہے۔"

ابھی میں اسے تفصیل بتانے ہی لگی تھی کہ جاوید مغل دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

"ہیلو عائشہ اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" اس نے نرم مہربان آواز میں پوچھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" جواباً میں مسکرائی۔ "آپ نے تو اپنا مقروض کر دیا ہے۔"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ کام کرنے کی جگہ پر جہاں سے رزق حاصل کرتے ہیں، ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ ایک اچھے خاندان کی طرح رہنا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ میری کسی پریشانی کے موقع پر آپ بھی میری مدد ضرور کریں گی۔"

کچھ دیر وہ اپنی میز کی درازوں کے ساتھ کھٹ پٹ کرتا رہا۔ ہلکی سی کلک کی آواز نے مجھے اس جانب متوجہ کر لیا۔ شاید اس نے اپنی دراز کو تالا لگایا تھا۔

"حیرت ہے ہمارے ہاں یوں تالے لگانے کا رواج نہیں ہے۔" میں نے دل میں سوچا لیکن کچھ بولی نہیں اور پھر اس پر زیادہ غور تو بھی نہیں کیا۔ یہاں غور کرنے کو اور کم مسئلے تھے کیا۔ میز کی درازوں کو تالا لگا کے وہ کیبن نما کمرے سے باہر نکل گیا۔

"تم کچھ کہہ رہی تھیں؟" ناہید نے کہا۔

میں نے مختصراً اسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی۔

"تم نے غلط کیا عائشہ!" میری بات سننے کے بعد اس نے کہا۔ "اس معاشرے کے لحاظ سے تم نے سنگین غلطی کی ہے حالانکہ انسانیت کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس میں کچھ

بھی غلط نہیں تھا۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ ایک لڑکی سے اس بات کی توقع نہیں کرتا۔ جہاں اچھائی اور برائی کے معیار بہت جدا جدا ہیں۔ تم پر کوئی حرف، کوئی آواز، کوئی پتھر نہ اٹھتا اگر تم اسے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے ہوئے بھی تماشا دیکھتی رہتیں لیکن اسے دلاسا دیتے ہوئے، اسے نیچے سے اٹھا کر انسانیت کی سطح پر لانے کی کوشش کرتے ہوئے تم نے اپنی وفاداری مشکوک کر دی ہے۔"

"ناہید میں کوئی سنگی مجسمہ نہیں ہوں کہ اسے مرتے دیکھ کر بھی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرتی۔ میں ایک عام انسان، ایک عام لڑکی ہوں، میں کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی اور عامر نے مجھے پسند کرنے کی وجہ بھی یہی بتائی تھی کہ اسے میری نرم خوئی اور دوسروں کو تکلیف میں دیکھ کر مدد کرنے کی عادت پسند ہے۔ اسے میری محبت کرنے والی فطرت پسند تھی۔ کیونکہ اس کے ماں باپ اس سے محروم تھے۔ پھر جب میں نے ایک مرتے ہوئے شخص کو بچانے کی ایک ادنیٰ سی کوشش کی تو اس نے اسی بات کو بنیاد بنا کر بداعتمادی کا مظاہرہ کیا اور مجھ پر بے وفائی کا لیبل لگا دیا۔"

"عائشہ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ اسی معاشرے کی پیداوار ہے اور اس کی سوچ اس سے مختلف نہیں ہے، خاص طور پر اس صورت میں جب وہ محبت سے ہمیشہ محروم رہا ہے۔ وہ تمہاری محبت اور نرم خوئی کو پسند کرتا ہے لیکن صرف اپنے لیے۔ وہ اس معاشرے کا ایک حصہ ہے جو صرف تم سے پوچھے گا کہ تم اپنے سابق منگیتر پر اس قدر مہربان کیوں ہوئیں؟ تم ہر شخص پر تو اتنی مہربان نہیں ہوتیں۔"

"یہ سوال مجھ سے عمیر نے بھی کیا تھا اور عامر نے بھی۔ عمیر کو تو میں نے مطمئن کر دیا تھا لیکن عامر نے میری بات سننے کی زحمت تک نہیں کی۔ اس نے مجھ سے یہ تو پوچھا کہ میں ایک شخص پر اتنا التفات کیوں کر رہی ہوں لیکن میرا جواب سنے بغیر ہی چلا گیا۔" میں نے ہونٹ دانتوں تلے دبایا۔ "میں اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ پرانا تعلق جو اس وقت قائم کیا اور پھر توڑا گیا تھا۔ جب میرا ناپختہ ذہن اس قسم کی باتوں کو سمجھنے سے قاصر تھا، اب مکمل طور پر ختم ہو چکا ہے۔ لیکن رشتے ختم ہو جانے سے انسان بے چہرہ اور بے شناخت نہیں ہو جاتے، ہم زندگی میں محبت بہت سے خانوں میں تقسیم کر دیتے ہیں اور ہر کسی کو اس کے حصے کی محبت دیتے ہیں اس لیے ہم اس کے پابند بنا دیئے گئے ہیں۔ انسان کی کتاب زندگی میں لمحہ لمحہ کی اہمیت ہوتی ہے تو

پھر یہ ڈیڑھ سال غیر اہم کیسے ہو سکتے ہیں۔ یہ تو مرنے کے بعد بھی میرے ساتھ رہیں گے کیونکہ میں ماضی کو اپنی ذات سے الگ نہیں کر سکتی۔" پھر میں ایک لمحے کے توقف سے بولی۔ "اگر برسوں بعد عامر مجھے کہیں بے یار و مددگار تڑپتے سسکتے دیکھے تو کیا وہ مجھے یونہی چھوڑ جائے گا؟"

"شاید نہیں۔"

"جب وہ پرانا تعلق ختم ہونے کے بعد مجھے اجنبی نہیں سمجھ سکتا تو مجھ سے ایسی توقع کیوں کرتا ہے؟ میں اس کے لیے لاکھ اجنبی سہی پھر بھی وہ میری مدد کرے گا لیکن ہر اجنبی کی مدد وہ بھی نہیں کرے گا ناں۔ محض اس لیے کہ وہ اس کے لیے بے شناخت وجود ہو سکتے ہیں، میں نہیں۔ اتنی چھوٹی سی بات وہ سمجھ نہیں پا رہا۔"

"عائشہ ڈیئر ایک چھوٹی سی بات تم بھی نہیں سمجھ پا رہیں۔" اس نے کہا۔ "وہ ایسے معاشرے میں جہاں مرد حاکم ہوتا ہے، رہنے والا ایک مرد ہے اور ایسی سوسائٹی میں مردوں اور عورتوں کے معیار اور ضابطہ اخلاق ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو وسیع القلب کہلائے گا لیکن تم ایسا کرو گی تو معاشرے میں معتوب ٹھہرو گی۔" کچھ دیر ٹھہر کر وہ پھر بولی۔ "تم نے پروین شاکر کی صد برگ پڑھی ہے؟"

میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔

"وہ اس کے دیباچے "رزق ہوا" میں لکھتی ہے کہ سنگینوں میں پروئے ہوئے بچے اور نیزوں پر سجے ہوئے جوان سر میری نگاہوں کے سامنے سے گزرتے رہے اور میں قتل ہونے والوں کے نام تک نہ پوچھ سکی کہ ایسا کرنے میں وفاداریاں مشکوک ہو جاتی ہیں۔ مرگِ انبوہ تو یوں بھی جشن کا ساماں رکھتی ہے۔ سو تماشا دیکھنے والوں میں میری آنکھیں بھی شامل رہیں۔ اس لیے عائشہ پیاری اگر تم بھی تماشا دیکھتی رہتیں تو کچھ نہ ہوتا ساری غلطی تمہارے اس شعور کی ہے جو یہ معاشرہ تمہیں عطا بھی کرتا ہے اور استعمال کرنے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔"

"عامر میرے لیے سب کچھ ہے، میں اسے اس قدر چاہتی ہوں کہ اتنی شدتوں تک تو اس کا ذہن سوچ بھی نہیں سکتا لیکن میری محبت کا بلڈ گروپ اونیگٹو ہے مجھے اپنی محبت ایک شخص کے لیے بچا کر نہیں رکھنی بلکہ ہر حق دار کو اس کا حصہ دینا ہے اور امانت میں یہ خیانت کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ میں بہت سے لوگوں کی محبت کے مقابلے میں ایک شخص کی محبت قربان کر دوں۔" میں نے اپنی آواز پر قابو پانے کی کوشش کی جس میں آنسوؤں کی نمی بھیگتی جا رہی تھی۔ "میں بے حس

نہیں بن سکتی۔ یہ معاشرہ ایک لڑکی کا نرم دل اور مہربان ہونا پسند اور تسلیم تو کرتا ہے لیکن اگر صحیح موقع پر نرم دلی اور مہربانی کرنے سے روکتا ہے تو یہ اس معاشرے کی بیماری ہے میری نہیں۔"

میں نے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"اگر عامر تمہارے پاس واپس آ جائے تو؟" اس نے پوچھا تو میرا نمبر ڈائل کرتا ہوا ہاتھ رک گیا۔

"کیا تمہارے خیال میں وہ واپس آ جائے گا؟" میں نے الٹا اس سے سوال کیا۔

"اس بات کو چھوڑو، یہ بتاؤ کہ اگر وہ آ گیا اور اس نے تمہاری سب باتیں درست تسلیم کر کے تجدیدِ تعلق کی کوشش کی تو تمہارا کیا جواب ہو گا۔"

"میں بہت حقیقت پسند ہوں۔" میں نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ "مرد کتنا ہی اچھا شوہر یا محبوب کیوں نہ ہو وہ زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ اپنی بیوی یا محبوبہ کے سامنے اس معاشرے کے ایک بے حد عام اور سطحی ذہن رکھنے والے شخص کا روپ ضرور دھارتا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے لیکن اتنا طے ہے کہ وہ ایسا ضرور کرتا ہے۔ اچھا ہے کہ عامر نے یہ ضرورت شادی سے پہلے پوری کر لی ہے۔ اب میری باتوں کو درست مان لینے کے بعد وہ کم از کم ایسی حرکت دوبارہ نہیں دہرائے گا اور ایک بار پھر ویسا ہی عامر بن جائے گا جیسا کہ وہ اصل میں ہے۔ اس لیے میں تجدیدِ تعلق میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کروں گی۔"

"تم بہت اعلیٰ ظرف ہو۔" ناہید نے کہا۔

"نہیں، میں حقیقت پسند اور کسی حد تک مجبور ہوں۔"

میں نے ایک بار پھر فون اٹھایا اور ڈاکٹر فرخ کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ اپنی بیماری کے ایام میں، میں وہاں فون تک نہیں کر سکی تھی لیکن وہاں ایک اور دھماکا میرا منتظر تھا۔

"وہ تو اسی دن کلینک سے بغیر کچھ بتائے چلا گیا تھا۔" ڈاکٹر فرخ نے بتایا۔ "موت اور زندگی تو خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک ادنیٰ سا وسیلہ بنا رکھا ہے۔ ہمارے علم کے مطابق وہ موت کے دہانے پر پہنچ چکا تھا لیکن اب تک قوتِ ارادی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ جس کی وجہ سے میں پُر امید ہو گیا تھا۔ پتا نہیں اچانک کیوں بھاگ گیا۔ ویسے ہیروئن کے شکار اکثر مریض یونہی کلینک سے بھاگ جاتے ہیں۔"

میں نے بے بسی سے فون کریڈل پر رکھ دیا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا

کروں۔ بالآخر میں نے کار کی چابی اور بیگ اٹھایا۔

"ناہید میرے ساتھ چلو گی؟"

"کیوں نہیں۔"

کمرے سے باہر نکلتے ہوئے ہم نے ایک مرتبہ پھر کلک کی آواز سنی لیکن اسے نظر انداز کر کے چل پڑے۔ آج تنور پر وہ دوسرا شخص بیٹھا ہوا تھا۔

"بھائی، مجھے عمیر سے ملنا تھا۔"

اس نے میری جانب دیکھا۔ "شکر ہے باجی جی آپ آ گئیں۔ وہ بہت بیمار ہے۔ کہہ رہا تھا آپ اس کا علاج کروا رہی تھیں لیکن ہے نا پڑھا لکھا۔ اتنا پڑھ لکھ کر اس کی کھوپڑی الٹ گئی ہے۔ پتا نہیں کیوں وہاں سے بھاگ آیا۔ باجی جی خدا کے لیے اسے کسی اسپتال میں پہنچائیں ورنہ وہ مر جائے گا۔" اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"ہم اسی لیے آئے ہیں۔ وہ ہے کہاں؟"

"چلیں، میں آپ کو لے چلتا ہوں۔" اس نے جوتے پہنے اور ایک اور بندے کو اپنی جگہ بٹھا کر ہمارے پاس آ گیا۔ "باجی جی ہماری گلی بہت چھوٹی ہے۔ آپ کی کار نہیں جا سکے گی۔ پیدل ہی جانا پڑے گا وہاں۔"

"چلو۔"

وہ ہمیں نہ جانے کن کن تنگ گلیوں سے گزارتے ہوئے بالآخر ایک ایسی جگہ پر پہنچا جو پہلی گلیوں سے بھی زیادہ تنگ گلی تھی اور بیک وقت دو آدمی کندھے سے کندھا ملا کر نہیں چل سکتے تھے۔ اس نے دائیں طرف کے ایک سبزی مائل نیلے دروازے کو کھولا اور ہمیں اندر آنے کا کہہ کر خود بھی اندر داخل ہو گیا۔ دروازے کے ساتھ ہی بائیں جانب ایک تاریک سا کمرا تھا، وہ اس میں داخل ہو گیا۔ کچھ دیر تو ہماری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے سے قاصر رہیں لیکن پھر آہستہ آہستہ ہم اس تاریکی کے عادی ہو گئے۔ سامنے ایک جھلنگا سی چارپائی پر دیوار سے پشت ٹکائے عمیر ہماری ہی جانب دیکھ رہا تھا، اس کی ذہین نیلی آنکھوں میں بہت سی حسرتیں تھیں۔

"تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔" بالآخر وہ بولا۔

"تم کلینک سے یہاں کیوں آ گئے؟ پتا ہے ڈاکٹر فرخ کتنے پُر امید تھے۔ چلو میں تمہیں لینے آئی ہوں۔"

وہ ہولے سے ہنس دیا۔ "اب کہیں لے جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے؟"

"تم کہاں کے بڑے ڈاکٹر آ گئے۔ جب ڈاکٹر فرخ نے کہا ہے کہ تم ٹھیک ہو جاؤ گے تو پھر تمہیں اپنی ڈاکٹری جھاڑنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں سمجھنے کے لیے علم کی نہیں وجدان کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"خواہ مخواہ فلسفہ بول کر مجھے امپریس کرنے کی کوشش مت کرو۔ میں سیدھی سادی بات کر رہی ہوں۔ تمہیں کلینک چلنا ہے اور تم انکار نہیں کرو گے۔"

"پہلی مرتبہ میں نے انکار نہیں کیا تھا، صرف تمہاری خاطر اور اب تمہاری خاطر انکار کر رہا ہوں۔ پلیز مجھ سے وجہ نہ پوچھنا۔"

"خدا کے لیے عمیر۔ تم اتنے مایوس کیوں ہو؟"

"اب میں مایوس نہیں بہت خوش ہوں۔ عائشہ میں نے بہت تکلیفیں اٹھائی ہیں لیکن اس میں کسی اور کا نہیں میرا اپنا دوش ہے۔ میں نے خود اپنے ساتھ دشمنی کی ہے۔"

"اور تم اب بھی یہی کر رہے ہو۔" ناہید نے اسے درمیان میں ٹوکا۔

"نہیں۔ اب تو میں خوش ہوں۔ میں نے صرف ایک چھوٹی سی خواہش کی تھی اور بہت گنہگار ہونے کے باوجود بھی اللہ تعالیٰ کی رحیم و کریم ذات نے میری وہ خواہش پوری کر دی۔ زندگی اُمنگوں کا نام ہے۔ جب اُمنگ ہی ختم ہو جائے تو زندگی کیسی؟ میری زندگی کی ایک ہی اُمنگ باقی رہ گئی تھی سو وہ بھی پوری ہو گئی۔"

"یہ مایوسی نہیں تو اور کیا ہے۔ تم صحت مند ہو گئے تو زندگی کی رونقیں ایک بار پھر تمہیں اپنی طرف متوجہ کریں گی۔" میں نے کہا۔

"میں کس حال میں واپس جاؤں گا؟ کون مجھے قبول کرے گا؟ میں اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا نہیں کوئی سکھ نہ دے سکا۔ میری وجہ سے انہوں نے شہر تک چھوڑ دیا۔ میری زندگی کی ہر خوشی ختم ہو گئی۔ میں انسانیت کی سطح سے اس حد تک گر گیا کہ ہیروئن پینے کے لیے گندی سے گندی جگہ میں پناہ لینے لگا۔ کبھی نالیوں، میں، کبھی کسی گندے جوہڑ کے کنارے کیونکہ وہاں کسی کے آنے کا خدشہ نہیں ہوتا۔ گندگی کے ڈھیر کے پاس بھلا کون آتا ہے؟ میں نے اپنا نشہ پورا کرنے کے لیے پہلے اپنے اور پھر اپنے دوستوں کے گھروں کی چھوٹی بڑی چیزیں چرائیں۔

عائشہ! یہ نشہ انسان کو بہت خوار کرتا ہے۔ میرے الیکٹریکل انجینئرنگ کے فائنل امتحان ہونے والے تھے۔ جب مجھے یونیورسٹی سے نکال دیا گیا۔ یوں بھی میں پڑھنے کے قابل کب تھا؟ سب کچھ ختم ہو رہا تھا۔ سب تعلق، سب رشتے، سب ناتے۔ میں گھر سے بے گھر ہو گیا۔ کبھی ایک دوست کے آگے دستِ سوال دراز کرتا اور کبھی دوسرے کے سامنے لیکن کب تک؟ مختلف چھوٹے چھوٹے کام کرتے کرتے میں اس تنور تک پہنچ گیا۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

''اب ان باتوں کو دہرانے سے کیا فائدہ؟'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''تم ابھی جوان ہو، ایک مرتبہ پھر اپنی زندگی شروع کر سکتے ہو، لیکن اس کے لیے تمہیں مایوسی سے نکلنا ہوگا۔''

''تم میری بات سمجھنے کی کوشش کرو، میں مایوس نہیں ہوں۔ میری ایک خواہش تھی جو پوری ہو چکی ہے۔ اب مجھے زندہ رہ کے کرنا بھی کیا ہے؟''

''تمہارے پاپا اب بھی تمہارا انتظار کرتے ہوں گے۔'' میں نے جذباتی بلیک میلنگ کی کوشش کی۔

''نہیں، اب وہ میرا انتظار نہیں کرتے۔ انہوں نے یتیم خانے سے ایک لاوارث بچہ لے کر پالنا شروع کر دیا ہے۔ میں ان کے سامنے گیا تو انہوں نے واضح طور پر کہہ دیا کہ اب ان کے گھر میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔''

میں نے بے بسی سے ناہید کی طرف دیکھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے ساتھ چلنے کے لیے کیسے رضامند کروں۔

''میرے لیے کوئی راہ بھی کھلی ہوئی نہیں ہے۔ یہ معاشرہ مجھے مکمل طور پر ریجیکٹ کر چکا ہے۔'' اس نے کہا۔

''تم اپنے آپ کو تبدیل کر لو تو ہر کسی کے بازو اپنے لیے وا پاؤ گے۔'' میں نے اسے سمجھایا۔

''کیوں جھوٹ بولتی ہو۔'' وہ تلخی سے ہنسا۔ ''میرے لیے سب سے اہم وہ رشتہ تھا جو ایک ننھی سی انگوٹھی کے ذریعے طے ہوا تھا۔ کیا وہ رشتہ پھر استوار ہو سکتا ہے؟''

میں نے بے یقینی سے اس کی جانب دیکھا۔

''نہیں۔'' وہ بولا۔ ''تم عامر سے بے تحاشا محبت کرتی ہو۔ اس بات کا ثبوت وہ گفتگو ہے جو کلینک کے کمرے میں تمہارے اور عامر کے درمیان ہوئی تھی۔''

یہ میرے لیے ایک اور شاک تھا کہ اس نے وہ باتیں سن لی تھیں۔ وہ اس وقت سویا ہوا

تھا اور ہم آپس میں الجھ پڑے تھے۔ ہم دونوں کو خیال تک نہ آیا کہ وہ ہماری باتیں سن سکتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت ہمیں وہاں کسی تیسرے وجود کا احساس ہی نہیں تھا۔

''تم عامر سے شدید محبت کرتی ہو اور میں تم سے شدید ترین۔ انسانیت کی سطح سے گرنے کے بعد میں اب سے بہت پہلے مر چکا ہوتا لیکن میری صرف اور صرف یہ خواہش تھی کہ کسی طرح ایک بار، آخری بار تمہیں دیکھ سکوں۔ جس دن تم ڈرائنگ روم کے دروازے کی جھری سے مجھے دیکھ رہی تھیں اس دن نہ جانے کیسے دروازہ کھل گیا تھا۔ میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس دن تم نے مجھے اپنا اسیر بنا لیا تھا۔ تب میں نے اس دن کو کوسا جب میں نے محض تجربہ کرنے کے لیے پہلی مرتبہ ہیروئن استعمال کی تھی، لیکن اس وقت میرے پاس پچھتانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔'' اس کا سانس پھولنے لگا۔

''چپ کر جا عمیرے!'' تنور والے نے آگے بڑھ کر اس کا سینہ مسلنا شروع کیا۔ پتا نہیں وہ پہلے سے یہاں موجود تھا یا ابھی آیا تھا، مجھے کچھ خبر نہ تھی۔ میں تو اپنی جگہ بالکل ساکت و صامت کھڑی تھی۔

''عائشہ لوٹ جاؤ، اپنے عامر کے پاس واپس چلی جاؤ۔ مجھ جیسے قابلِ نفرت انسان کے لیے اپنی زندگی داؤ پر مت لگاؤ۔ میں تمہارا گھر، تمہارا مستقبل برباد کرنے کے لیے تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔ لوٹ جاؤ واپس۔'' اس کی سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں اور میرے پاؤں جیسے کسی نے زمین کے ساتھ جکڑ دیے تھے۔

اور پھر جو کچھ ہوا گو غیر متوقع نہیں تھا پھر بھی بہت اچانک اور بے حد شاکنگ (Shocking) تھا۔ مجھے تو کچھ سمجھنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ حواس قابو میں آئے تو تنور والا روتے روتے اس کی آنکھیں بند کر رہا تھا۔ پھر اس نے پائنتی پر رکھی چادر سر سے پیر تک اسے اوڑھا دی۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ ناہید خاموشی سے رو رہی تھی اور میری آنکھیں بالکل خشک تھیں۔ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ عمیر مر چکا ہے۔ ہمیشہ کے لیے۔

پھر کمرے میں دو افراد داخل ہوئے، جاوید مغل اور عامر لیکن اب وہاں تھا ہی کیا۔ عامر نے میرا ہاتھ تھاما اور باہر نکل آیا۔ میں جیسے کسی اور دنیا سے نکل کر اپنی دنیا میں لوٹ آئی۔ ناہید اور جاوید مغل ہمارے آگے آگے واپسی کے راستے پر رواں تھے۔ ہم چاروں ہی خاموش تھے۔ بغیر کوئی بات کیے ناہید جاوید مغل کے ساتھ اس کی بائیک پر بیٹھ گئی اور عامر مجھے ساتھ

لے کر کار کی طرف بڑھا۔ اس نے خود ہی میرے بیگ سے چابی نکالی اور پہلے میرے لیے دروازہ کھولا اور پھر خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''میں تو تمہیں سوری کہنے کا بھی حق دار نہیں ہوں۔'' اس کے لہجے میں شرمندگی تھی۔ ''میں نے تمہاری محبت پر شک کیا، حالانکہ تم میں تو پوجے جانے کی حد تک بہترین صفات موجود ہیں۔ میں تمام زندگی جاوید مغل کا یہ احسان نہیں بھلا سکوں گا جو اس نے آج مجھ پر کیا ہے۔''

اس نے جیب سے ایک کیسٹ نکال کر میری طرف بڑھائی۔ ''اگر میں اسی دن تم سے بات کلیئر کر لیتا تو مجھے کوئی گلہ نہ ہوتا، لیکن میں شاید ناہید کی طرح Considerate (دوسروں کا لحاظ رکھنے والا) نہیں تھا۔''

تو وہ کلک کی آواز تالے کی نہیں مغل کے ڈکٹا فون کی تھی۔ میرا دل اس کے لیے تشکر کے جذبات سے معمور ہو گیا۔ میں نے کار ڈیک میں استاد امانت علی کی کیسٹ لگا دی۔

تُو چنتا صرف مجھی کو
پہچان تجھے گر ہوتی
انصاف سے تُو خود کہتا
یہ کنکر ہے یہ موتی
میرا پیار تجھے سمجھائے
آ میرے پیار کی خوشبو
منزل پہ تجھے پہنچائے

میں نے آنکھیں موند لیں۔

میری آنکھوں میں بہت سارے آنسو جمع ہو چکے تھے۔ عمیر کی موت کے غم کے، عامر کے لوٹ آنے کی خوشی کے اور جاوید مغل کی بے غرض دوستی کے تشکر کے۔ اور میں نے عامر کے کندھے سے سر ٹکا کر وہ تمام آنسو بہا ڈالے کہ وہی تو میرا اپنا تھا اور اب ہم دونوں سب کچھ ایک دوسرے کے ساتھ شیئر کر سکتے تھے۔

☆=====☆=====☆

ایک خلش کو

بابل کا گھر چھوڑنا بھی اس کے اختیار میں تھا اور سسرال کا در چھوڑنا بھی۔ وہ منافق معاشرے کے قائم کیے ہوئے نام نہاد معیارِ عزت کی قربان گاہ پر خود کو بھینٹ نہیں چڑھا سکتی تھی۔ شوہر کی ناجائز آرزوؤں پرستی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے خوف کے آکٹوپس کی سب ٹانگیں کاٹ ڈالی تھیں۔

''تمہیں یاد ہے نازی ہم نے سوشیالوجی کی کلاس میں ایک مرتبہ ڈسکشن کی تھی کہ چولہے کیوں پھٹتے ہیں اور پھٹ جائیں تو ان کا شکار صرف بہو کیوں ہوتی ہے۔ ہم سب نے صرف اندازے لگائے تھے کیونکہ انٹرویوز میں کوئی بھی عینی شاہد صحیح بات بتانے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ دو اور دو چار کی طرح ہم نے ایک Calculateed سی اسائنمنٹ بھی لکھ دی تھی اور پروفیسر نقوی نے مجھے +A دیا تھا لیکن نازی زندگی دو اور دو چار کی طرح حسابی نہیں ہوتی' حقیقت اس سے کہیں زیادہ بھیانک اور تکلیف دہ ہوتی ہے جسے احاطہ تحریر میں لانا بہت مشکل ہے۔ اس کا اندازہ مجھے آج ہوتا ہے۔ مجھے علم ہے کہ اب سے کچھ دیر بعد جب میں کچن میں چائے بنانے جاؤں گی تو میرا دوپٹہ آگ پکڑ لے گا میرے چیخنے چلانے کی آواز سن کر گھر والے آئیں گے لیکن تب تک میں بری طرح جھلس چکی ہوں گی اور زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے میو ہسپتال یا راستے میں ہی دم توڑ دوں گی۔ اس کے بعد میری ساس' نندیں اور احمد بہت سے آنسو بھی بہائیں گے۔ قل' دسویں' جمعراتیں اور چہلم بھی دھوم دھام سے ہوگا۔ اس رقعے کے ساتھ میری ڈائری بھی ہوگی۔ جس میں شادی کے بعد سے اب تک گزرنے والے تمام لمحے میں نے قید کر رکھے ہیں۔ میرے جنازے پہ ضرور آنا۔

تمہاری شی

میرا تعلق روایات میں جکڑے ہوئے ایک ایسے خاندان سے ہے جس کے افرادِ خانہ میں کلرک باپ' ہر وقت کام کرتی اور کھانسی دمہ کے مرض میں مبتلا ماں' سات بہنیں اور دو بھائی

شامل ہیں۔ ان میں میرا نمبر چوتھا ہے۔ مجھ سے بڑی تین بہنیں میٹرک پاس کر کے سلائی کڑھائی اور گھر کے کام کاج میں ماہر ہیں لیکن ان کے اس ہنر کی کسی کی نظر میں کوئی قدر نہیں کیونکہ یہ خصوصیات تو دو سو روپے ماہوار پر کام کرنے والی ایک نوکرانی میں بھی ہوتی ہیں۔ بہو کے پاس تو کچھ اور خصوصیات بھی ہونی چاہئیں۔ یہ ''کچھ اور خصوصیات'' ہماری پوری کوشش کے باوجود بھی ہم میں پیدا نہیں ہو سکتیں۔ کم از کم اس وقت تک جب تک ابا وہ جوہر نہ دکھائیں جو عام طور پر اس طبقے کے دیگر افراد دکھاتے ہیں۔ اس ماحول میں ہر وقت کی چخ چخ کوئی انہونی بات نہیں اور میرے لیے پناہ کا واحد ذریعہ وہ کتابیں ہیں جو اب تک میرے لیے سرمایہ ہیں۔ پڑھائی میں پناہ لینے کی وجہ سے میں ہمیشہ اچھی پوزیشن اور وظیفہ لیتی آئی ہوں۔ اسی وظیفے کی وجہ سے میری پڑھائی میں کبھی رکاوٹ نہیں پڑی اور ایم۔اے تک پہنچنے کے لیے مجھے کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ میں پہلا قدم رکھتے ہی مجھے احساس ہوا کہ یہ دنیا میرے لیے نئی ہے۔ اسلامیہ کالج جہاں میں چار سال تک پڑھتی رہی تھی' میرے نزدیک علم کا واحد گہوارہ تھا۔ یونیورسٹی میں جدید فیشن میں ملبوس لڑکیاں اور لڑکے جب پٹاخ پٹاخ کر کے انگریزی بولتے تو میں گرامر کی باریکیوں میں ہی الجھ کر رہ جاتی اور بات کرنے والا بات ختم کر کے میری طرف سے جواب کا منتظر ہوتا۔ ظاہر ہے میرے لیے یہ صورتِ حال کچھ خوشگوار نہ تھی۔ اسی وجہ سے میں نے مزید اپنے خول میں سمٹنا شروع کر دیا۔

''ارے نازی! یہ تم کیا ہر وقت کتابوں میں سر دیے رہتی ہو۔'' شیریں نے قریب رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''کبھی اِدھر اُدھر بھی دیکھ لیا کرو۔''

ابھی میں پہلے ہلے یعنی ''نازی'' سے ہی نہیں سنبھلی تھی تو اگلی بات کا کیا جواب دیتی۔

''کچھ پریشان ہو گیا؟'' شیریں نے مجھے اپنی طرف ٹکر ٹکر دیکھتے پایا تو تشویش سے پوچھا۔

''نہیں'' میں نے بوکھلا کر کہا۔ ''میں نے سوچا تم نے کسی اور سے بات کی ہے۔''

''اِدھر تمہارے علاوہ کون سی نازی ہے۔''

''لیکن میں تو نازنین ہوں۔'' بوکھلاہٹ میں میرے منہ سے اتنا ہی نکلا۔

''نازنین یا نازی ایک ہی بات تو ہے۔'' اس نے ہنس کر کہا۔ اس کے موتیوں کی لڑیوں

جیسے دانت چند ثانیے کو چمکے۔

''یا خدا خوبصورتی اور وہ بھی اتنی زیادہ ایک جگہ اکٹھی کیسے ہوگئی۔'' میں نے دل میں سوچا۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' شیریں نے مجھے اپنی طرف دیکھتے پا کر کہا۔

''سوچ رہی ہوں کہ ان تین میں سے کون سی ایک کتاب ایشو کراؤں۔'' میں نے سامنے پڑی کتابوں کی طرف اشارہ کر کے بات بدلنے کی کوشش کی۔

شیریں میری یہ بات سن کر ہنس پڑی۔

''میں نے کوئی لطیفہ تو نہیں سنایا۔'' میرا اعتماد اب کافی حد تک بحال ہو چکا تھا۔

''ہے تو کچھ لطیفہ ہی۔'' اس نے کہا۔ ''میرا خیال ہے تم بائیس برس کی ہو چکی ہو۔ افسوس تمہیں اس دوران جھوٹ بولنے کا سلیقہ بھی نہ آیا۔''

''اے شی! تم یہاں بیٹھی ہو اور میں تمہیں پورے ڈیپارٹمنٹ میں تلاش کر چکا ہوں۔'' نوفل نے میز پر کتابیں رکھتے ہوئے کہا۔

''میں نازی سے باتیں کر رہی تھی۔''

''پھر صرف تم ہی کر رہی ہوگی' کیونکہ ان کے منہ میں تو زبان ہی نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔

میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ میں جب سے ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہوئی تھی' اسے ہمیشہ تین چیزوں کے ہمراہ دیکھتی آ رہی تھی۔ اس کی قمیص کی جیب میں موجود گولڈ لیف کی ڈبی' ہارا کی نیلی جینز اور اس کی لوپس میں لگی اس کی ٹریل موٹر بائیک کی کی چین' قمیص البتہ وہ وقفے وقفے سے تبدیل کرتا رہتا تھا اور آج اس نے کرانتی کی نیلے رنگ' کی قمیص پہن رکھی تھی۔

''میرے منہ میں زبان موجود ہے لیکن میں اس کا استعمال فالتو چیز کی طرح ہر وقت اور ہر جگہ نہیں کرتی۔'' اردو میں بات چیت ہوتے دیکھ کر میرا اعتماد کافی حد تک بحال ہو چکا تھا۔

''باتیں تو آپ اچھی کر لیتی ہیں' ویسے اپنی زبان کو اتنا سنبھال کر بھی مت رکھیں کہ استعمال کے وقت پتہ چلے زبان کو تو زنگ لگ چکا ہے۔''

''شٹ اَپ ناؤ (Shutup now)'' شی نے بے زاری سے کہا۔ ''بھوک لگ رہی

ہے کینٹین چلو۔''

کینٹین کا ذکر سن کر عامر' اظفر اور لیلیٰ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

نیلی آنکھوں والا عامر بھوک کا بہت کچا تھا۔ جہاں کینٹین کا ذکر چلا وہ فوراً ساتھ چلنے پر آمادہ ہو جاتا۔ اظفر کا شمار کلاس کے لائق ترین لڑکوں میں ہوتا تھا۔ اس کا اور شی کا ساتھ بہت پرانا تھا۔ دونوں اکٹھے سوئس اسکولوں میں پڑھے تھے اور اکٹھے ہی لائبریریاں چھانا کرتے تھے۔ اچھی کتابیں دونوں کی کمزوری تھیں۔

لیلیٰ کے پاپا اور ممی دونوں سول سروس میں تھے۔ وہ صرف دو بہنیں تھیں اور دونوں ہی ایک مقامی خواتین تنظیم کی رکن بھی تھیں۔ لیلیٰ' شی اور اظفر ایک دوسرے کو کافی پہلے سے جانتے تھے۔ جبکہ عامر سے ان کی دوستی ایم۔ اے میں آ کر ہی ہوئی تھی۔ نوفل کے پاپا بزنس مین تھے جبکہ اس کی ممی کا واحد کام شاپنگ کرنا اور بڑی بڑی پارٹیز اٹینڈ کرنا تھا۔ ادب بالخصوص شاعری سے نوفل کو بہت دلچسپی تھی۔

مجھے بھی سب نے کینٹین چلنے پر مجبور کیا۔ میرے اندر کی بند لڑکی مجھے اس کی اجازت نہیں دے رہی تھی لیکن باہر کی لڑکی دنیا کے حسین رنگ دیکھنا چاہتی تھی۔ سو جیت اسی کی ہوئی۔

''سوشیالوجی کی طالبہ ہونے کے ناتے تمہیں زیادہ سے زیادہ لوگوں سے ملنا چاہیے نازی۔'' شی نے سموسہ کھاتے ہوئے کہا۔

چھوٹی سی گرے اور آتشی گلابی قمیص اور گرے ٹراؤزر میں ملبوس' بالوں کو نیٹ کے ربن میں بے پروائی سے باندھے وہ سب سے منفرد نظر آ رہی تھی۔

''دوسروں کے خیالات جاننے کے لیے کبھی کبھار خود بھی بات کر لینی چاہیے۔'' اظفر نے مجھے چپ چاپ بیٹھے دیکھ کر کہا۔ ''اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔''

''یار اچھا نہیں ہے کہ کوئی لڑکی چپ بیٹھی ہے۔'' عامر بولا۔ ''ورنہ یہ دو خواتین جو ہمارے ساتھ ہیں ان کے ہوتے ہم کچھ بول سکتے ہیں۔''

اتنا سننا تھا کہ شی نے چائے کی پیالی میز پر رکھی اور انگریزی کی لغت سے تمام بھاری بھرکم الفاظ نکال کر عامر سے بحث میں استعمال کرنے لگی۔ اس کا لب و لہجہ ویسا ہی تھا جیسے ٹی وی کے انگریزی پروگراموں میں ہوتا ہے لیکن بات کرنے کی رفتار کافی تیز تھی۔ اس

لیے جو تھوڑا بہت میرے پلے پڑا اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ شی حقوقِ نسواں کی کافی بڑی علمبردار ہے۔ لیلیٰ بھی جگہ جگہ شی کو لقمے دیتی جا رہی تھی میں چونکہ گھر کے کسی فرد خصوصاً ابا اور بھائیوں سے کبھی اونچی آواز میں نہ بولی تھی اس لیے کسی لڑکی کا کسی لڑکے کے ساتھ ایسے بات کرنا میرے لیے حیران کن بات تھی۔ کیا کوئی لڑکی اس قدر بولڈ ہو سکتی ہے کہ اتنے بڑے لڑکے کے ساتھ اتنی گرم بحث کر سکے۔ مجھے یونیورسٹی میں داخلہ دلاتے وقت اماں نے بطور خاص نصیحت کی تھی کہ لڑکوں کو منہ مت لگانا۔ ویسے بھی جس جگہ میں رہتی تھی وہاں یونیورسٹی کے لڑکے تو لڑکے' لڑکیوں کے متعلق بھی کسی کی اچھی رائے نہیں تھی۔

''تم ایک پڑھے لکھے شخص ہو عامر لیکن تمہارے ذہن ابھی تک وہیں ہیں جہاں تمہارے بڑوں کے تھے' جن کی نظر میں عورت کا واحد کام بچے پالنا اور چولہا ہانڈی سنبھالنا ہے۔ ان کے وقت چونکہ عورت کا سوائے زبان کے کسی چیز پہ اختیار نہ تھا اس لیے وہ اپنی زبان کا بے دریغ استعمال کرتی تھی۔'' شی کہہ رہی تھی۔ ''آج کی عورت کو کرنے کے لیے بے شمار کام ہیں اس لیے اس نے زبان کا استعمال کم کر دیا ہے۔ البتہ ہمارے ہاں کے مرد اس سے آج بھی خوفزدہ ہیں۔ آج دنیا کے ہر شعبے میں عورت مردوں سے آگے ہے اور مرد اس خوف میں مبتلا ہے کہ جس صنف کو ہم نے آج تک باندھ کر رکھا ہے' کل کو ہم سے آگے نکل گئی تو ہمارا کیا بنے گا۔ اپنی اپروچ کو تبدیل کرو عامر' جس خول میں تم لوگوں نے خود کو بند کر رکھا ہے' اس سے اپنے آپ کو باہر نکالو۔''

''او کے بابا! غلطی ہو گئی۔ میں معافی کا خواستگار ہوں۔'' عامر نے آخر کار ہتھیار ڈال دیئے۔

''معافی مجھ سے نہیں نازی سے مانگو۔'' شی نے بے پروائی سے کہا اور چائے کی پیالی منہ سے لگا لی۔

''پلیز نازی! معاف کر دو' بڑی غلطی ہوئی۔'' اس کی نیلی آنکھوں میں شرمندگی کا تاثر واضح تھا۔

''اس میں معافی مانگنے کی کیا بات ہے۔'' میں نے بوکھلا کر کہا تو شی نے مجھے گھورا۔

''اسی وی آئی پی سلوک کی وجہ سے لڑکے سر چڑھتے ہیں۔ گھر میں 'باہر' ان سے جو امتیازی سلوک ہوتا ہے اس نے ان کے دماغ آسمان پر چڑھا دیئے ہیں۔''

''ٹھیک ہے میں نے معاف کیا۔'' میں شی کی باتیں سن کر مزید بوکھلا اٹھی۔

یونہی آہستہ آہستہ بہت غیر محسوس طریقے سے میں شی کے گروپ میں شامل ہو گئی۔

میرے اندر کی لڑکی شی کی شخصیت کی برتری دیکھتے ہوئے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتی تھی۔

جبکہ باہر کی لڑکی ہر چیز میں اس کو کاپی کرنا چاہتی تھی۔ شی کو کاپی کرنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔

کیونکہ مجھے اندرونِ شہر کی گلیوں سے چادر میں ملبوس ہو کر نکلنا پڑتا تھا اور اربن ٹرانسپورٹ کی بس میں کبھی بیٹھ کر اور کبھی لٹک کر سفر کرنا پڑتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں کبھی پیسے ہونے کے باوجود بھی اس کی طرح ٹراؤزر اور دھوتی یا کاؤل شلوار نہیں پہن سکتی تھی لیکن حیرت تھی کہ شی نے اور لوگوں کی طرح محض میرے فیملی بیک گراؤنڈ کی وجہ سے مجھے ریجیکٹ نہ کیا۔ باقی کلاس فیلوز کی میرے ساتھ محض رسمی بات چیت بھی نہ تھی۔

''سب علم کتابوں سے نہیں ملتا۔ علم حاصل کرنے کے لیے لوگوں سے ملو۔ خاص طور سے سوشیالوجی کا علم کتابی نہیں ہے۔ تم کیوں ہر وقت ایک کونے میں گھسی کتابیں چاٹتی رہتی ہو۔'' شی نے ہمیشہ کی طرح اس دن بھی مجھے لائبریری میں پکڑا۔

''سر شجاعت کی اسائنمنٹ کے لیے پوائنٹ اکٹھے کر رہی تھی۔'' میں نے کتاب بند کرتے ہوئے جواب دیا۔

''اوہ خدایا!'' اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ''اسائنمنٹ ہسپتال اور مریضوں کے متعلق ہے اور تم کتاب کھول کر بیٹھی ہو۔ سروسز یا میو ہسپتال جاؤ' پرائیویٹ کلینکس میں جاؤ۔ تم اس کتاب سے یورپ کے ہسپتالوں اور مریضوں کے مسائل جان سکتی ہو۔ پاکستان کے نہیں۔ یہاں کے مریضوں کے اپنے مسائل ہیں۔''

''یہاں رہنے والے ہر شخص کے اپنے مسائل ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میرا مسئلہ یہ ہے کہ نہ تو اندرونِ شہر سے اور نہ ہی یہاں سے کوئی بس ان ہسپتالوں کو جاتی ہے۔ رکشہ میں افورڈ کر نہیں سکتی۔''

''گاڈ! مجھے اس کا خیال کیوں نہ آیا۔ تم کتابیں سمیٹو میں بھی ابھی تک کسی ہسپتال میں نہیں گئی۔ دونوں اکٹھے چلتے ہیں واپسی میں تمہیں تمہارے گھر ڈراپ کر دوں گی۔''

ہسپتال اور کلینکس میں شی کی توجہ کا مرکز زیادہ تر خواتین رہیں۔ وہ بات بات پر جھنجھلاتی تھی۔ خاص طور پر اسے خالہ بشیراں پر بہت غصہ آیا۔ دور سے میری نظر خالہ بشیراں پر پڑی تو

میں کنی کترا کے اس لیے نہ گزر سکی کہ انہوں نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ مجبوراً مجھے شی کو لے کر خالہ بشیراں کے پاس جانا پڑا۔ وہ ہمارے پڑوس میں ہی رہتی تھیں اور اس نسبت سے ہم ان کو خالہ کہتے تھے۔

''خالہ جی اب طبیعت کیسی ہے؟'' میں نے انہیں سلام کر کے پوچھا۔

''ہائے ہائے' طبیعت کیسی ہونی ہے' اب تو چھ نامرادیں ہوگئی ہیں' حمیدہ کا باپ تو مجھے مار ڈالے گا۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہیں؟'' شی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''اب ان کے ہاں چھٹی بیٹی پیدا ہوئی ہے۔'' میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

''کیا؟'' شی نے میری طرف بے یقینی سے دیکھا۔

''ہاں میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔''

''خالہ آپ کی صحت اچھی نہیں' آپ کے بچے بھی صحت مند نہیں ہیں۔'' شی نے پاس بیٹھی بچیوں کی طرف اشارہ کیا۔ اس سے پہلے کہ اس کی بات ختم ہو' خالہ بول پڑیں۔

''صحتیں تو پیسے والوں کی ٹھیک ہوتی ہیں۔ ہم غریب جنہیں کبھی گوشت دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوا' ہماری صحتیں کیسے ٹھیک رہ سکتی ہیں۔''

''خالہ! آپ نہ تو اتنے بچوں کی پرورش کر سکتی ہیں اور نہ ہی انہیں صحیح تعلیم دے سکتی ہیں۔ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ بچے کم ہوتے ان کی تعلیم' زندگی کا معیار سب کچھ بہتر ہوتا۔''

''بچے تو اللہ تعالیٰ کی دین ہوتے ہیں۔ لڑکیاں تو خیر بہشتی زیور پڑھ لیں گی' بیٹے کو تو میں اپنا پیٹ کاٹ کر بھی پڑھانا پڑا تو پڑھاؤں گی۔'' وہ کہہ رہی تھیں۔ ''ویسے حمید کے باپ کی خواہش ہے کہ اس کے تین بیٹے ہوں۔ ایک تو خدا تعالیٰ نے دیا ہے' باقی دو بھی وہ دے دے گا۔ ویسے اگر یہ چھ نامرادیں نہ ہوتیں تین بیٹے ہی ہوتے تو اور کچھ نہیں چاہیے تھا۔''

خالہ کی یہ بات شی کے لیے انتہائی حیران کن تھی۔ وہ تقریباً جھنجھلا کر بولی۔

''اس حساب سے ابھی دو بیٹے رہتے ہیں اور ان دو کی خواہش میں چھ بیٹیاں آ چکی ہیں ابھی نہ جانے کتنی آنی رہتی ہیں۔ خالہ تم ان بچوں کو تعلیم نہیں دے سکتیں' کھلا پلا نہیں سکتیں تو انہیں اس دنیا میں لانا سراسر ظلم اور زیادتی ہے۔''

''اے لو سنو' بچے تو خدا تعالیٰ کی دین ہیں۔''

اس سے پہلے کہ خالہ اپنی بات مکمل کرتیں شی ان کے ساتھ مزید بحث میں الجھ جاتی۔ میں نے وہاں سے کھسک جانا ہی مناسب سمجھا اور شی کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے کھٹ سے خالہ کو سلام کر کے باہر نکل آئی۔

''یہ تمہیں نکلنے کی جلدی کیوں تھی' مجھے انہیں سمجھا تو لینے دیتیں۔''

''یہ وہ مخلوق نہیں ہے جو اتنی آسانی سے بات سمجھ سکے تمہاری باتوں سے صرف اتنا فرق پڑتا کہ خالہ جو اب تک بچیوں کو کم از کم بہشتی زیور پڑھانے کا ارادہ رکھتی ہیں' وہ بھی اب ترک کر دیتیں۔''

''انہیں خود خیال نہیں ہے اس بات کا کہ ان کی بچیوں کے بھی کچھ حقوق ہیں' کتنا تضاد تھا ان کی باتوں میں۔'' اس نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''جس طبقے میں خالہ بشیراں یا میں رہتے ہیں وہاں ہماری پرورش کرتے ہوئے یہ بات واضح طور پر بتا دی جاتی ہے کہ یہ گھر ہمارا عارضی ٹھکانہ ہے۔ شوہر کا گھر اور اس کی جوتیاں سیدھی کرنا ہمارا صحیح مقام ہے۔''

''اور لڑکی کی (Self Respect) عزتِ نفس؟''

''چودہ سو سال قبل لڑکی مار دی جاتی تھی اور اب پیدائش کے وقت اس کی Self Respect (عزتِ نفس) مار دی جاتی ہے۔''

''ظاہر ہے جہاں لڑکی کا استقبال اس طرح ہو جیسے خالہ بشیراں کے ہاں ہوتا ہے۔ وہاں عزتِ نفس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک بات بتاؤ نازی! ہمارے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی تو صرف بیٹیاں ہی تھیں اور انہیں بیٹیوں سے اس قدر محبت تھی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کو آپ سے کوئی کام ہوتا تو وہ حضرت فاطمہؓ کے ذریعے اپنا مدعا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتے کیونکہ انہیں علم تھا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پیاری بیٹی کی بات کبھی رد نہیں کرتے۔ یہ لوگ یہ سب باتیں پڑھتے ہیں' ان پر ایمان رکھتے ہیں' پھر بھی اپنی بیٹیوں کی پرورش ایسے کیوں نہیں کرتے؟''

''تمہاری طرح ان باتوں کا میرے پاس بھی کوئی جواب نہیں۔ ان لوگوں کے پاس بھی ان باتوں کا جواب نہیں جن کی زندگی ان تضادات کا شکار ہے۔'' میں نے کہا۔

باقی راستہ ہم نے خاموشی سے طے کیا۔ میں جانتی تھی کہ شی کا دماغ ابھی تک عورتوں اور

ان کے مسائل میں الجھا ہوا ہے۔ میں نے آج اس تیز طرار اور بے حد بولڈ اور مضبوط لڑکی کا نازک سا دل دیکھا تھا جو لوگوں کے دکھ درد کو محسوس کر سکتا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات اور ڈرائیونگ کا انداز بھی اس کی سوچ کی عکاسی کر رہا تھا۔

''آگے سے راستہ بتاؤ۔'' اس نے مجھ سے کہا۔

میں اسے راستہ بتاتی گئی۔ گھر کے سامنے کار روک کر وہ بولی۔

''ایک کپ چائے مل سکے گی؟''

میں نے بادلِ ناخواستہ اثبات میں سر ہلا دیا۔ اسے گھر کے اندر لے جانے کا مطلب یہ تھا کہ اماں کو یونیورسٹی کی برائیاں کرنے کا ایک اور موقع دینا۔ انہوں نے یونیورسٹی کی لڑکیوں کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اب شی کو اندر لے جانے سے ان باتوں پر مہر تصدیق ثبت ہو جاتی مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ محلے کے بچے باہر کھڑی کار کا شیشہ نہ توڑ دیں لیکن ظاہر ہے میں انکار بھی نہ کر سکتی تھی۔

میرے ساتھ ایک اجنبی لڑکی کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر اماں کا موڈ بگڑا۔ وجہ یہ نہ تھی کہ لڑکی اجنبی تھی بلکہ اصل وجہ وہ لباس تھا جو شی نے زیب تن کر رکھا تھا۔ سبز رنگ کی...... لنگی شلوار پر سرخ رنگ کی قمیص اور انہی دو رنگوں کے امتزاج سے بنا ہوا کھلا سا سویٹر جس نے اس کے جسم کے خطوط کو مکمل طور پر چھپا رکھا تھا۔ دوپٹے سے بے نیاز سبز نیٹ کے ربن سے اسٹیپ میں کٹے بالوں کو بے پروائی سے باندھ کر وہ آسمانی حوروں کی طرح حسین لگ رہی تھی۔ اسٹیپ میں کٹے ہونے کی وجہ سے اس کے کچھ بال پیشانی پر جھول رہے تھے اور کچھ ربن کی قید سے آزاد ہوا میں لہرا رہے تھے بے ترتیبی میں بھی نفاست تھی۔ بھرے بھرے ہونٹوں پر کور گرل کی خوبصورت سرخ لپ اسٹک اور پہلے سے ہائی چیک بونز کو اور زیادہ نمایاں کرنے والا سرخ بلش آن۔ خوابناک براؤن رنگ کی آنکھوں پر نفاست سے کیا گیا میک اپ اور ناک میں ہیرے کی چمکتی ہوئی نازک سی لونگ۔ کچھ لوگوں کو خدا تعالیٰ بہت بھرپور حسن دیتا ہے اور وہ اس کی اس عنایت کی ناشکری نہیں کرتے بلکہ اسے بنانے سنوارنے میں بہت محنت کرتے ہیں۔ شی انہی لوگوں میں سے ایک تھی۔

''اسلام علیکم خالہ جان!''

''وعلیکم'' اماں نے شی کو ایسے جواب دیا جیسے لٹھ مار رہی ہوں اور منہ پھیر کر کمرے میں

چلی گئیں۔

میں اسے اپنے کمرے میں لے آئی اور اماں کے رویئے سے اس کا دھیان ہٹانے کے لیے کوئی موضوع سوچنے لگی جو بات کا رخ بدل سکے۔ میری شرمندگی چہرے پہ لکھی تھی۔ اس سے پہلے میں کچھ کہتی شی بول اٹھی۔

''میں نے مائنڈ نہیں کیا۔ تمہیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''یہ لڑکی دل کے بھید کیسے جان لیتی ہے۔'' میں نے حیرانی سے دیکھا۔

''نازی! تمہاری آنکھیں سب کچھ کہہ دیتی ہیں۔ وہ کچھ بھی جو تم زبان پر نہیں لاتیں۔'' اس نے کہا۔ ''میں جانتی ہوں کہ تمہاری ممی کی بات بھی اپنی جگہ درست ہے اور میں بھی اپنی جگہ غلط نہیں۔ انہوں نے محسوس کیا ہوگا کہ اسٹوڈنٹ ہو کر میں نے میک اپ کر رکھا ہے یا میرا لباس جدید ہے اور میں نے دوپٹہ بھی نہیں اوڑھا ہوا۔'' وہ سانس لینے کو رکی پھر بولی۔ ''جبکہ میرا خیال ہے کہ نہ تو جدید لباس پہننا برا ہے اور نہ ہی میک اپ کرنا۔ یہ تو جمالیاتی ذوق کی نشانی ہے۔''

''ہمارے ہاں جمالیاتی ذوق کی اہمیت نہیں ہے۔'' میں بولی۔ ''یہاں چارلس ڈکنز کے Hard Times کی طرح ہر چیز حقیقت ہے۔ یہاں نہ تو صندلی ہاتھ کی دھندلی سی حنا کی تحریر پڑھنے کے لیے کسی کے پاس وقت ہے اور نہ ہی کسی کی زلفوں کی موہوم گھنی چھاؤں میں ٹمٹماتا ہوا آویزہ دیکھنے کی فرصت۔ جہاں رات کو سوتے وقت لوگوں کو یہ علم نہ ہو کہ صبح کچھ کھانے کو ملے گا یا نہیں۔ وہاں کسی کو جمالیاتی ذوق کا کیا علم ہوگا۔''

''میں نے کہا ناں کہ تم بھی ٹھیک ہو' میں بھی غلط نہیں۔'' شی نے جواب دیا۔ ''اگر تمہاری ممی نے بہتر حالات دیکھے ہوتے تو ان کے نظریات شاید مختلف ہوتے۔ وہ چیزیں جو آج انہیں بری یا معیوب لگتی ہیں۔ کسی دوسرے حالات میں' شاید اتنی بری نہ لگتیں۔ یہ بالکل وہی بات ہے کہ برقعے والی' چادر پہن کر نکلنے والی کو برا سمجھتی ہے' چادر والی دوپٹے والی کو برا کہتی ہے اور دوپٹے والی اسے جو دوپٹے سے بے نیاز ہے۔ اس کے باوجود اپنے نظریات کے مطابق سب ہی اپنے آپ کو درست سمجھتے ہیں۔''

اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتی وہ پھر گویا ہوئی۔ ''تم اتنی خوبصورت ہو نازی مگر تمہیں اس کا احساس نہیں ہے۔ خوبصورت دراز بال' جھیل جیسی آنکھیں' لانبی لانبی پلکیں اور گلابی

لب، تم اپنا خیال کیوں نہیں رکھتیں؟"

یہ سب اتنا اچانک تھا کہ میں حیران رہ گئی۔ "شاید تم نے میری تعریف میں کچھ زیادہ ہی لفاظی سے کام لیا ہے۔"

"یہ میری بات کا جواب نہیں۔"

"شی، شاید تمہیں علم نہیں کہ میں وظیفہ لے کر پڑھ رہی ہوں۔ میں نینا رچی یا کور گرل کے کاسمیٹکس افورڈ نہیں کر سکتی۔"

"کون کہتا ہے کہ تم نینا رچی اور کور گرل کے کاسمیٹکس استعمال کرو۔" اس نے کہا۔ "تم جو روز سیدھی چٹیا کر کے آتی ہو اس اسٹائل کو تھوڑا سا تبدیل کر دو۔ کبھی کبھار مسکرا دیا کرو۔ آنکھوں میں کاجل لگا لیا کرو۔ اس پر کون سے پیسے خرچ ہوتے ہیں۔"

"مسکرانا اتنا آسان نہیں ہوتا شی! اماں بال نہیں کھولنے دیتیں اس لیے فی الحال سیدھی چٹیا پر ہی گزارا کرنا پڑے گا۔"

"تم عام چٹیا کے بجائے کسی اور اسٹائل کی چٹیا کر سکتی ہو۔ کرنے کو تم بہت کچھ کر سکتی ہو اگر چاہو تو۔"

میں چپ رہی۔

"خیر اب جو ویلکم ہو رہی ہے، اس میں تم ذرا بہتر حلیے میں آنا۔ چاہے ایسے ہی کرو لیکن چٹیا تھوڑی ڈھیلی کرنا اور آنکھوں میں کاجل بھی لگا لینا۔"

ابھی بات ہو ہی رہی تھی کہ یاسمین باجی چائے کی ٹرے لے کر اندر داخل ہوئیں اور یہ گفتگو ختم ہو گئی۔ اس کے بعد رسمی قسم کی گفتگو ہوئی اور تھوڑی دیر بعد شی چلی گئی۔ جانے کو تو وہ چلی گئی لیکن میرے لیے سوچ کے نئے بھنور چھوڑ گئی۔ اماں اس دن سخت غصے میں مجھے ڈانٹتی رہیں۔

"اری یہی ہوتے ہیں یونیورسٹی والوں کے لچھن، خدا کی پناہ اتنی امیر لڑکی کو گز بھر کا دوپٹہ بھی نصیب نہیں اور دیکھا تھا منہ پر کیا نقش و نگار بنا رکھے تھے، ارے نازو تو ایسی لڑکیوں کے ساتھ کیوں اٹھتی بیٹھتی ہے، یہ لڑکیاں ماں باپ کی عزت بیچ کر لڑکوں کے سامنے یونہی ننگے سر کھلے بال پھرتی رہتی ہیں۔ کیا عزت ہوتی ہے ان لڑکیوں کی۔"

اور جہاں اماں بس ہوئیں وہیں سے نوید شروع ہو گیا۔ نوید، میرا بھائی جو دسویں

جماعت کا امتحان دے کر کم نمبر آنے کے باعث کالج میں داخلے سے محروم رہا تھا۔

"دیکھو نازو باجی! میں کسی صورت برداشت نہیں کر سکتا کہ میری بہن ایک ایسی لڑکی کے ساتھ پھرے جس پر جگہ جگہ چلتے پھرتے لڑکے آوازے کسیں۔ تمہیں کیا پتا کہ آج لڑکوں کی اس لڑکی کو دیکھ کر کیا حالت ہوئی اور انہوں نے کیا باتیں کیں۔ ایک دل تو کرتا تھا کہ اس لڑکی کے ٹکڑے کر دوں۔ شرم اور حیا بھی بیچ کھاتی ہیں یہ لڑکیاں، ماں باپ کی عزت کا کوئی خیال نہیں۔"

میں چپ چاپ اپنے کمرے میں آ گئی کہ ایسی جگہ بولنے کا مطلب بھینس کے آگے بین بجانا تھا۔ مجھے شریفن چاچی کا خیال آیا۔ ان کی پانچویں پاس بیٹی اٹھارہ سالہ نوری برقع پہن کر اور چولہے کے آگے بیٹھ کر چھ لڑکوں سے نہایت کامیابی سے عشق لڑا رہی تھی اور نوری کا چھٹا امیدوار خود میرا بھائی تھا۔ میں جانتی تھی کہ آج یا کل وہ ان چھ میں سے کسی کے ساتھ تمام زیور اور کپڑا لے کر بھاگ کھڑی ہو گی۔ میں اماں کو کیا بتاتی کہ دوپٹہ نہ پہننے اور لڑکیوں کے ساتھ آزادانہ بات کرنے کے باوجود شی کسی بھی ایسے لڑکے کے جو اس کی طرف غلط نگاہ ڈالے، دانت توڑ سکتی تھی، لیکن اماں کو یہ سمجھانا بے کار تھا کہ جس طبقے سے شی کا تعلق تھا۔ وہاں کی لڑکیاں نوری کی طرح چھ عشق لڑا کر گھر سے نہیں بھاگتیں۔ یہی تو ہم تعلیم یافتہ لڑکیوں کا المیہ ہے کہ تعلیم کے نام کو بٹہ لگانا ہمیں گوارا نہیں۔ اچھائی اور برائی کے جو معیار ہم نے قائم کر رکھے ہیں وہ نہایت بودے ہیں لیکن یہ اماں کو کون بتاتا؟

طے یہ پایا تھا کہ شی مجھے اپنی کار پر بلٹن لے کر بھی جائے گی اور گھر بھی ڈراپ کرے گی۔ اس ویلکم پارٹی پر جانے کی اجازت کس قدر مشکل سے ملی تھی۔ وہ ایک الگ کہانی ہے۔ صرف ابا اس بات پر راضی تھے کہ شی مجھے لے بھی جائے اور چھوڑ بھی جائے۔ میری سفارش نورین اور پروین نے بھی کی تھی۔ خدا خدا کر کے ہفتے کا دن آیا۔ پارٹی کا ٹائم چھ بجے تھا لیکن شی نے مجھے ساڑھے چار بجے پک کرنا تھا۔ میں نے نیلے رنگ کا پرنٹڈ سوٹ پہنا تھا اور ڈھیلی سی چٹیا کی تھی۔ مقررہ وقت پر کار کا ہارن سنائی دیا اور میں اماں کی صلواتیں سننے سے قبل ہی لپک کر باہر نکل آئی۔ شی نے اپنی مخصوص مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا، میں بھی مسکرا دی۔

"اسی طرح ہنستی مسکراتی رہا کرو۔" وہ اگنیشن میں چابی گھماتی ہوئی بولی۔

"شکریہ۔"

"پہلے میری طرف چلو' کچھ کافی وغیرہ پی کر میں تیار ہو جاؤں' پھر ہوٹل چلیں گے۔"

اندرون شہر کی پیچ در پیچ سڑکوں سے نکل کر گاڑی گلبرگ تھری کی طرف رواں دواں تھی۔ گاڑی کے ڈیک سے استاد امانت علی کی آواز میں خوبصورت غزل کے بول ابھر رہے تھے۔ "عمر اک خلش کو حاصل عمر رواں رہنے دیا۔" میں اردگرد کے نظاروں میں گم تھی جب مین بلیوارڈ کے ایک بڑے سے مکان کے گیٹ پر پہنچ کر شی نے ہارن بجایا۔ دروازہ ایک باوردی چوکیدار نے کھولا۔ گاڑی لمبے سے ڈرائیو وے میں گھستی چلی گئی۔ کار کے کھلے شیشے سے لان میں لگے رنگ برنگے پھولوں کی مہک مجھ تک پہنچی تو مجھ پر بے خودی طاری ہو گئی۔

"آؤ" شی نے کار سے اترتے ہوئے مجھ سے کہا۔

میں اس کے پیچھے چلتی ہوئی ایک آراستہ کمرے میں داخل ہوئی۔

"پلیز بیٹھو۔" اس نے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور خود ڈیک میں حبیب ولی محمد کی کیسٹ لگا دی۔ تھوڑی دیر ادھر اُدھر کی باتیں ہوئیں اور کافی پی کر وہ تیار ہونے چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ ڈریسنگ روم سے باہر نکلی تو میری نگاہیں اس کے سراپے پر اٹک کر رہ گئیں۔ سیاہ سلک کی شلوار' سیاہ بڑے بڑے پولکا ڈاٹس کی پیلے رنگ کی قمیص جس پر تین خوبصورت چین نیکلس لگائے وہ اپنے حسن کی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ آج اس کے بال نیٹ کے ربن کی قید سے آزاد تھے۔ ڈائمنڈ کی خوشنما جیولری بار بار چمک کر اس کے حسن کو خراج تحسین پیش کر رہی تھی اور اس کے وجود سے اوپیم کی مسحور کن مہک اٹھ رہی تھی۔

میں ابھی اسے دم بخود کھڑی دیکھ رہی تھی کہ اس نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔

"نازی میرا خیال ہے تھوڑی سی لپ اسٹک لگا لو۔"

پھر میرے بار بار انکار کے باوجود اس نے میرا ہلکا سا میک اپ کر دیا۔ آئینے میں اپنی شکل دیکھ کر مجھے یقین ہی نہ آیا کہ میں وہی نازی ہوں۔

ہلٹن کے خورشید پیلس میں پارٹی کا انتظام کیا گیا تھا۔ میرے اور شی کے ہال میں قدم رکھتے ہی سب کی نظریں ہم پر پڑیں اور دیکھنے والی نظریں ہمارے سراپے سے ہٹنا بھول گئیں۔ یہ صورت حال میرے لیے پریشان کن تھی۔ اتنے ڈھیر سارے لوگ ہماری طرف دیکھ رہے تھے' میں گھبراہٹ میں پہلے ایک کرسی سے ٹکرائی' پھر چلتے چلتے میرا پیر مڑ گیا۔ دوسری

طرف شی بہت اعتماد سے اونچی ہیل کی ٹک ٹک کے ردھم پر اردگرد کھڑے کلاس فیلوز اور سینئرز کو وش کرتی ہوئی جا رہی تھی۔

وہیں پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ نوفل مجھ میں دلچسپی لے رہا ہے۔ یہ احساس پُرمسرت بھی تھا اور انوکھا بھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ آج میں اندرون شہر کی پُرتعفن فضا سے نکل کر ایک حسین باغ میں آ گئی ہوں جس کے چاروں طرف خوشبودار پھولوں کی مہک ہے۔ کھلتے پھول اور چٹکتی کلیاں ہیں۔ جہاں محبت ننھی ننھی بوندوں کی شکل میں مجھ پر پڑ رہی ہے اور میں ان بوندوں میں سدا بھیگتے رہنا چاہتی ہوں' آنکھیں بند کر لینا چاہتی ہوں تاکہ ماضی کو فراموش کر کے یہ لمحے قید کر لوں' پھر وقت آگے بڑھ گیا اور یہ خوبصورت لمحے تتلی کی طرح میرے ہاتھ سے نکل کر کہیں گم ہو گئے لیکن تتلی کے رنگ میرے ہاتھوں پہ رہ گئے۔

اپنی اس خود فراموشی میں میں یہ بھی محسوس نہ کر سکی کہ امریکہ سے پڑھ کر آنے والے پروفیسر احمد نقوی' جنہوں نے آج ہی یونیورسٹی جوائن کی تھی۔ شی کی زلف کے اسیر ہو گئے ہیں۔

سر نقوی بہت سوبر سے پروفیسر تھے۔ ہمارے گروپ کا ٹیوٹوریل انہی کے پاس تھا۔ اسی وجہ سے ہم سب ان سے بہت فری ہو گئے۔ دنیا کے ہر موضوع پر ہم ان کے ساتھ آزادانہ گفتگو کرتے تھے۔ بڑی طاقتیں اور مختلف ممالک کے ان کے ساتھ تعلقات' تیل کی قیمتیں' مختلف زبانوں کے ادب اور ہمارے ملک کے معاشرتی مسائل' ہر موضوع پر ان کا علم بہت وسیع تھا۔ اچھی کتابیں ان کی کمزوری تھیں' اور یہی وجہ تھی کہ اظفر اور شی سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔

☆======☆======☆

وقت یونہی رواں دواں تھا کہ میری زندگی میں بہت اہم واقعات رُونما ہوئے۔ ایک تو یہ کہ شریفن چاچی کی پانچویں پاس بیٹی نوری نے گھر سے بھاگنے کے لیے اپنے چھ عاشقوں میں سے میرے بھائی کا انتخاب کیا۔ ایک صبح جب ہم سو کر اٹھے تو ابا کی خون پسینے کی کمائی کی تھوڑی سی بچت کے ساتھ نوید بھی گھر سے غائب تھا۔ جوان بیٹے کا یوں گھر چھوڑ جانا اور ساتھ ہی پیٹ کاٹ کاٹ کر کی گئی بچت کا چلا جانا کوئی عام بات نہ تھی۔ اماں کو تو غش پہ غش آ رہے تھے۔ بمشکل تمام آمنہ کے جہیز کے لیے بنایا گیا زیور اپنا ہی بیٹا گھر میں ڈاکہ ڈال کر لے گیا۔

اماں کو اور تو کچھ نہ سوجھا' ہمیشہ کی طرح آمنہ آپا کو دو ہتھڑ مار مار کر صلواتیں سنانے لگیں۔

''اری نامراد تیری تو قسمت ہی خراب ہے' کب تک ماں باپ کے سینے پہ مونگ تلے گی۔ خدا اٹھا بھی تو نہیں لیتا ان کم بختوں کو۔ آگے کون سی رشتوں کی لائن لگی ہے اب جو یہ دو چوڑیاں اور بالیاں بھی چلی گئی ہیں تو کوئی چمار بھی نہیں آئے گا تجھے بیاہنے۔''

اور جب آمنہ آپا چپ چاپ کمرے میں چلی گئیں تو اماں شریفن چاچی کی بیٹی کے لتے لینے لگیں۔

''ہائے میرے معصوم سے بیٹے کو اس پھاپھا کٹنی نے ایسا ورغلایا کہ دنیا چھوڑ کر نکل گیا۔ یہ تعلیم یافتہ لڑکیوں کے ایسے ہی لچھن ہوتے ہیں اور اسے تو ماں نے بھی چھوٹ دی ہوئی تھی۔''

اور کچھ دن بعد جب ہم نے زیور اور پیسے پر فاتحہ پڑھ لی اور صبر شکر سے بیٹھ گئے تو ایک دن نوفل اپنی ممی کے ساتھ ہمارے گھر آ گیا۔ میرے تو ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے اماں اور ابا کیا سوچیں گے کہ میں یونیورسٹی میں عشق لڑانے گئی تھی اور اپنے لیے بَر ڈھونڈنا چاہتی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ آج نوید گھر میں ہوتا تو اس کا ردِعمل کیا ہوتا۔

نوید کا ردِعمل تو نہ جانے کیا ہوتا لیکن اماں اور ابا بہت خوش تھے۔ شاید عام حالات میں وہ اس قدر خوش نہ ہوتے لیکن سات میں سے ایک پہاڑ ہی کم ہو جائے تو بڑی بات ہے اور وہ بھی ایسے کہ جہیز کے نام پہ تنکے کا مطالبہ بھی نہ ہو۔ ویسے بھی ہمارے پاس ان کی ڈیفنس کی کئی کنال پر پھیلی ہوئی کوٹھی کے شایانِ شان کچھ بھی نہ تھا۔ ان کے گھر کا لان بھی ہمارے پورے گھر سے کئی گنا بڑا تھا۔ پھر بھی بیٹی والے ہونے کے ناتے کچھ رسمی سی تاخیر صلاح مشورے کے نام پر تو کرنی ہی تھی۔

اماں نے رات کو آ کر ہی مجھ سے کہہ دیا کہ اب یونیورسٹی جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

میں نے تھوڑا بہت احتجاج بھی کیا لیکن اماں کب کسی کی سنتی تھیں۔

''اب جائے گی تُو وہاں اری۔ اب تو وہ ایک طرح سے تیری سسرال ہے۔''

''پر اماں ابھی بات پکی نہیں ہوئی۔ پھر میں پڑھنا بھی چاہتی ہوں۔''

''اب جو نام لیا ناں تُو نے پڑھائی کا تو سب کتابیں جھونک دوں گی چولہے میں۔ تجھے وہاں کس چیز کی کمی ہو گی جو کتابوں میں سر پھوڑتی ہے۔ ارے تُو تو راج کرے گی اپنے گھر

میں رانیوں کی طرح۔ اکلوتا بیٹا ہے اپنے ماں باپ کا' کوئی جٹھانی' دیورانی کی چخ چخ بھی نہیں ہو گی۔''

یہ آخری باتیں اماں نے رازداری سے میرے کان کے قریب منہ کر کے کہیں۔ دیورانی' جٹھانی کی چخ چخ والی بات اس لیے اماں نے کی تھی کہ وہ خود اس سے نالاں تھیں اور بیٹی کو اس معاملے میں خوش قسمت سمجھ رہی تھیں۔ خیر اس تمام قصے کا نتیجہ یہ نکلا کہ میری تعلیم ادھوری رہ گئی۔

میری شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میں اس لیے بہت خوش تھی کہ گھر کے آئے دن کے لڑائی جھگڑے چھوڑ کر ایک پُرسکون ماحول میں جا رہی تھی۔ دوسری طرف نوفل کے قرب کا تصور بھی بہت حسین تھا۔ میں ہر وقت خوابوں میں کھوئی رہتی تھی۔ پاس ہونے والی ہلکی سی آہٹ سے بھی چونک اٹھتی۔ میرے لیے نوفل ایک عظیم شخص تھا۔ اسے مالدار لڑکیوں کی کمی نہ تھی۔ ایک سے ایک حسین اور مالدار لڑکی جہیز کے کئی ٹرکوں کے ساتھ اسے مل سکتی تھی' پھر بھی اس نے اندرون شہر کی' کلرک باپ کی بیٹی کو بغیر جہیز کے قبول کیا تھا۔ یہ اس کی عظمت ہی تو تھی۔

یونیورسٹی نہ جانے کی وجہ سے میں شی کو بھی اپنی شادی کی خبر خود نہ دے سکی۔ چند دن بعد وہ ہمارے گھر آئی ہمیشہ کی طرح مسکراتی ہوئی۔

''بہت مبارک ہو نازی! میں بتا نہیں سکتی کہ مجھے کس قدر خوشی ہوئی یہ خبر سن کر۔''

''شکریہ!'' میں نے شرماتے ہوئے کہا۔

''ویسے میں کافی دن سے نوفل کی میڑھی آنکھیں دیکھ رہی تھی۔''

''میڑھی آنکھیں؟''

''ہاں تم جہاں جاتی تھیں' وہیں دو آنکھیں تمہارا تعاقب کرتی تھیں۔''

میں جھینپ گئی۔

''ویلکم کے دن تو سب ہی نے محسوس کیا اور تمہاری ویلکم ہی تمہاری فیئر ویل (Fair well) بن گئی۔''

میں شرم سے ہلکی ہنسی ہنس دی۔

''ویسے نازی تمہیں تعلیم نہیں چھوڑنی چاہیے تھی۔''

"میں تو چاہتی تھی مگر اماں نے منع کر دیا۔" میں بولی۔ "اماں کہتی ہیں مجھے کون سی نوکری کرنی ہے پھر کتابوں میں آنکھیں پھوڑنے سے فائدہ؟"

"مائی گاڈ؟ پتا نہیں ہمیں کب ان نظریات سے چھٹکارا حاصل ہوگا۔ ان لوگوں کے نزدیک عورت کا واحد کام چولہا جلانا اور بچے پالنا ہے۔"

شی ایسے ہر معاملے میں جذباتی ہو جاتی تھی۔ "اس کی ذات اور اس میں موجود ٹیلنٹ...... انہی چولہوں میں جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔ اصل میں نازی یہ لوگ ڈرتے ہیں کہ اگر لڑکیاں عملی میدان میں نکل کر اپنی ذہانت کے جھنڈے گاڑنے لگیں تو مردوں کو منہ چھپانے نہ جانے کس بل میں گھسنا پڑے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ ہر کوئی ایسا ہی ہوتا ہے۔ اکثریت ایسی ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورتوں کو گھروں میں بند کرنے کے لیے نت نئے بہانے تلاش کرتے ہیں لیکن اس سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ عورتوں کی بھی صدیوں سے ایسی برین واشنگ ہو چکی ہے کہ وہ اسے اپنی ذات پر ظلم نہیں سمجھتیں بلکہ اسے نارمل رویہ قرار دیتی ہیں۔"

"میرا خیال ہے تم ایسے ہر مسئلے کو زیادہ ہی سنجیدگی سے لیتی ہو۔"

"لینا چاہیے بھئی۔" اس نے کہا۔ "دیکھو نازی! اگر آج آمنہ آپا اور یاسمین باجی کو اس چولہے ہانڈی کے علاوہ بھی کچھ آتا تو وہ کم از کم اپنا بوجھ خود اٹھا سکتی تھیں۔ روز روز تمہاری اماں کے طعنے سننے سے تو یہ بہتر ہوتا۔"

میں جانتی تھی کہ شی ٹھیک کہہ رہی ہے۔ میری بہنیں ان طعنوں کی وجہ سے آہستہ آہستہ سینی ٹوریم کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ اماں جو روز روز دنیا سے ان کے اٹھ جانے کی دعائیں کرتی تھیں' جلد ہی اپنی سگھڑ بیٹیوں کو کھونے والی تھیں۔

"تم اپنی پڑھائی جاری رکھنے کی کوشش کرو اور کچھ نہیں تو بی ایڈ کر لو۔ مت کرو کہیں کام لیکن ایک ڈگری تمہیں اعتماد ضرور بخشے گی۔"

شی جا چکی تھی لیکن اس کی آخری بات میرے کانوں میں بار بار گونج رہی تھی۔ میں جانتی تھی کہ کلاس کی سب سے لائق لڑکی مجھے غلط مشورہ نہیں دے گی لیکن ساتھ ہی میں موجودہ صورتِ حال کو بھی خراب کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اسی لیے میں نے فیصلہ کیا کہ شادی کے بعد نوفل سے مزید پڑھائی کے لیے بات کروں گی۔ اس فیصلے کے بعد میں مطمئن ہو گئی۔ دن

تیزی سے گزرنے لگے اور آخر کار شادی کی رسموں کے دن آ گئے۔ مایوں' مہندی سب کچھ بہت دھوم دھام سے ہوا۔

"انہوں نے تو جہیز لینے سے صاف انکار کر دیا ہے لیکن ہم ایسے تو اپنی بیٹی کو رخصت نہیں کر سکتے ناں۔ آمنہ کے ابا تو اپنے سب ارمان نکالنا چاہتے ہیں۔ بڑی قسمت والی ہے میری بیٹی۔" اماں رشتہ داروں سے کہہ رہی تھیں۔

اماں کی یہ باتیں میرے دل کو کاٹ گئیں۔ چند دن پہلے کا منظر میری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ نوفل کی ممی ابا سے کہہ رہی تھیں۔

"بھائی صاحب! یہ ہم لوگ ہی ہیں جو محبت کے مارے یہاں آ جاتے ہیں ورنہ ہماری گاڑی تو اس اسٹریٹ میں داخل بھی نہیں ہو سکتی لیکن شادی پر صرف ہم ہی تو نہیں ہوں گے ناں۔ ہمارے حلقہ احباب میں گریڈ بیس سے کم کے افسر تو شامل ہی نہیں ہیں اور پھر بہت بڑے سیٹھ اور بزنس مین وغیرہ ہیں جن کی بیگمات ڈنر کرنے پیرس جاتی ہیں۔ میرا مطلب ہے' یہ ہماری ناک کا معاملہ ہے۔ ہم یہ بات تو دبا دیں گے کہ ہماری بہو کا باپ ایک معمولی کلرک ہے لیکن اس گندی جگہ' آپ میرا مطلب تو سمجھ ہی رہے ہوں گے میں جانتی ہوں کہ گلبرگ کے کسی شادی ہال کو بک کروانا آپ کی استطاعت سے باہر ہے۔ اس لیے میں یہ چیک دے رہی ہوں' آپ انتظام کر لیں۔"

اور میرے باپ کا پہلے سے جھکا ہوا سر مزید جھک گیا۔

مہندی پر بہت ہنگامہ رہا۔ میری تقریباً تمام کلاس نوفل کی طرف سے مدعو تھی لیکن اکٹھا ہونے پر دو گروپ بن گئے۔ لڑکیاں میری طرف کے گانے گا رہی تھیں اور لڑکے نوفل کی طرف کے' سب نے خوب لطف اٹھایا۔ شی سمیت سب لڑکیوں نے لڑکوں پر پیروڈی کے بہت سے گانے بنائے لیکن وہ بھی ایک ڈھیٹ واقع ہوئے تھے۔ الٹے سیدھے گانے بول کر بھی اپنی جگہ جمے ہوئے تھے۔

"تم لوگ ہار گئے ہو۔" لیلیٰ ناک چڑھا کر لڑکوں سے بولی۔ "اب بھاگو یہاں سے ہم ٹھیک طرح سے مہندی کے گانے گائیں۔"

"ایسے ہی ہار گئے ہیں۔" لڑکوں نے ہلہ بول دیا۔ "تم لوگوں کا کیا خیال ہے کہ ہم میدان تم لوگوں کے لیے چھوڑ دیں گے؟"

''توبہ! ڈھٹائی کی بھی انتہا ہے۔'' شازیہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگی۔

''ایسا کرتے ہیں کہ ٹپوں کا مقابلہ کر لیتے ہیں۔ خود ہی پتا چل جائے گا کہ کون جیتا اور کون ہارا۔'' شی جو مصالحت پر کبھی آمادہ نہ ہوتی تھی' آج شاید اچھے موڈ میں تھی کہ اس نے درمیان کی ترکیب نکالی۔

''یہ تم کہہ رہی ہو شی؟'' اظفر بھی اس کے مصالحت آمیز رویے پر حیران رہ گیا۔

''میرا خیال ہے کہ میں نے یہی کہا ہے۔ ہم اپنی جیت کو controversial (متنازعہ) کیوں بنائیں۔ سب کو گواہ بنا کے تم لوگوں کو ہرائیں گے۔ بیچ چوراہے میں تاکہ سب ڈھٹائی نکل جائے۔''

میں بھی حیران تھی کہ بھلا شی کیسے مصالحت پر آمادہ ہو گئی۔ اب پتا چلا کہ اس کا مقصد مصالحت ہرگز نہیں تھا بلکہ وہ متنازعہ قسم کی جیت کے بجائے صاف اور بھرپور جیت چاہتی تھی۔ وہ تھی بھی ایسی ہر دفعہ جیتتی تھی اور جیت بھی ایسی کہ کوئی اس کی جیت میں نہ شک کر سکتا تھا اور نہ ہی حصہ دار بن سکتا تھا۔

میں نے شی کی طرف دیکھا جو باقی لڑکیوں کے ساتھ مل کر ٹپوں کا پروگرام سیٹ کر رہی تھی۔ اس سے وہ دل میں اُتر جانے کی حد تک حسین لگ رہی تھی۔ ڈارک گرین حیدر آبادی سوٹ میں ملبوس' لمبے سے دوپٹے کو سنبھالتی ہوئی' بانہوں میں کانچ کی نازک چوڑیاں' خوبصورت لمبے ناخنوں پر وائن ریڈ کلر کی نیل پالش' خوبصورتی سے سیٹ کیے بال جو بار بار اس کی پیشانی کو چھو رہے تھے۔ کانوں میں جھولتے سونے کے آویزے اور Lawa Ashely کا نفاست سے کیا گیا میک اَپ۔ روز کی طرح وہ آج بھی سب سے منفرد دکھائی دے رہی تھی۔

ڈھولک کی تھاپ نے میرے خیالات کا سلسلہ منقطع کیا ورنہ شی کا حسن تو ایسا تھا کہ اس پر عمر بھر شاعری کی جا سکتی تھی۔

''ٹپیاں دی وے واری
میں کڑی لاہور شہر دی ٹپیاں توں تاں ہاری۔''

ٹپوں کا مقابلہ شروع ہو چکا تھا۔ دونوں طرف مقابلہ زوردار تھا اور بدیہہ ٹپے کہے جا رہے تھے اور سننے والے خاصے محظوظ ہو رہے تھے۔ میں نے آج سے قبل شی کو کبھی پنجابی

بولتے نہیں سنا تھا۔ بلکہ ہوتا یوں تھا کہ وہ انگریزی میں بات کرتی تھی اور میں اس کا جواب اردو میں دیتی۔ اب اس معاملے میں ہمارے درمیان کوئی حجاب نہیں تھا۔ وہ اپنا مافی الضمیر انگریزی میں بہتر طور پر بیان کر سکتی تھی اور اکثر اردو میں بات شروع کر کے بے خیالی میں انگریزی پر اُتر آتی۔ انگریزی لب و لہجے میں اس کا پنجابی بولنا مجھے بہت اچھا لگا۔

''باغے وچ آیا کرو۔ کنگھی شیشہ میں دیواں گی تسی ٹینڈ لشکایا کرو۔'' شی نے نادر پر چوٹ کی' وہ بیچارا سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

اس کے اس ٹپے پر ہر طرف قہقہے بکھر گئے' لڑکے مقررہ وقت تک جواب نہ دے سکے اور یوں لڑکیوں نے شور شرابہ کر کے اپنے جیتنے کا اعلان کر دیا اور لڑکوں کو میدان چھوڑنا ہی پڑا۔ لڑکیوں نے ''ہار گئے ہار گئے'' کا اتنا شور ڈالا کہ لڑکے اپنی صفائی بھی پیش نہ کر سکے۔ اس کے بعد لڑکیوں نے آزادانہ گانے گانے شروع کیے۔ ڈھولک کی تھاپ پہ مہندی کے گانے گائے گئے اور سکھیوں کے انہی گیتوں کے دوران میرے ہاتھ پہ مہندی سے بیل بُوٹے بناتے ہوئے صبا نے نوفل کا نام بھی لکھ دیا۔ مجھے ایک دم اپنائیت کا احساس ہونے لگا یوں جیسے میں نوفل کے لیے اور وہ میرے لیے بنا ہے۔ ایسا لگا کہ خدا تعالیٰ نے دنیا جہان کی سب خوشیاں میری جھولی میں ڈال دی ہیں۔

پھر اگلے دن جب میں فِگر ہیڈ سے دلہن بن کر ہلٹن پہنچی تو مجھے خود بھی اپنی خوبصورتی کا احساس ہو چکا تھا لڑکیوں کو دلہن دیکھنے اور اس کے کپڑوں گہنوں پر بحث کرنے کا بہت شوق ہوتا ہے اور ایسے میں عموماً دیکھا گیا ہے کہ بہت تعریف کرنے کے بعد ایک لفظ ''لیکن'' لگا کر پہلے کی گئی تعریف پر بالکل پانی پھیر دیا جاتا ہے۔

''اللہ نوفل بھائی کی دلہن کتنی کیوٹ ہے۔'' بارات میں آنے والی ایک لڑکی نے کہا۔

''ہاں بہت کیوٹ ہے۔ ناک دیکھی کتنی خوبصورت ہے اور لونگ میں آٹھ ہیرے ہیں۔ کیوں آنٹی؟'' اس نے مسز عزیز سے تصدیق چاہی۔

''ہاں بھئی۔'' آنٹی نے ایک آہ سرد بھری۔ ''لیکن سنا ہے کہ باپ کلرک ہے اور یہ لوگ رہتے بھی اندرون شہر ہیں۔''

''اوہ سو سیڈ۔'' اسی لڑکی نے افسوس کیا۔ ''انہیں ضرورت کیا تھی اندرون شہر رہنے والے کلرک کی بیٹی لائیں۔ مجھے تو کوئی چکر لگتا ہے۔''

"What do mean by" اندرون شہر and کلرک۔'' شی جو پاس بیٹھی یہ سب بحث سن رہی تھی گویا پھٹ پڑی۔''اندرون شہر میں کیا انسان نہیں رہتے یا کلرک جانور ہوتے ہیں۔اپنے کمپلیکس کی یوں تشہیر نہ کریں۔''

''مجھے کیا کمی ہے کہ مجھے کمپلیکس ہو۔'' مسز عزیز کو بھی غصہ آ گیا۔''خدا کے فضل سے عاشی کے ڈیڈی گریڈ اُنیس میں ہیں۔''

''جی ہاں اور جیسے جوڑ توڑ کے وہ ماہر ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جلد ہی وہ گریڈ بائیس میں چلے جائیں گے۔'' شی کب چپ ہونے والی تھی۔''رہ گئی بات کمپلیکس کی تو آپ کو یہ کمپلیکس ہے کہ ایک کلرک کی اندرون شہر رہنے والی بیٹی کلب روڈ پر رہنے والے گریڈ اکیس کے افسر کی بیٹی سے بازی لے گئی ہے۔''

تھوڑی دیر کے لیے تو آنٹی گنگ ہو کر رہ گئیں۔بھری محفل میں ان کی اچھی خاصی بے عزتی ہو گئی تھی۔

''لڑکی ہوش میں رہ کر بات کرو۔'' غصے کے مارے ان سے صحیح طرح بات بھی نہیں کی جا رہی تھی۔

''میں بقائمی ہوش و حواس ہوں اور اپنی فرینڈ کے پاس جا رہی ہوں۔'' شی ان کی بات کاٹ کر تیزی سے بولی۔''دوسری بات یہ کہ اسے محض میری بات نہ سمجھیں۔یہ آئینہ ہے جس میں ہر کوئی اپنی صورت دیکھ سکتا ہے۔''

یہ کہہ کر شی میرے پاس آ گئی۔

''تم نے ایسا کیوں کیا؟'' میں نے سر جھکائے ہوئے سرگوشی کی۔

''جو لوگ اپنی اوقات بھول کر دوسروں پر بات کرتے ہیں ان کے ساتھ میں اس سے زیادہ برا کرتی ہوں۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔''رشوتیں لے کر اگر ان کے شوہر کلب روڈ تک پہنچ گئے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ پیسے کے بل پر یہ عزت دار ہو گئے ہیں۔عزت دار تم اور تمہارے ڈیڈی ہیں۔جنہوں نے آج تک کبھی حرام نہیں کھایا اور کبھی دستِ سوال دراز نہیں کیا۔''

وہ یہ باتیں کر رہی تھی اور دوسری طرف آنٹی اس کے متعلق ہر ممکنہ طور پر ہرزہ سرائی کر رہی تھیں۔''زبان دیکھی ہے گز بھر کی۔میری بیٹیوں کو کوئی کمی ہے۔خود کو سمجھتی ہے پرستان کی

شہزادی۔جس کو دیکھو چار پیسے جمع ہو جائیں اور دو لفظ انگریزی آ جائیں وہ آ کر شرفا کی عزت پر ہاتھ ڈالنے لگتا ہے۔''

میری معلومات کے مطابق شی کا گھرانہ جدی پشتی امیر تھا۔وہ نو دولتیے نہیں تھے لیکن آنٹی کو بات تو کرنی تھی۔خیر ان کا کیا تھا۔انہوں نے تو اپنے گھرانے کو بھی شرفاء کی فہرست میں شامل کر لیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد نوفل کو میرے ساتھ بٹھا دیا گیا۔قرب کے یہ لمحات بہت دلکش تھے۔ رسمیں شروع ہوئیں۔میری بہنیں اتنے لوگوں کی موجودگی میں بالکل چھوئی موئی بنی ہوئی تھیں اس لیے سب رسموں کی ادائیگی میری کلاس فیلوز نے کی۔شی نے سب رسموں میں بھرپور حصہ لیا اور نوفل سے خوب پیسے بٹورے۔آرسی مصحف کے لیے اس نے اپنے بیگ سے ایک چھوٹا سا میک اَپ مرر نکالا۔

''یہ ٹھیک رہے گا۔'' اس نے مرر ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔

''یہ اتنا سا؟'' آئینہ دیکھ کر نوفل کا موڈ آف ہو گیا۔''اس میں کیا نظر آئے گا۔کچھ تو میرے حال پر رحم کرو۔''

''تمہاری ناک اس میں سما جائے گی۔'' شی نے ہنستے ہوئے کہا۔

اور یونہی ہنستے بولتے یہ سب تقریبات ختم ہو گئیں۔آخر رخصتی کا وقت آیا۔آنسو میری پلکوں کی چلمنوں سے نکلنے کو بے تاب تھے۔میں اپنے بابل کا گھر چھوڑ رہی تھی ان کی دعاؤں اور آنسوؤں کے بیچ۔آج مجھے اپنا بھائی نوید بھی بے طرح یاد آ رہا تھا۔نہ جانے وہ کہاں تھا اور زندگی اسے کیسے برت رہی تھی؟ مجھے بڑی بہنوں کا دکھ تھا۔وقت ان کا تھا لیکن باری میری آ گئی۔انہیں مجھ پر رشک بھی آتا تھا اور ان کی آنکھوں میں مسرت بھی تھی۔غربت اور گھر کے ماحول نے انہیں وقت سے پہلے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ان کی بہت سی خواہشیں تھیں جن کے اظہار کا انہیں حوصلہ ہی نہ تھا۔ابا تھے۔ان کا رعب اور دبدبہ ہم سب پر تھا۔پر آج انہوں نے نم آنکھوں سے میری طرف دیکھا تو میرے ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ گئے آنسو جن پر میں نے بند باندھ رکھے تھے اچانک پلکوں کی قید سے آزاد ہو گئے۔

''بیٹی...... اب وہی تمہارا گھر ہے۔اپنے سسرال والوں کی خدمت کر کے ہی تم ان کا دل جیت سکتی ہو۔ہم پر ان کے بہت احسان ہیں۔یاد رکھو...... وہاں جانا تمہارے اختیار میں

تھا لیکن آنا تمہارے اختیار میں نہیں۔ مجھے یقین ہے جیسے تم فرمانبردار بیٹی ہو ویسی ہی بہو اور بیوی بھی ثابت ہوگی۔ جاؤ اللہ تمہارا نگہبان ہو۔''

یوں بابل کی دہلیز چھوڑ کر۔ جب میں نے ساس کی دہلیز پر قدم رکھا تو میرا سر احسانوں کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ ساس کی دہلیز میں نے اس لیے کہا کہ ابھی نوفل اپنے والدین کے ساتھ ہی تھا۔ خود کماتا نہیں تھا اور گھر میں عنانِ حکومت مکمل طور پر میری ساس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ بڑی طرح دار خاتون تھیں۔ ان کے ''ہاں'' اور ''نہیں'' کہنے کا ایک خاص انداز تھا جس کے بعد بولنے کی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔

رخصتی کے بعد مرسیڈیز میں بیٹھ کر میں لاہور کینٹ کے پوش علاقے ڈیفنس میں پہنچی۔ کار چھ کنال پر پھیلی ہوئی خوبصورت عربیک اسٹائل کی کوٹھی میں پہنچی۔ میرے خوابوں اور ارمانوں کی حسین تعبیر...... میں اکثر اپنے خوابوں میں اسی طرح کی لمبی سی چمکتی دمکتی کار اور بڑی سی کوٹھی دیکھا کرتی تھی کہ خوابوں پر تو کوئی پابندی نہیں ہے ناں۔ اور آج میری آنکھوں نے اس خواب کی تعبیر بھی پالی۔

مجھے نوفل کے آراستہ پیراستہ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ کافی دیر لڑکیاں گیت گاتی رہیں۔ تھوڑی دیر بعد جب تنہائی ملی تو میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ Autumn White رنگ سے سجا ہوا کمرہ...... ہلکی مدھم سی روشنی اور بے حد رومانی ماحول کتنا اچھا لگ رہا تھا یہ سب کچھ...... اور تھوڑی دیر بعد دروازے کے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میرا دل دھڑک اٹھا اور چہرے پر قوسِ وقزح کے تمام رنگ بکھر گئے۔ دروازہ کھلنے کی آواز سن کر میں مزید اپنے آپ میں سمٹ گئی۔

ان کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں

تعریف تو آج سب نے ہی میری کی تھی' لیکن اتنا انوکھا' اچھوتا اور دل موہ لینے والا انداز کسی کا بھی نہیں تھا اور پھر یوں ہوا کہ ہر دن عید اور رات شب برات ہوگئی۔ ہنی مون کے لیے ہم نے یورپ کا انتخاب کیا۔ ایک مہینے کے اس عرصے میں ہم خوب گھومے پھرے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کاتبِ تقدیر نے مجھ سے ابتدائی زندگی میں جتنے امتحان لیے تھے میں ان سب میں کامیاب ہوگئی تھی۔ جبھی تو یہ سب مہربانیاں تھیں' انعام تھے' ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ

ڈالے دور تک سیر کرتے۔

ایسے ہی ایک دن نیپلز میں نوفل کے سنگ چلتے چلتے میں نے کہا۔ ''ادھر کے گلاب کتنے خوبصورت ہیں۔''

''ہاں! یہاں کے گلاب اپنی مہک اور خوبصورتی کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہیں اور لوگ انہیں محبت کی نشانی کے طور پر اپنے چاہنے والوں کو پیش کرتے ہیں۔'' نوفل بولا۔

''تمہیں بہت خوبصورت لگے یہ گلاب؟''

''ہاں...... بہت خوبصورت۔'' میں نے اقرار کیا۔

''آؤ مل کر چنتے ہیں۔'' نوفل نے میرا ہاتھ تھام کر کہا اور پھر ہم نے ڈھیر سارے گلاب چن لیے۔ اپنی محبت کی نشانی کے طور پر میں نے ان کا گلدستہ بنا کر نوفل کو تھما دیا۔

ہم سب جگہ گھومے پھرے۔ فن لینڈ کی جھیلوں کے کنارے ہم نے جی بھر کر سیر کی۔ جرمنی کے بلیک فارسٹ کے ہر گوشے کو دیکھا۔ زیورچ کے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کافی پی اور پاکستان واپسی سے ایک دن قبل نوفل نے مجھے یادگار کے طور پر پیرس سے ہیروں کا سیٹ لے کر دیا۔

اس ایک مہینے کے عرصے میں مجھے نوفل کو کافی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس کی چند باتوں سے مجھے کافی الجھن محسوس ہوئی۔ وہ غصے کا بہت تیز تھا اور مطلق العنانی بھی ممی جیسی ہی پائی تھی۔ اس کے نزدیک دنیا میں عزت و مرتبہ پیسے کا مرہونِ منت تھا۔ غریب لوگوں سے وہ سخت الرجک تھا۔ اس کا سب سے بڑا نصب العین پیسے کو بڑھانا اور اسے پھلتا پھولتا دیکھ کر خوش ہونا تھا۔ یہ بات محسوس کر کے ایک دن میں نے نوفل سے کہا۔

''نوفل! تمہیں غریبوں سے نفرت ہے' پھر تم نے شادی کے لیے میرا انتخاب کیوں کیا؟''

''تم غریب تو نہیں ہو۔''

''میں سمجھی نہیں' اپنے اور میرے اسٹیٹس کا فرق تو تم بھی جانتے ہو۔''

''تم حسن کی دولت سے مالا مال ہو نازی۔ میں تمہارے سرخ و سپید رخساروں کو مرجھانے سے بچانا چاہتا تھا۔ تمہاری خوبصورت گہری آنکھوں کی چمک مجھے مسحور کرتی تھی۔ تمہارے بھرے بھرے ہونٹوں کے گلاب اور لانبی سیاہ زلفیں مجھے اپنے وجود کو جکڑتی ہوئی

محسوس ہوتی تھیں۔"

مجھے شدید ذہنی دھچکا لگا۔ کیا میری پسندیدگی کی واحد وجہ میرا حسن تھا؟ حسن تو خدا تعالیٰ کی دین تھا۔ وہ مجھے جیسا چاہتا بنا دیتا۔ میری ہمیشہ یہ خواہش رہی تھی کہ مجھے حسن کے حوالے سے پسند کرنے کے بجائے میری علمی صلاحیتوں اور لیاقت کی بنا پر پسند کیا جاتا...... عقل جو خدا تعالیٰ سب کو برابر دیتا ہے۔ جسے انسان اپنی محنت سے بڑھاتا ہے۔ جس سے کام لے کر اپنے لیے نئی راہیں تلاش کرتا ہے لیکن حسن تو ثانوی چیز ہے۔ اس کی تقسیم بھی مصلحتاً برابر نہیں اور کون جانے یہ آج ہے تو کل بھی ہوگا۔ میں چاہتی تھی کہ مجھے اپنانے اور جلا بخشنے میں میرا بھی حصہ تھا۔ حسن حاصل کرنے میں میرا کوئی کمال نہ تھا...... یہ تو دینے والے نے دیا تھا۔

"کیا تم نے صرف حسن کی بنا پر مجھ سے شادی کی تھی؟" تھوڑی دیر بعد میں نے اپنی سوچوں کو زبان دے دی۔

"ہاں!" اس نے بہت سہولت سے کہا۔

میں نے جس آس، جس امید پر...... سوال کیا تھا، وہ بھی ٹوٹ گئی۔ دل میں کوئی چیز ٹوٹی اور کرچیاں میرے وجود کو لہولہان کر گئیں۔

"مجھ سے زیادہ خوبصورت تو شی تھی۔ پھر تم نے مجھے کیوں منتخب کیا؟" میرا رواں رواں سوال بن گیا۔

"ایک تو تم فضول باتیں بہت کرنے لگی ہو۔" وہ چڑ گیا۔ "صاف جاننا چاہتی ہو تو سن لو کہ میں ایک فرمانبردار بیوی چاہتا تھا، جو خوبصورت بھی ہو۔ شی کی صورت میں مجھے خوبصورتی تو مل جاتی لیکن وہ کبھی فرمانبردار بیوی ثابت نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ ہر جگہ، ہر مقام پر مجھے Dominate کرتی ہے۔ مجھے کیا سب کو Dominate کرتی ہے۔ مجھے اس کی جیت سے چڑ ہے، میں کسی صورت یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ میری بیوی کسی مقام پر مجھ سے آگے نکلے۔"

"تو گویا مجھ سے شادی کر کے تم اپنی انا کی تسکین چاہتے تھے۔ ظاہر ہے ایک کلرک باپ کی بیٹی جو تمہارے احسانوں کا بار اٹھائے تمہارے گھر میں داخل ہوئی ہے کیسے تم سے جیتنے اور تمہیں Dominate کرنے کی کوشش کر سکتی ہے۔" لیکن یہ سب میں صرف سوچ کر ہی رہ گئی۔

اس بات چیت کے بعد اس موضوع پر میں نے نوفل سے کوئی بات نہ کی۔ اس کا رویہ

میرے ساتھ حسبِ معمول رہا۔ پاکستان آنے کے بعد ہم بہت دنوں تک ڈنر اور پارٹیوں میں شرکت کرتے رہے۔ یہ سب پارٹیاں کاروباری نوعیت کی ہوتی تھیں کچھ دو کچھ لو کے یہ حساب مجھے بالکل پسند نہیں تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ سب لوگ اپنی کھنکتی ہوئی ہنستی پیرس کے شانزے لیزے میں خریداری کے دوران رہن رکھ آئے ہیں۔ یہاں تو ہر طرف کھوکھلے قہقہے تھے۔ جاپان کی الیکٹرونک کی صنعت، پیرس کے پرفیوم، افریقہ کے ہیرے اور بیورلے ہلز کی سیروں کے قصے تھے۔ ہر کوئی دوسرے پر سبقت لے جانے کی فکر میں تھا۔ فرنچ کے فقرے بے دریغ استعمال کرنا اسٹیٹس کی علامت تھی۔

"ارے بھابی، یہ سیٹ آپ نے کہاں سے لیا؟" موتی سی کٹے ہوئے بالوں والی مسز شیرازی جن کی عمر آدھی سے زیادہ صدی پر محیط تھی۔ بھاری سی ساڑھی کا پلو سنبھالتے ہوئے بولیں۔

"جی نوفل نے دیا ہے۔" میں ابھی ان کے ہم او دولت کی Rat-Race میں شامل ہونا نہیں چاہتی تھی، اس لیے میں نے مختصر کہا۔

"کہیں سے تو لے کر دیا ہوگا ناں۔" وہ ہنسیں۔

"مجھے علم نہیں۔" میں دانستہ پیرس کا ذکر گول کر گئی۔

انہوں نے میری طرف عجیب نظروں سے دیکھا اور خواتین کے اس گروپ کی طرف بڑھ گئیں جہاں ان کی من پسند باتیں ہو رہی تھیں۔ میں اکیلی کھڑی کولڈ ڈرنک سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اس تنہائی نے میرے کشیدہ اعصاب کو کچھ پرسکون کر دیا تھا۔ فرنچ ونڈوز سے باہر جھانکتے ہوئے میں خود کو ہال کے ماحول سے الگ تھلگ محسوس کر رہی تھی۔ باہر چٹکی ہوئی چاندنی رات کی رانی کی بھینی بھینی مہک اور ہال کے اسپیکرز سے نکلتی ہوئی دھیمی دھیمی موسیقی...... مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے اردگرد کوئی نہیں ہے۔ جیسے میں پرستان کی حسین وادی میں نکل کھڑی ہوئی ہوں۔ میرے سانسوں کے علاوہ یہاں کوئی آواز نہیں ہے۔

"ان سے ملیں، یہ میری وائف ہیں۔" پرستان جیسے ماحول سے نوفل کی آواز مجھے باہر کھینچ لائی۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ نوفل کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر شخص ڈنر سوٹ میں ملبوس میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"ہیلو کیسی ہیں آپ؟" مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کے اس نے کہا۔

"ٹھیک ہوں۔"

"تمہاری وائف تو بہت شرمیلی ہیں۔" اس نے نوفل سے کہا۔ "کیا نام ہے ان کا؟"

"نام تو نازنین ہے لیکن آپ نازی بھی کہہ سکتے ہیں ہم سب پیار سے یہی کہتے ہیں۔"

مجھے نوفل کی بات سن کر ناگواری کا احساس ہوا لیکن میں نے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔

"نازی! یہ سیٹھ امین خان ہیں۔ وہی جن سے تمہیں ملنے کا بہت شوق تھا۔" اس نے سیٹھ کی نظر بچا کے مجھے آنکھ کا اشارہ کیا۔ "سیٹھ صاحب اس کی بہت خواہش تھی آپ سے ملنے کی۔" میں اس کی بات سمجھ نہ پائی۔

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" سیٹھ امین نے سرتاپا میرا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔
اس کی آنکھیں اور بات کرنے کا انداز دیکھ کر میں سن سی ہو گئی۔

"یہ کچھ کم گو سی ہے لیکن جلد ہی گھل مل جاتی ہے۔" مجھے چپ پا کر نوفل بولا۔ "آج کچھ طبیعت بھی ٹھیک نہیں اس کی۔"

"ہاں لگ رہا ہے۔" وہ بدستور گہری نظروں سے میرا جائزہ لیتا رہا۔

میرے چپ رہنے پر نوفل کھنکھارا۔ یہ اشارہ تھا کہ شائستگی اور تہذیب کا تقاضا ہے کہ اب مجھے بھی کچھ بولنا چاہیے لیکن یہاں، جہاں دور دور تک مجھے شائستگی اور تہذیب کا نشان بھی نظر نہ آ رہا تھا، مجھے اس کا مظاہرہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" میں ٹھہرے ٹھہرے لیکن مضبوط لہجے میں بولی۔

"ویسے میں نے آج سے قبل آپ کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ اس لیے آپ سے ملاقات کا مجھے قطعاً شوق نہیں تھا۔"

نوفل اور امین چند ثانیے کے لیے سناٹے میں آ گئے پھر شدید حیرت کی جگہ نوفل کے چہرے پہ سختی نے لے لی غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ سیٹھ امین بھی کھسیایا ہوا لگ رہا تھا۔ تھوڑی دور کھڑی نوفل کی ممی حالات کو سنبھالنے کی غرض سے آگے آئیں اور بے حد میٹھے لہجے میں بولیں۔

"ارے نازی بیٹی لگتا ہے آپ کی طبیعت بہت خراب ہے۔" پھر وہ کھسیانے کھڑے

سیٹھ سے مخاطب ہوئیں۔ "آپ مائنڈ نہ کریں۔ نازی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ میرا خیال ہے اسے ڈاکٹر کو دکھاتے ہوئے گھر چلیں۔"

"جی ممی! ڈاکٹر کو دکھا کر گھر چلتے ہیں۔" نوفل نے موقع کی نزاکت دیکھ کر اپنے غصے پر کافی حد تک قابو پایا تھا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر تقریباً گھسیٹتا ہوا مجھے لے کر ہال سے باہر نکلا۔ کار کا دروازہ کھول کر ایک دھکے کے ساتھ اس نے مجھے اندر گھسایا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ کہنے کو تو میں نے سیٹھ امین سے کہہ دیا تھا لیکن اس کے نتائج سے میں کچھ بے خبر بھی نہیں تھی۔ اس کے باوجود جو کچھ میرے ساتھ ہوا وہ میری توقع سے کہیں زیادہ تھا۔ ہمارے پیچھے ہی ممی پاپا کی کار گیراج میں رک گئی۔ ان تینوں کے چہرے غصے سے سرخ ہو رہے تھے۔ گھر کے اندر داخل ہو کر میں نے اپنے کمرے کی طرف قدم بڑھائے لیکن ممی کی آواز نے میرے بڑھتے قدم روک دیئے۔

"اے لڑکی! یہاں آؤ۔"

میں نے مڑ کر دیکھا۔

"میں نے تمہیں یوں دیدے پھاڑ کر دیکھنے کو نہیں' یہاں بلایا ہے۔"

میں نے چپ چاپ قدم ان کی طرف بڑھا دیئے۔

"آج جو حرکت تم نے بھری محفل میں کی ہے' اس کا کوئی جواز ہے تمہارے پاس۔" پاپا اپنے غصے کو دباتے ہوئے بولے۔

"پاپا! وہ شخص...... وہ ایسے دیکھ رہا تھا۔ پاپا میں اسے جانتی ہی نہیں تھی۔ مجھے اس سے ملنے کا کیا شوق ہوتا۔" میرے فقرے بہت بے ربط تھے۔

"جاننا یا نہ جاننا اپنی جگہ لیکن کم از کم تم کچھ تہذیب کا مظاہرہ تو کر سکتی تھیں۔ جب نوفل نے یہ کہا تھا تو تمہیں اس کی بات سے انکار نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"پاپا...... مجھے وہ شخص' اس کے دیکھنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اچھے کردار کا مالک نہیں ہے۔" پاپا کے نرمی سے بات کرنے پر میں نے بھی اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔

"مائی فٹ! کیا ہوتا ہے اچھا انداز اور اچھا کردار۔" مما بھی پھٹ پڑیں۔ "یہ دو ٹکے کی چھوکری ہمیں بتا رہی ہے کہ کس کا کردار کیا ہے۔ نچلے طبقے سے آنے والوں کو اپنے سے اچھا نظر آ جائے تو یہ کمپلیکس میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ہر ایک ان کی نظر میں مشکوک ہو جاتا

ہے۔"

میری آنکھوں میں ڈھیر سارے آنسو اتر آئے ... اتنی بے عزتی ... میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ مدد کی غرض سے میں نے نوفل کی طرف دیکھا۔

"نوفل! تم مما کو بتاؤ ناں ..." آنسوؤں کا ایک گولا میرے حلق میں پھنس گیا تھا۔ میں اپنی بات بھی پوری نہ کر سکی۔

"کیا خاک بتاؤں مما کو۔" آخر کو وہ بھی تو اپنی ماں پر گیا تھا۔ "لاکھوں کا نقصان صرف تمہاری وجہ سے ہوا ... تم جاہل' گنوار عورت ... آخر کو اپنی حیثیت کے مطابق ہی بات کی تم نے۔ میں نے تم سے شادی اس لیے کی تھی کہ تم میری فرمانبردار رہو گی ... تم لیکن ... تم میں بھی وہی ٹی وی والی خوبو آتی جارہی ہے۔ اس لڑکی نے تمہیں بگاڑ دیا ہے۔"

"لیکن میں ..."

"بند کرو بکواس اور یاد رکھو کہ تم پر میں نے بہت خرچہ کیا ہے۔ اب یہ سب میں منافع کے ساتھ وصول کروں گا۔ تمہارے پاس خوبصورتی کے علاوہ کچھ نہیں اور میں اسے کیش کرواؤں گا۔" غصے سے نوفل کی صورت مسخ ہو چکی تھی۔

میں اتنا بڑا صدمہ سہنے کو تیار نہ تھی۔ مجھے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ خوبصورتی لفظ سے مجھے نفرت ہو گئی تھی۔ ہر چیز پر نفع حاصل کرنے اور پھر اس نفع کو Multiply کرنے والے خوبصورتی کے مفہوم کو کیا جانیں۔ اس سے زیادہ میں کچھ سوچ نہ سکی۔

کتنی تسکین ہے احساس کی موت
کبھی دیوانہ تو ہو کر دیکھو

اور اس رات میں ہوش وخرد سے بیگانہ ہو گئی اور دیوانگی کیا ہے؟ یہی ہوش وخرد سے بیگانگی لیکن نہیں ... ہم آگہی اور شعور حاصل کر لینے والے افراد کبھی دیوانے نہیں بن سکتے۔ ہم سے فرزانے مصلحت کے جال بنتے ہی رہ جاتے ہیں جبکہ دیوانے سرِ عام دل کی بات کہہ دیتے ہیں۔ چپ چپ دیکھنے اور سہنے کے لیے ہمیں اپنے آپ کو مارنا پڑتا ہے۔ اپنے آپ کو مارنا اور ختم کرنا اس قدر آسان نہیں ہوتا' لیکن ہم یہ سب کر گزرتے ہیں۔ خوف کا آکٹوپس بری طرح سے ہمیں جکڑ لیتا ہے۔ اس آکٹوپس کی بہت سی ٹانگیں ہوتی ہیں۔ زمانے کا خوف ... لوگوں کا خوف ... ماں باپ کا سر جھک جانے کا خوف ... احسان فراموش

کہلائے جانے کا خوف ... اپنے مستقبل کا خوف۔ اس آکٹوپس کی کس کس ٹانگ سے پیچھا چھڑایا جائے اور پھر پیچھا چھڑانے کی ہر کوشش بے سود کہ اس کے لیے جس قدر ہاتھ پاؤں مارے جائیں اتنی ہی سختی سے یہ انسان کو جکڑتی جاتی ہیں۔

اس واقعہ کے بعد میں اپنے پرانے گھر گئی۔ اس گھر میں جس کے شکستہ در و دیوار میں پڑی ہوئی دراڑیں میرے بچپن سے جوانی تک کے ایک ایک لمحہ کی گواہ تھیں جاتے سمے میں اپنی یادوں کا سرمایہ یہیں محفوظ کر گئی تھی۔

"بجیا آئی ہیں۔" ریحانہ نے مجھے دیکھ کر حیرت اور مسرت کے ملے جلے تاثرات سے کہا۔

"اتنی حیران کیوں ہوتی ہے' کیا یہ تیری بجیا کا گھر نہیں ہے۔" میں اس گھر میں داخل ہو کر اپنے سب غم بھول جانا چاہتی تھی۔

"ارے بجو' یہ آپ کا گھر کہاں۔ آپ کا گھر تو بہت شاندار ہے۔ اس شکستہ سے گھر سے اب آپ کا کیا واسطہ۔" اس کی آواز میں رشک بھی تھا اور حسرت بھی۔

میرے دل میں گویا چھناکے سے کچھ ٹوٹ گیا ... روح تو پہلے ہی گھائل تھی اب یوں لگا ریحانہ نے اس پر نمک چھڑک دیا ہو۔

"یا خدا! مجھے کس امتحان میں ڈال دیا تو نے؟" میں بس سوچ کر ہی رہ گئی۔ یہ حکمِ زباں بندی بھی تو میرا اپنا تھا۔

"ہائے بجیا میں تو اب کسی گلبرگی شہزادے کا انتظار کر رہی ہوں۔" ریحانہ اپنی بے خبری میں کچوکے لگا رہی تھی۔

"رینو! ابھی تم بہت چھوٹی ہو شہزادوں کے محلوں میں بہت سی سازشیں بھی پلتی ہیں۔"

"ارے چھوڑو بجیا' آپ بھی چھوٹی چھوٹی باتوں کا بتنگڑ بنا لیتی ہیں۔ بس ہمیں کیا چاہیے۔ خوبصورت کپڑے' دل میں اترتی مہک والے پرفیوم' بڑی بڑی پارٹیز اور ... اور ایک من موہنے شہزادے کی سنگت۔ اس کے محل میں کیا ہوتا ہے' اس سے ہمیں کیا۔ کان اور آنکھیں بند کر کے جیتے جاؤ۔"

"پگلی! ایسے بھی کبھی زندگی گزرتی ہے۔" میں اس کی بچکانہ سوچ پر کڑھ کے رہ گئی۔

"گزر جاتی ہے بجو' گزر جاتی ہے۔ آخر یہاں بھی تو کان اور آنکھیں بند کر کے گزار رہے ہیں زندگی۔" ریحانہ نے افسردگی سے کہا۔ "بعض اوقات زندگی گزارنے کے لیے

سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔ اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے' اس سے زندگی کی راہیں کچھ سہل ہو جاتی ہیں۔''

میں سمجھ نہ سکی کہ کیا ریحانہ کی سوچ واقعی بچکانہ ہے یا سوچنے کے عمل میں وہ بہت آگے نکل چکی ہے۔ ٹھیک کہہ رہی تھی وہ' یہاں بھی کیا رکھا تھا' جسے دیکھنے کی آنکھیں خواہش کریں یا سننے کی آرزو کان...... پھر خواب دیکھنے کا تو اسے حق حاصل ہے ناں۔ عمل پر تو پابندی لگ سکتی ہے۔ سوچنے سے تو کوئی روک نہیں سکتا۔

''ارے میری بٹیا آئی ہے' اندر لاؤ اسے' کیا دھوپ میں اس کی کھلتی رنگت خراب کرنی ہے؟'' میں اماں کی آواز سن کر چونک گئی۔

''سلام اماں۔''

''وعلیکم' اندر آؤ میری رانی' ایسی گرمی میں کیوں کھڑی ہو۔''

میں کمرے کے اندر چلی آئی۔ مجھے اماں کے تفکرات پہ حیرت نہیں تھی۔ میرا یہی رنگ وروپ تو مجھے اندرون شہر کی تاریک گلیوں سے ڈیفنس کی چھ کنال کی کوٹھی میں لے کر گیا تھا' اب اگر گرمی سے اس پر اثر پڑتا تو اماں کو پریشانی تو لاحق ہونی ہی تھی۔

''اے نازو! اگر ملنے کو دل تھا تو مجھے بتا دیتی' میں آ جاتی' تُو نے کیوں تکلیف کی۔''

''اماں! آپ بھی کمال کرتی ہیں' یہ بھی تو میرا گھر ہے آنے میں تکلیف کیسی؟''

''نہ نہ بیٹی' یہ تیرا گھر نہیں ہے۔ تیرا گھر اب سسرال ہے۔ یہاں تُو مہمان بن کر آئی ہے۔'' اماں جان نے کہا۔

''میرا گھر کون سا ہے؟'' میں صرف سوچ کر ہی رہ گئی۔ شاید میری یہ سوچ اماں نے بھی پڑھ لی۔

''اے لڑکی! کہیں میاں سے جھگڑ کے تو نہیں آئی؟'' میں چپ رہی۔

''جواب دے بولتی کیوں نہیں۔'' اماں جان نے کڑک دار آواز میں کہا۔

میں ہمیشہ کی کم گو ٹھہری۔ جس کے لیے الفاظ سے زیادہ جذبات کی قدر و قیمت تھی۔ کچھ بھی نہ بول سکی۔

''سنو نازو! تم اگر اماں باوا کی ناک کٹوانے کا سامان کر کے آئی ہو تو میں تمہیں یہاں ایک منٹ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔'' اماں پاٹ دار آواز میں بولیں۔ ''تمہارے سسرال

والوں کے ہم پر بہت سے احسان ہیں۔ ہم نے تمہیں اس لیے نہیں پڑھایا لکھایا تھا کہ تم اس بڑھاپے میں ماں کے سفید چونڈے میں کالک لگاؤ گی۔ بولو کیا کر کے آئی ہو؟''

''کچھ نہیں اماں! میں کچھ کر کے نہیں آئی۔ خوف کا آکٹوپس کچھ کرنے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔''

''یعنی یہ تمہارا خوف کا جو کچھ بھی ہے اجازت دیتا تو کچھ کر کے بھی آ جاتیں۔'' اماں نے کہا۔ ''یہاں اکیلی کیوں آئی ہو؟''

''کسی ہمدرد کے کاندھے پہ سر ٹکا کے چند آنسو بہانے کے لیے۔''

''شوہر سے زیادہ ہمدرد کوئی نہیں ہوتا۔ جاؤ اور اس کا سہارا تلاش کرو۔ آئندہ یہاں اکیلے آنے کی ضرورت نہیں۔ فوراً واپس چلی جاؤ۔''

اب مزید وہاں رکنے کا فائدہ تھا نہ جواز...... اپنے سسرال والوں کے احسانوں کی گٹھڑی سمیت میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آخری بات سنتی جاؤ۔''

میرے قدم اماں کی آواز سن کر دروازے میں ہی رک گئے۔

''ہم لوگوں کے گھروں سے بیٹیوں کی ڈولی جاتی ہے جنازہ شوہر کے گھر سے اٹھتا ہے۔ اب چلی جاؤ اور کبھی ایسی نیت سے یہاں کا رخ نہ کرنا۔''

اور یوں میں نے اندرون شہر کی تنگ و تاریک گلیوں کو ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ دیا۔

ریحانہ نے ٹھیک کہا تھا' کبھی کبھار دوسروں کے لیے سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔ اپنی روح' اپنی عزتِ نفس کو مارنا پڑتا ہے۔ ہر مقام پر۔

کار لمبے چوڑے ڈرائیو وے سے گزر کر گیراج میں کھڑی ہو گئی۔ جو چند آنسو کسی کے کاندھے پہ سر رکھ کر بہانے کی آرزو لے کر میں یہاں سے گئی تھی' وہ آنسو میں نے چپکے چپکے اپنے من میں اتار لیے تھے۔ یہی آنسو تو میرے غم خوار میرے دوست' میرے رفیق تھے۔ ان کی بے قدری مجھے گوارا نہ تھی' سو ان کو میں نے دل کے نہاں خانوں میں چھپا دیا۔

''مل آئیں اپنی والدہ محترمہ سے۔'' لاؤنج میں داخل ہوتے ہی میری ساعت سے ممی کی آواز ٹکرائی۔ ''کیا دکھ درد سنائے انہیں؟''

میرے چپ رہنے پر وہ گویا ہوئیں۔ ''ویسے تمہیں اپنی اوقات یاد رکھنے کے لیے وقتاً

فو قتاً ان تنگ گلیوں میں جاتے رہنا چاہیے۔''

ان کے چپ ہو جانے پر میں بوجھل قدموں سے اپنے کمرے کی جانب چل دی۔ میں اپنی اور ان کی دونوں کی اوقات جانتی تھی۔ شاید ان ہی کے متعلق مصطفیٰ زیدی نے کہا تھا۔

آج تم رام کے مونس' نہ ہنومان کے دوست
تم نہ کافر کے ثناء خواں' نہ مسـ ـ ـن کے دوست
تم نہ الحاد کے حامی ہو' نہ ایمان کے دوست
تم نہ اشلوک کے ساتھی ہو نہ قرآن کے دوست
تم تو سکوں کی لپکتی ہوئی جھنکاروں میں
اپنی ماں کو اٹھا لاتے ہو بازاروں میں

یہ وہ لوگ تھے جن کا دین' ایمان اور رشتے سب پیسے اور دولت سے منسلک تھے۔ ان کا کوئی دین اور ایمان نہیں تھا۔ دولت کی خاطر یہ تہذیب اور رشتے سب تار تار کر سکتے تھے۔

اب میرے حالات کچھ ایسے تھے کہ میرے لیے نوفل سے یونیورسٹی جانے کی اجازت لینا مشکل تھا۔ صرف یہ بات تسلی بخش تھی کہ وہ نام نہاد روشن خیالی کا علمبردار تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ موقع دیکھ کر محتاط انداز میں بات کروں گی۔ گھر میں ڈھیر سارے نوکروں کی موجودگی میں فارغ ہی رہتی تھی اس لیے باقاعدہ تعلیم جاری رکھنا میرے لیے مشکل نہ تھا۔ یوں بھی میں ہمیشہ اپنے حالات سے پریشان ہو کر کتابوں میں اپنا آپ گم کر دینے کی عادی تھی۔ شام کی چائے پیتے ہوئے میں نوفل سے مخاطب ہوئی۔

''آج کل یونیورسٹی کیسی جا رہی ہے؟''

''ویسے ہی جیسے تم چھوڑ کر گئی تھیں۔''

''پڑھائی' کیسی جا رہی ہے تمہاری؟''

''شادی کے ہنگاموں کی وجہ سے بہت حرج ہوا ہے اب کافی توجہ دینی پڑے گی۔ پھر روز روز کی پارٹیز' یہ بھی اٹینڈ کرنا ضروری ہیں۔ ان ہی پارٹیز کا بزنس پر بھی اثر پڑتا ہے۔''

''میں سارا دن فری رہتی ہوں۔ سوچ رہی تھی کہ پھر سے پڑھائی شروع کر دوں۔'' میں نوفل کے چہرے پر ردِعمل دیکھنے کے لیے تھوڑی دیر رکی لیکن اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا میں نے سلسلہ کلام دوبارہ جوڑتے ہوئے کہا۔'' کہتے ہیں ایک سے دو بھلے' اس

طرح ہم اکٹھے کورس کرنے کی کوشش کریں گے۔''

''تمہیں اس وقت سوشیالوجی میں ماسٹر کرنے کی نہیں اپنی انگلش امپروو کرنے کی ضرورت ہے۔ اس پہ توجہ دو۔ مجھے اس وقت شدید الجھن ہوتی ہے جب پارٹی میں کوئی تم سے انگریزی میں مخاطب ہوتا ہے اور تم ہونقوں کی طرح اس کا منہ دیکھتی رہتی ہو۔'' وہ ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے رکا۔ ''کل سے تمہیں انگلش پڑھانے کے لیے ایک ٹیوٹر آیا کرے گا۔''

یوں میں اگلے دن سے ٹیوشن پڑھنے لگی۔ پارٹیز اسی طرح جاری تھیں اور اب جبکہ میں سمجھوتہ کر چکی تھی۔ پارٹیز میں اپنی مسکراہٹ اور دلآویز باتیں لوگوں میں بانٹ کر اپنے سسر اور نوفل کے کاروبار کے لیے راہیں ہموار کرتی تھی۔

ہماری طرح کے اور بھی بہت سے گھرانے تھے اگر نوفل یا اس کے پاپا کو کسی سے کام پڑتا تھا تو اور لوگوں کو بھی اکثر و بیشتر ان سے کام پڑتا رہتا تھا۔ ایسے میں میں کسی سیٹھ کے ساتھ ہوتی اور کسی اور سیٹھ کی بیوی نوفل کے ساتھ' میں حتی الامکان کوشش کرتی تھی کہ ایسے مناظر نہ دیکھوں لیکن ایک جگہ' ایک چھت کے نیچے کھڑے ہو کر یہ ممکن نہ تھا کہ میری نظر نوفل اور اس کے ساتھ کھڑی لڑکی پہ نہ پڑے۔ ایسی ہی ایک تقریب میں جب میں گریڈ 21 کے ایک افسر کے ساتھ باتیں کر رہی تھی' میری نظر اس کے ساتھ کھڑی سیٹھ امجد چوہدری کی حسین چوتھی بیوی نادرہ پر پڑی۔ وہ دونوں باتیں کر رہے تھے اور کبھی کبھار ایک دوسرے کے ہاتھ پہ ہاتھ مار کے ہنس پڑتے۔ اسی وقت نادرہ اور نوفل کی مجھ پہ نظر پڑی تو دونوں میری طرف ہی چلے آئے۔ پہلے تو کچھ دیر رسمی سی بات چیت ہوتی رہی پھر نادرہ نے اچانک کہا۔

''ہم ابھی محبت کے متعلق بات کر رہے تھے' تمہارا محبت کے بارے میں کیا نظریہ ہے نازی؟'' چند ثانیے تک میں اس کو اور نوفل کو گہری نظروں سے دیکھتی رہی پھر بولی۔

''تُو چلے ساتھ تو آہٹ بھی نہ آئے اپنی
درمیاں ہم بھی نہ ہوں یوں تجھے تنہا چاہیں''

''آپ کا ادب کا ذوق بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔'' وہ شعر کا مفہوم سمجھے بغیر بولی۔

''بہت اچھا شعر ہے۔'' پاس کھڑے سیٹھ امجد چوہدری نے بھی فیشن کے طور پر شعر کی تعریف کرنا ضروری سمجھا ورنہ بات تو اس کے سر کے اوپر سے ہی گزر گئی تھی۔

لیکن جسے سمجھنا چاہیے تھا اس تک میری بات پہنچ چکی تھی۔

''انسان کو اس قدر خود غرض نہیں ہونا چاہیے محبت کے معاملے میں۔'' وہ بولا۔ ''بلکہ باہمی تعاون کو بھی مدِنظر رکھنا چاہیے جو کہ زندہ رہنے کے لیے بہت ضروری ہے۔''

اس نے مجھے ڈھکے چھپے لفظوں میں بہت کچھ بتا دیا تھا۔

''چلیں نادرہ!'' وہ نادرہ کا ہاتھ تھام کر بولا۔ جواب میں نادرہ نے بھی نوفل کو ایک دلآویز مسکراہٹ سے نوازا۔

☆======☆======☆

ایک ایک کر کے بہت سے بوجھل دن گزر گئے۔ اس تمام عرصہ میں میرا شی سے بالکل رابطہ نہ ہو سکا۔ البتہ اس کے پاپا اکثر پارٹیز میں مجھ سے ملتے تھے۔ وہ مجھ سے بہت شفقت سے پیش آتے تھے لیکن نوفل کی موجودگی کے باعث میں ان سے کبھی شی کے متعلق استفسار نہ کر سکی۔ میرا اس سے ملنے اور باتیں کرنے کو بہت دل چاہتا تھا' وہ میرے ہر مسئلے کا حل بتاتی تھی شاید میرے اس مسئلے کا بھی اس کے پاس کوئی حل ہو۔ آخر میری یہ آرزو بھی ایک دن پوری ہو گئی۔ ڈپارٹمنٹ کا سالانہ ڈنر جس میں نئے پرانے سب طلبا کو شرکت کرنی تھی۔ مجھے اور نوفل کو بھی اس ڈنر میں شریک ہونا تھا۔ یہ پہلی دعوت تھی جس میں شرکت کرتے ہوئے میں دلی مسرت محسوس کر رہی تھی۔

وقتِ مقررہ پر جب میں نوفل کے ہمراہ ہال میں داخل ہوئی تو میری نظریں شی کو ہی تلاش کر رہی تھیں۔ سب مہمانوں کے درمیان وہ مجھے سر نقوی سے دھواں دھار بحث کرتی نظر آئی نوفل بھی اپنے دوستوں سے محوِ گفتگو تھا اس لیے میں موقع غنیمت جان کر اس کی طرف چل دی۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔

''ہیلو نازی! کیسی ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں' تم سناؤ کیسی ہو؟ تم نے تو بالکل ہی بھلا دیا' نہ گھر آئیں نہ فون کیا۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی شکوہ میرے لبوں پر آ ہی گیا۔

میری بات سن کر وہ خوشدلی سے ہنس دی۔ ''تم نے بھی تو ملنے کی کوشش نہیں کی کبھی۔''

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی میں شرمندہ ہو گئی۔ قصور میرا بھی نہیں تھا کیونکہ مجھے اس سے ملنے کی اجازت ہی نہیں تھی۔ میری شرمندگی بھانپ کر وہ بات پلٹنے کی خاطر بولی۔

''چلو چھوڑو ان باتوں کو...... اب تو ملاقات ہو ہی گئی۔'' اس کے بعد ہم دونوں نے ڈھیر ساری باتیں کیں۔ وہ ہمیشہ کی طرح سب سے منفرد لگ رہی تھی۔ آف وہائٹ رنگ کی اے لائن شرٹ اور شلوار میں ملبوس وہ ہمیشہ سے زیادہ حسین دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے بالوں کا انداز بھی بدل گیا تھا اور وہ اس کی پیشانی پہ جھول رہے تھے۔

کھانا کھانے کے بعد ہم دونوں ہال سے باہر لان میں نکل آئے۔ وہیں میں نے اپنے مسئلے کے حل کے لیے اس سے راہنمائی طلب کی۔

''وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔'' وہ سوچ میں ڈوبے لہجے میں بولی۔

''شی تم تو ان لوگوں کو جانتی تھیں۔ اگر تم مجھے شادی سے قبل بتا دیتیں تو۔''

''تو کیا ہوتا؟'' وہ میری بات کاٹ کر بولی۔ ''کیا تمہارے والدین اس پروپوزل کو ریجکٹ کر دیتے؟ یا تم انکار کر دیتیں؟''

''شاید نہیں۔'' میں بولی۔ ''میں ذہنی طور پر تیار تو رہتی۔''

''ناممکن ہے۔ اسی لیے میں نے تمہیں تعلیم جاری رکھنے کا مشورہ دیا تھا کہ خدانخواستہ اگر حالات بگڑ جائیں تو تم اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکو۔ میرا خیال تھا کہ نوفل مختلف طبیعت کا ہو گا لیکن وہ بھی اپنی ماں کی طرح ہی نکلا۔''

''اب میں کیا کروں؟'' میں نے 'اب' پہ زور دیتے ہوئے کہا۔

''دیکھو نازی! صاف بات یہ ہے کہ اب دو ہی راستے ہیں۔ پہلا یہ کہ تم سمجھوتہ کر لو۔ وہی کرو جو تمہارے سسرال والے کروانا چاہتے ہیں۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ تم علیحدگی اختیار کر لو۔ فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔ سوچ لو کہ ہمارے ہاں کا معاشرتی نظام کیسا ہے اور علیحدگی اختیار کرنے کے بعد کیا تم خود کو اس نظام میں ایڈجسٹ کر سکو گی۔ دونوں راستے کٹھن ہیں اور انتخاب تمہارے اختیار میں ہے۔'' وہ ایک لمحے کو رکی پھر بولی۔ ''یہ افسانوی داستان نہیں ہے کہ تم یہ آس لگائے بیٹھی رہو کہ کسی معجزہ یا تمہاری خدمت اور محبت سے نوفل یا اس کے والدین سدھر سکیں گے۔ یہ غیر حقیقی بات ہو گی۔ بہتر ہے کہ تم حقیقت سے منہ موڑنے کے بجائے اس کا سامنا کرو۔''

''میں سمجھوتا کر چکی ہوں شی!'' میں نے افسردگی سے کہا۔ ''میرے لیے تمام در بند ہیں میرے سسرال والوں کے میرے والدین پر بہت سے احسانات ہیں اور میں ان احسانوں

کے بوجھ تلے قید ہوں۔ میرے والدین کی اور بھی ذمہ داریاں ہیں۔ اگر میں واپس چلی گئی تو اماں اور ابا کی برسوں کی بنائی ہوئی عزت خاک میں مل جائے گی۔ میں انہیں دکھ دینا نہیں چاہتی۔ جو کچھ سہنا ہوا میں اپنے اوپر سہہ لوں گی لیکن انہیں بے عزت نہیں ہونے دوں گی۔''

رات بھیگتی جا رہی تھی۔ واپسی کا وقت ہو چکا تھا۔ میں اور شی ہال کی طرف چل دیئے۔ نوفل میرا ہی انتظار کر رہا تھا۔ ہم سب سے اجازت لے کر واپس چلنے لگے تو سر نقوی ہمارے قریب آ گئے۔

''کیسی ہیں آپ نازنین؟''

''جی سر بالکل ٹھیک ہوں۔''

''آپ کے جانے کے بعد ہمیں احساس ہوا کہ ڈیپارٹمنٹ کی ایک ذہین طالبہ چلی گئی ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ تعلیم جاری رکھیں گی۔''

''دراصل گھریلو مصروفیات میں وقت نہیں ملتا۔''

''تعلیم کا مقصد صرف ڈگری کا حصول نہیں ہوتا۔ آپ گھر میں بھی اچھی کتابیں پڑھ سکتی ہیں۔ لڑکیوں کو تعلیم ضرور حاصل کرنی چاہیے۔'' پھر وہ نوفل سے مخاطب ہوئے۔ ''نوفل تم نے آؤٹ لائن بنالی۔ یہ مضمون کی۔''

''یس سر بلکہ مضمون لکھنا بھی شروع کر دیا ہے۔'' پھر وہ مجھ سے بولا۔ ''وہ ہم جہیز کے خلاف مہم شروع کر رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں مجھے مضمون لکھنا ہے۔''

میں سر ہلا کر رہ گئی۔ شی جو ہمارے قریب ہی کھڑی تھی بولی۔ ''اور اسی سلسلے میں ہم ایک فنکشن بھی کر رہے ہیں۔ تم ضرور آنا۔''

''کیوں نہیں، ہم دونوں آئیں گے۔'' نوفل نے کہا۔

چند دن بعد اسی فنکشن میں شرکت کی غرض سے میں اور نوفل یونیورسٹی گئے۔ شی وہاں پہلے سے موجود تھی مجھے دیکھتے ہی وہ لپک کر میری طرف آئی اور سامنے کی قطار میں پڑے ہوئے صوفے پر مجھے بٹھایا۔ رسمی بات چیت کے بعد وہ انتظامی امور کی نگرانی کرنے لگی۔ پروگرام میں اسے بھی اپنا مضمون پڑھنا تھا۔ پروگرام بہت دلچسپ اور معلوماتی تھا۔ طلباء نے اپنے مضامین کافی محنت سے لکھے تھے۔ سب کے ارادے بلند تھے اور نیک بھی۔ سب سے اچھے مضامین شی اور نوفل کے تھے۔ دونوں کو بے حد داد ملی۔ مہمان ان دونوں سے متاثر نظر

آتے تھے۔ اسٹیج پہ کھڑا نوفل کہہ رہا تھا۔

''اگر لڑکے تھوڑا سا بھی اسٹینڈ لیں تو صورت حال اس قدر خراب نہ ہو۔ وہ خود بھی بغیر محنت کیے سب کچھ حاصل کر لینے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ یہ بڑا بول نہیں ہے۔ وہ سامنے میری بیوی بیٹھی ہے پوچھ لیں اس سے کچھ طلب کیا میں نے جہیز کی صورت میں؟''

اسٹیج پہ کھڑے ہو کر وہ مہمانوں کی نفسیات اپنے قابو میں کر چکا تھا۔ سب ہمہ تن گوش تھے لیکن ان الفاظ کے آگے میں کچھ نہ سن سکی۔ میرے ذہن میں تو بہت عرصہ پہلے بولے ہوئے اس کے الفاظ گردش کر رہے تھے۔ ''یاد رکھو کہ تم پر میں نے بہت خرچہ کیا ہے اور یہ سب کچھ میں منافع کے ساتھ وصول کروں گا۔ تمہارے پاس تمہاری خوبصورتی کے علاوہ کچھ نہیں اور میں اسے کیش کراؤں گا۔''

میں اس تن کے اجلے من کے کالے شخص کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی جو بہت اعتماد کے ساتھ مجمع کی داد سمیٹ رہا تھا۔ مجھے اس شخص سے نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ تقاریر کے اختتام پر پروفیسر نقوی کی صدارت میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس کمیٹی کے ممبر ڈیپارٹمنٹ کے تمام طلباء تھے۔ انہوں نے یہ قرارداد اکثریت سے منظور کر لی کہ کمیٹی کے تمام ممبر لڑکے شادی کے وقت جہیز نہیں لیں گے اور کوئی لڑکی جہیز نہیں لے کر جائے گی۔ جہیز کی صورت میں لڑکی کے ساتھ صرف کلام پاک اور اس کی تعلیم ہوگی جس سے وہ راہنمائی حاصل کر سکے۔ ہر شخص لڑکی کے دیئے ہوئے سے گھر بنانے کے بجائے اپنی قوت بازو سے گھر بنائے گا۔ یہ سب کا عہد تھا۔

پھر دن پر لگا کر اڑنے لگے۔ میری زندگی اسی نہج پر چل رہی تھی۔ اپنے والدین سے میرا رابطہ مکمل طور پر کٹ چکا تھا۔ ایک دو مرتبہ ابا مجھ سے ملنے آئے تھے لیکن باہر ہی سے نوکروں نے انہیں بتا دیا تھا کہ چھوٹی بیگم گھر پر موجود نہیں۔ یہ تمام منظر میں نے اوپر کھڑکی سے دیکھا تھا۔ اس کے بعد ابا مجھ سے دوبارہ ملنے نہیں آئے۔ وہ بہت وضع دار تھے بیٹی کے گھر بار بار آنا انہیں گوارا نہیں تھا۔ وہ یہی سوچ رہے ہوں گے کہ ان کی بیٹی بڑے گھر میں راج کر رہی ہوگی۔ ان کے لیے یہی اطمینان کافی تھا۔

شی سے بھی اس دن کے بعد میری ملاقات نہ ہو سکی تھی گو کہ نوفل اور شی کے گھرانے کا اٹھنا بیٹھنا ایک ہی بزنس کلاس میں تھا اور اسی وجہ سے شی کے پاپا کی نوفل کے والدین سے

جان پہچان بھی تھی لیکن یہ سب کچھ پارٹیز اور آفس تک ہی محدود تھا۔ شی کی ممی کی ڈیتھ ہو چکی تھی اور پاپا کا حلقۂ احباب اسی بزنس سرکل تک محدود تھا۔ شی ان محفلوں میں شرکت ہی نہیں کرتی تھی اور نہ پہلے بھی اور نہ ہی اب اس کا ہماری طرف آنا جانا تھا۔

نوفل کے فائنل کے امتحان ختم ہو چکے تھے اور اب وہ پاپا کے ساتھ مل کر بزنس چلا رہا تھا۔

ایک دن میں لاؤنج میں بیٹھی رسالہ پڑھ رہی تھی کہ ملازم نے مسز عزیز کے آنے کی اطلاع دی۔ مسز عزیز کا نام سن کر میرا موڈ ہمیشہ آف ہو جاتا تھا۔ ان کا بہترین مشغلہ ہم پلہ خواتین کی غیبت کرنا تھا جو کہ مجھے سخت ناپسند تھا۔ شادی والے دن بھی ان کی وجہ سے کافی بدمزگی پیدا ہوئی تھی۔ خیر میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

ڈرائنگ روم میں بڑے سے صوفے پہ بیٹھی وہ اپنی پرپل سلک کی ساڑھی کا پلو بار بار سنبھال رہی تھیں۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر انہوں نے گویا دھماکا کیا۔

''تمہیں شی کی شادی کا کارڈ ملا؟''

''نہیں۔'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''کب ہو رہی ہے شادی اور کس کے ساتھ؟''

''ارے میں نے تو سنا تھا کہ تمہاری اس سے بہت دوستی ہے۔ اس نے تمہیں نہیں بتایا؟''

''کافی عرصہ سے میری اس سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ شاید آج کل میں کارڈ مل جائے۔''

''پتا ہے کس سے ہو رہی ہے شی کی شادی؟''

''مجھے تو علم نہیں، آپ کو پتا ہو تو بتا دیں۔''

''وہیں ڈیپارٹمنٹ میں اس کا چکر چل رہا تھا اپنے کسی پروفیسر کے ساتھ۔ بس وہیں ہو رہی ہے شادی۔'' وہ بولیں۔ ''سنا ہے کہ پروفیسر سیلف میڈ بندہ ہے۔ ماں اور دو بہنیں بھی ساتھ رہتی ہیں۔ دونوں کی شادی ہو چکی ہے۔ اکلوتا بیٹا ہے اور ماں نے بہت محنت سے اسے پڑھایا لکھایا ہے۔ بس واجبی سا مکان ہے۔''

میں ان کی طرف سے مزید اطلاعات کے انتظار میں چپ رہی۔

''خیر مکان کا کیا ہے' ایسے رشتے تو ماں باپ خریدتے ہیں۔'' مجھے چپ دیکھ کر وہ پھر بولیں۔ ''اب یا تو لڑکے کو ماں اور بہنوں سے الگ کروا کے گھر داماد بنا دیں گے یا پھر اس کا جہیز سے گھر بھر دیں گے۔ اتنے بڑے گھر کی لڑکی اتنا کچھ لے کر جائے گی تو ظاہر ہے ساس

اور نندوں کا منہ بھی ہمیشہ بند رہے گا۔''

''آپ شاید کچھ زیادہ کہہ گئی ہیں۔'' میں نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے کہا۔ ''انکل اور شی ایسے نہیں ہیں۔''

''ارے سب ایک جیسے ہوتے ہیں بس تم بہت بھولی ہو۔ بڑے گھر والے ایسے ہی کرتے ہیں۔ بیٹیاں ہوں تو چھوٹے گھر سے داماد لیتے ہیں تاکہ منہ بند کیا جا سکے اور بیٹے ہوں تو نچلے طبقے سے بہو لاتے ہیں تاکہ آمدنی بڑھانے کا ذریعہ بن سکے۔''

انہوں نے واضح طور پر مجھے نشانہ بنایا تھا لیکن میں ضبط کر گئی۔ اگر ان کی بات پچاس فیصد غلط تھی تو اتنی ہی درست بھی تھی۔

''آپ چائے لیں۔'' میں نے بات کا رخ موڑنے کی کوشش کی۔

''شکریہ۔'' وہ بولیں۔ ''ہاں تو میں شی کی بات کر رہی تھی۔ ہے تو تمہاری دوست' لگے گا بھی تمہیں برا لیکن میں سچی بات کرتی ہوں ہمیشہ۔''

وہ کیک پیس نگلنے کے لیے ایک لمحہ کو رکیں میں نے چاہا کہ اس دوران ان کی توجہ کہیں اور مبذول کرا دوں لیکن میری یہ کوشش بار آور ثابت نہ ہوئی اور وہ دوبارہ گویا ہوئیں۔

''اس قسم کی لڑکیاں گھر نہیں بسا سکتیں۔ گھر بسانے کے لیے بہت ایثار اور قربانی کی ضرورت ہوتی ہے جیسے تم نے دی ہے۔ یہ رہی شتر بے مہار نہ دن کا پتہ نہ رات کی خبر۔ آج یہ پارٹی ہے' کل وہ پارٹی ہے۔ ایسے گھر تو نہیں چلتے نا۔ پوری ماں پر گئی ہے۔''

''آپ اس کی ممی سے کبھی ملی تھیں؟'' میں نے بر سبیل تذکرہ کیا۔

''ہاں اس سے میری بہت پرانی ملاقات ہے۔ ابھی چھ مہینے پہلے ہی تو پیرس میں ملاقات ہوئی تھی۔''

''چھ مہینے پہلے؟ پیرس میں؟'' میں حیرت زدہ رہ گئی۔ ''آپ غالباً غلط سمجھی ہیں۔ وہ تو شی کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد ہی وفات پا گئی تھیں۔''

''اچھا تو یہ کہانی گھڑی ہے اس نے۔'' انہوں نے اچھا کو کھینچتے ہوئے کہا۔ ''خیر عزت جو رکھنی ہوئی۔''

''تو کیا......'' میں نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''چھوڑو اس قصے کو۔ ہم کیوں کسی کی غیبت کریں۔'' پھر وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔ ''میرا

خیال ہے کہ اب مجھے چلنا چاہیے۔''

میں کافی حیران تھی۔ اتنی اچھی دوستی کے باوجود شی نے مجھ سے غلط بیانی کی تھی۔ آخر وجہ کیا تھی۔ مسز عزیز کا چیپ سسپنس مجھے بہت برا لگتا تھا۔

''تھوڑی دیر ٹھہر جائیں ابھی تو آپ آئی ہیں۔'' میں نے تجسس سے مجبور ہو کر انہیں دوبارہ بیٹھنے کو کہا کیونکہ مجھے علم تھا کہ وہ اگر تھوڑی دیر بیٹھ گئیں تو خود ہی اس راز سے پردہ اٹھا دیں گی۔

''اچھا تم اصرار کرتی ہو تو تھوڑی دیر رک جاتی ہوں۔'' وہ بھی بات میرے کان میں ڈالنے کی خواہش مند تھیں۔ سو رک گئیں۔

''پتا نہیں شی نے مجھ سے غلط بیانی کیوں کی؟'' میں ابھی تک الجھن میں تھی۔

وہ حقارت بھری ہنسی سے بولیں۔ ''کیا کرتی بے چاری جو غلط بیانی نہ کرتی۔ ماں بسی نہیں اپنے گھر میں اور دو مہینے کی بچی کو چھوڑ کر ایک اور سیٹھ کے پاس چلی گئی۔ اس شی کے سارے لچھن ماں والے ہیں۔ بیسیوں لڑکے لگائے ہوئے ہیں اپنے پیچھے جو ٹھنڈی آہیں بھرا کرتے ہیں۔ ماں بھی بالکل ایسی ہی تھی اور تم جانو۔ لڑکے تو ویسے بھی ہتھیلی پہ دل لیے پھرتے ہیں۔ جہاں کسی لڑکی نے ذرا لفٹ دی۔ جھٹ سے اپنے دل کا نذرانہ پیش کر دیا۔ کئی سیٹھوں کو اس کی ماں نے بیک وقت پھنسایا ہوا تھا اپنے چکر میں۔ یہ بھی تو اسی ماں کی بیٹی ہے۔ آخر شادی تو ایسی لڑکیوں کے لیے آڑ ہوتی ہے۔ ماں آئی تھی اس کی.....''

''کوٹھے سے۔'' شی جو نہ جانے کب سے پیچھے کھڑی ہماری گفتگو سن رہی تھی مسز عزیز کی بات کاٹ کر بولی۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ اچانک کیا ہوا شی کا یوں گفتگو سننا شرمندہ کر رہا تھا اور پھر یہ انکشاف..... میرے تو حواس ہی قابو میں نہ رہے۔ کچھ دیر کے لیے تو مسز عزیز بھی سناٹے میں آ گئیں۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ شی ان کی یہ گفتگو سن لے گی۔ پیٹھ پیچھے باتیں کرنے والے ویسے بھی اس قسم کی صورتِ حال سے گھبراتے ہیں۔

''میرا خیال ہے میں اب چلتی ہوں۔'' مسز عزیز ساڑھی کا پلو سنبھالتے ہوئے بولیں۔ ''ویسے بھی کافی دیر ہو چکی ہے۔''

''ارے ابھی سے چل دیں۔'' شی آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ ''آپ کی چٹخارے دار

باتیں تو ابھی شروع ہوئی تھیں۔ سخت افسوس ہوا کہ میرے آ جانے سے آپ کو اپنا بقیہ پروگرام منسوخ کرنا پڑا۔ خیر!''

''تم مجھ پر طنز کرنا چاہتی ہو؟''

''نہیں۔'' وہ بڑے اطمینان سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں اسی طرح حقیقت بیان کر رہی ہوں۔ جیسے آپ کر رہی تھیں۔ فرق صرف نیت کا ہے۔''

''تم انتہائی گستاخ اور زبان دراز لڑکی ہو۔'' اب تک مسز عزیز اپنے آپ پر قابو پا چکی تھیں۔

''واہ آنٹی آپ کو تو تجزیہ نگار ہونا چاہیے تھا۔'' وہ آگے جھک کر کیک پیس اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''آپ نے تو بالکل درست تجزیہ کیا۔ ویسے آپ اپنے فقرے میں اپنی ماں کی طرح کا اضافہ کرنا بھول گئیں۔''

''دیکھا تم نے نازی!'' اب وہ میری جانب مڑیں۔ ''یہ تمہارے گھر میں میری عزت ہو رہی ہے۔''

''نازی بے چاری کا کیا قصور اس میں۔'' شی ابھی تک مطمئن انداز میں بیٹھی تھی۔ ''ویسے آپ کو دیر ہو رہی تھی۔''

''جا رہی ہوں میں سمجھیں تمہارے گھر میں نہیں کھڑی کہ تمہیں تکلیف ہو۔'' یہ کہہ کر وہ پیر پٹختے ہوئے ڈرائنگ روم سے نکل گئیں۔

''یہ تم کیا بت بنی کھڑی ہو نازی۔''

''آئی ایم سوری شی۔'' شرمندگی سے میری پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی۔

''اٹس آل رائٹ۔ حقیقت بہت تلخ ہوتی ہے اور اس حقیقت کے کڑوے گھونٹ میں بچپن سے پیتی آ رہی ہوں۔'' وہ اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر بولی۔

ضبطِ گریہ سے اس کے گلابی رخسار سرخ پڑ چکے تھے۔ کس قدر اطمینان سے اس نے مسز عزیز سے بات کی تھی اور اب ان کے جانے کے بعد کتنی شکستہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس کڑوی حقیقت کو برداشت کرنے کے لیے اس کے اندر ہر لمحے شکست و ریخت ہوتی تھی۔ اس کا اندازہ مجھے آج ہوا۔ نہ جانے میں اس کے احوال سے اس قدر بے خبر کیوں تھی۔ ہر دم ہنستی مسکراتی، سب سے منفرد، کبھی ہار نہ ماننے والی شی کی روح کتنی گھائل تھی۔

''اگر کوئی اور ہوتا نازی تو میں اس پر کبھی اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کی کوشش نہ کرتی۔'' وہ میری طرف خالی خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ''نہ ہی میں اس کی ضرورت محسوس کرتی ہوں۔ لوگوں کا حساب تو بقول فراز وہی ہے کہ ؎

تم نہ ہوتے تو کسی اور کے چرچے ہوتے
خلقت شہر تو کہنے کو فسانے مانگے

سو جس کی عادت فسانے گھڑنے کی ہو اسے کون روک سکتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ میرا کریکٹر کیسا ہے۔ پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ لوگ کیا کہتے ہیں۔''

وہ تھوڑی دیر رکی پھر بولی۔ ''لیکن تمہاری بات مختلف ہے۔ تم میری سب سے اچھی دوست ہو۔ میں نہیں چاہتی کہ تم مجھ سے بدگمان ہو۔ کیا یہ انصاف ہے نازی کہ سزا مجرم کے بجائے اس سے وابستہ لوگوں کو دی جائے لیکن ایسا ہمیشہ ہوتا ہے۔ مجرم خواہ ایک فرد ہو سزا پورے خاندان کو ملتی ہے۔ انگلیاں اٹھائی جاتی ہیں کہ دیکھو یہ قاتل کی ماں ہے۔ اس شخص کا بیٹا چور ہے۔ فلاں لڑکی گھر سے بھاگ گئی تو اس کی دوسری بہن بھی ایسی ہی ہو گی۔ یہ کہاں کا انصاف ہے نازی' لیکن میں یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لیتی ہوں کہ ایک دن جب سب جہانوں کا سب سے بڑا منصف انصاف کرے گا تو ہر شخص کے ہاتھ میں اس کا اپنا نامہ اعمال ہوگا۔ پھر اگر آذر بت تراش ہوا تو اس کے کیے کی سزا ابراہیم کو نہیں دی جائے گی۔

''چھوڑو اس قصے کو شی۔ تم مجھے بڑی ڈسٹرب لگ رہی ہو۔''

''بولنے دو مجھے آج' میں سب کچھ کہہ دینا چاہتی ہوں۔ وہ سب کچھ جو اندر ہی اندر میری روح کو گھن کی طرح چاٹ رہا ہے۔'' وہ نڈھال سی لگ رہی تھی۔ ''پتا ہے نازی! معاشرے سے ٹکرانے کی ہمت ہر کسی میں نہیں ہوتی۔ ایسے ہی لوگوں میں سے ایک میرے پاپا بھی تھے۔ کسی کمزور جذباتی لمحے میں انہوں نے..... میری ممی کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا اور پھر دونوں اس جذباتی لمحے کے اسیر ہو گئے۔ جب پاپا نے اس کورٹ میرج سے اپنے والدین کو آگاہ کیا تو وہ جو اپنے اکلوتے بیٹے کے سہرے کے خواب نہ جانے کب سے دیکھ رہے تھے۔ سناٹے میں آ گئے۔ اتنے عزت دار گھرانے کی بہو کوٹھے سے آئی ہوئی عورت ہو۔ یہ کیسے برداشت کیا جا سکتا تھا۔ پھر ماں باپ نے بیٹے کو کتنے ہی واسطے دے ڈالے اور..... اور وہ کمزور سا جذباتی لمحہ گزر گیا۔ اس کے بعد پشیمانی کا دور شروع ہوا اور میری ماں کو..... جو نیک

زندگی گزارنے کی خواہش لے کر پیا دیس آئی تھی' جو اپنے اندر کی نیکی اور اخلاق سے سب کے دل جیتنا چاہتی تھی۔ طلاق کے تین لفظوں نے ویسا ہی کر دیا جیسے خوب صورت پتنگ آکاش کی بلندیوں پر جانے کے بجائے کٹ کر فضا ہی میں ڈولنے لگے۔ پھر اس سے پہلے کہ یہ کٹی پتنگ زمین پر گر کر مٹی میں مل جاتی۔ ایک بہت مضبوط شخص نے اسے سنبھال لیا۔

''نازی اگر میری ممی اچھے کردار کی نہ ہوتیں تو کیا اب تک وہ انکل ناصر کے ساتھ گزارہ کر سکتی تھیں۔ پیرس میں ویسے بھی بہت سی ترغیبات ہیں۔ وہ کچھ بھی کر سکتی ہیں لیکن وہ آج تک اپنے شوہر کے ساتھ مخلص ہیں اور اپنے چار بچوں کے ساتھ مطمئن زندگی گزار رہی ہیں۔''

تھوڑی دیر تک ہم دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے پھر وہ بولی۔ ''میں نے بچپن سے ہی اپنے اردگرد طنز اور تحقیر آمیز ہنسی کی آوازیں سنی ہیں۔ زیادہ ہوا تو بڑی بوڑھیوں کی سرد آہیں جو وہ جان بوجھ کر مجھے سنانے کو بھرا کرتی تھیں۔ ہر جگہ ہر مقام پر دبی دبی سرگوشیاں ہلکی ہلکی ہنسی..... ان سب باتوں نے میرے اندر آگ بھر دی تھی۔ مجھے ان سب لوگوں سے نفرت ہو گئی۔ جو دنیا کے تمام غلط کام کرنے کے باوجود بھی عزت داری کا تمغہ سینے پر سجائے رکھتے ہیں۔ میں نے خود سے وعدہ کیا کہ میں ان سب لوگوں سے الگ منفرد اور کبھی ہار نہ ماننے والی لڑکی بنوں گی۔ پاپا نے میرے اندر کی شکست و ریخت دیکھتے ہوئے مجھے ملک سے باہر بھجوا دیا۔ میں سوئس اسکول میں پڑھتی رہی۔ میں نے ہمیشہ سخت محنت کی تاکہ اپنے آپ سے کیے ہوئے عہد کو ایفا کرتی رہوں۔ میری سخت محنت کے باعث کامیابیاں میرے قدم چومتی رہیں۔ لیکن میری فردِ جرم میں میرا پہلا اور آخری جرم ہمیشہ میری ماں کا حوالہ رہا۔''

''تم نے یہ سب کچھ مجھے پہلے کیوں نہ بتایا۔'' شکوہ آخر کار میرے لبوں پر آ ہی گیا۔ 'کیا میرا تمہارا کوئی تعلق نہ تھا؟''

''تعلق ہے۔'' اس نے زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اسی سبب تو وہ سب باتیں تمہیں بتا دیں جو آج سے پہلے میں نے صرف اپنی تنہائیوں سے کی تھیں۔ میرے لیے یہ موضوع بہت تکلیف دہ ہے۔ پھر جس ماں کا میں نے لمس تک محسوس نہ کیا' اس کے متعلق میرے پاس کہنے کو تھا ہی کیا۔''

''تمہارے پاپا کی تمہاری ممی سے ملاقات کیسے ہوئی؟'' بہت دیر سے جو سوال میرے

ذہن میں چل رہا تھا۔ آخر کار میرے لبوں پر آ ہی گیا۔

''یہ سوال میرے پاپا سے کسی نے نہیں کیا۔'' وہ تلخی سے ہنس دی۔ ''بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ کسی نے یہ سوال پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ امیر زادوں میں بچپنا تو پایا ہی جاتا ہے۔ خواہ ... پچاس برس کے ہی ہو جائیں۔ ممی اپنے ٹھکانے سے نہیں نکلتی تھیں۔ پھر ظاہر ہے پاپا ہی وہاں گئے ہوں گے۔ ان سب باتوں کے باوجود بھی میری دادی یہی کہتی رہیں کہ ممی نے پاپا پر ڈورے ڈالے تھے۔''

''تمہارے پاپا تو بہت اچھے ہیں شی۔ بہت مخلص اور بہت شفیق۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ وہ ممی کو چاہتے تھے۔ لیکن معاشرے سے، اپنے آپ سے اور اپنی خاندانی اقدار سے لڑنے کا حوصلہ ان میں نہیں تھا۔ وہ اب بھی ممی کو چاہتے ہیں لیکن اس کے باوجود قصوروار بھی ان کی نظروں میں ممی ہی ہیں۔'' وہ آج اپنے پاپا کی شخصیت بھی پرت در پرت کھول رہی تھی۔

''انسانی شخصیت میں بہت سے تضادات ہوتے ہیں نازی اور یہی پاپا کے ساتھ بھی ہے۔ ان کے نظریات ایسے ہیں جنہیں عقل تسلیم نہیں کرتی لیکن وہ پھر بھی اپنے نظریات پر قائم ہیں۔ وہ ممی کو آج بھی بہت چاہتے ہیں۔ ممی کے بعد ان کی زندگی میں کوئی دوسری عورت نہیں آئی لیکن اگر دوبارہ موقع ملے تو وہ ممی کو کبھی بھی اپنے گھر نہ بسائیں۔ البتہ میرے ساتھ سب کے ساتھ وہ بہت اچھا رویہ رکھتے ہیں۔ میں ان کی شخصیت کو شاید کبھی سمجھ نہ پاؤں۔''

''میرا خیال ہے، ہمیں اس ٹاپک کو مزید ڈسکس نہیں کرنا چاہیے۔ چلو کوئی اچھی بات کریں۔''

''اچھی بات یہ ہے کہ میں تمہیں شادی کا کارڈ دینے آئی تھی۔'' وہ اپنے آپ پر مکمل طور پر قابو پا چکی تھی۔ اسے اپنے جذبات پر بہت کنٹرول تھا۔

''بہت مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ کرے کہ تم ہمیشہ خوش و خرم زندگی بسر کرو۔'' میں نے خلوص دل سے دعا کی۔

''آج تم ادھر کی راہ کیسے بھول پڑیں۔'' ممی نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔ وہ شاید ابھی ہی شاپنگ سے واپس آئی تھیں۔

''میری شادی ہو رہی ہے پندرہ تاریخ کو۔'' وہ شگفتگی سے بولی۔ ''اسی کا کارڈ دینے

آئی تھی۔''

''تمہاری شادی؟'' ممی نے حیرت سے کہا۔

''کیا یہ اتنی ہی حیرانگی کی بات ہے؟'' شی بولی۔

''اوہ نہیں، بہت مبارک ہو۔'' ممی جلدی سے بولیں۔ ''ویسے کس کے ساتھ ہو رہی ہے؟''

''سب کچھ اسی میں لکھا ہوا ہے۔'' اس نے کارڈ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں کچھ جلدی میں ہوں اس لیے چلوں گی۔ آپ لوگ ضرور آئیں۔''

''کیوں نہیں، ہم ضرور آئیں گے۔'' ممی نے کہا۔

''حیرت ہے، ایسی چلتی پرزہ سے شادی کون کر رہا ہے۔'' ممی اس کے جانے کے بعد بولیں۔ ''پتا نہیں لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ خاندانی پس منظر تک نہیں دیکھتے اور کیوں دیکھیں ... آنکھوں پر دولت کی چربی جو چڑھ جاتی ہے۔''

پھر بہت بے قراری سے میں نے یہ چند دن گزارے۔ دل چاہتا تھا کہ جلدی سے رسموں کے دن قریب آ جائیں۔ خدا خدا کر کے مہندی کا دن آن پہنچا۔ میں نے بہت چاؤ سے اپنے لیے کپڑوں کا انتخاب کیا۔ آخر میری سب سے پیاری سہیلی کی شادی تھی۔ میں نے شوخ گلابی اور گہرے سبز رنگ کا حیدر آبادی لباس پہنا۔ مغل طرز کے خوب صورت زیورات سے آراستہ ہو کر اور فلر ہیڈ سے تیار ہو کر جب میں چلنے لگی تو نوفل کی آنکھوں میں ستائش کی چمک لہرائی۔

ان کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں

نوفل کے منہ سے یہ شعر سن کر میں دو سال پیچھے چلی گئی۔ اس کی زندگی میں آ کر میں نے پہلی مرتبہ اسی کے منہ سے یہ شعر حجلۂ عروسی میں سنا تھا۔ تب اتنے خوبصورت اور انوکھے انداز میں تعریف سننے پر میرے چہرے پہ دھنک کے تمام رنگ بکھر گئے تھے۔ یوں محسوس ہوا تھا گویا میرے پاؤں کے نیچے نرم نرم پھول بکھرے ہیں اور میں ان کی تمام تر تازگی اور خوشبو اپنے وجود میں سمیٹ لینا چاہتی تھی لیکن یہ سب کچھ کتنا عارضی اور سطحی تھا۔ میں جنہیں پھول سمجھی تھی وہ تو انگارے تھے۔ جنہوں نے میرے پاؤں تو کیا پورے وجود کو جلا کر راکھ کر دیا تھا

اور میں آبلہ پا لشکروں کے گروہ کا میر کارواں جانتے ہوئے ان کے سہارے چلی جارہی تھی۔

"کس سوچ میں گم ہو گئیں؟" نوفل آج اچھے موڈ میں لگ رہا تھا۔

"سوچ رہی تھی فیض کے شعر تو مجسم سچائی ہوتے ہیں۔"

"کیا یہ سچائی نہیں ہے؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

"تمہارا سچ بہت کڑوا ہوتا ہے۔ اس شعر کی چاشنی تمہارے ساتھ جچتی نہیں۔" میرے اندر کی لڑکی بہت عرصہ بعد انگڑائی لے کر اٹھنے لگی تھی۔

"مجھے ہمیشہ تم سے محبت رہی ہے نازی۔ میں تم سے شدت سے محبت کرتا ہوں۔"

"تصحیح کرلو۔ مجھ سے نہیں، تمہیں میری خوبصورتی سے محبت ہے۔ شدید نہیں شدید تر۔"

"تم نہیں کہیں میری محبت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتی ہو۔"

"کاش ویسا ہی ہوتا جیسا تم کہہ رہے ہو۔ زندگی میرے لیے بہت سہل ہو جاتی۔"

"میں نے سوچا تھا کہ اب تمہاری اپروچ پریکٹیکل ہو چکی ہو گی لیکن تم تو اب بھی افسانوں کی دنیا میں رہنے والی لڑکی ہو۔"

گاڑی کے ہارن نے ہماری باتوں کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس وقت میرے ذہن میں بہت سے خیالات گردش کر رہے تھے لیکن میں نے سب خیالات کو جھٹک دیا۔ میں شی کی مہندی میں فریش ہو کر جانا چاہتی تھی۔ مہندی اور شادی کی تقریبات کا اہتمام گھر میں ہی کیا گیا تھا۔ دور سے ہی رنگ برنگے قمقمے نظر آنے لگے۔ گیٹ میں داخل ہوتے ہی یوں لگا گویا رنگ و نور کا سیلاب امڈتا آ رہا ہے۔ مہمانوں کی اکثریت کو میں جانتی تھی لیکن یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ مہمانوں میں اماں اور ابا بھی موجود تھے۔

"اماں آپ؟ یہاں کیسے؟"

"تیری دوست میری بیٹی ہوئی نا۔" اماں بولیں۔

نہ جانے شی کے بارے میں اماں کے خیالات میں اس قدر تبدیلی کب آئی تھی۔

آج کے دن شی بہت خوش تھی۔

"مجھے یقین ہے نازی! ہم دونوں بہت خوش رہیں گے۔" اس نے کہا تھا۔

میں نے بھی اس کے لیے ڈھیر ساری پُرخلوص دعائیں مانگی تھیں۔ ڈیپارٹمنٹ کے تقریباً تمام طلبا بھی تقریب میں موجود تھے۔ ایک طرف [illegible]

تھی تو دوسری جانب ہر دل عزیز پروفیسر۔ ہم سب لڑکے لڑکیوں نے خوب گانے گائے اور سر تقوی اور باقی پروفیسرز پر خاص طور پر تیار کیے ہوئے گانے گائے تو سب ہی بہت لطف اندوز ہوئے۔ اس کی ساس اور نندوں کو بھی نہیں بخشا۔ مہندی کی رسم بھی بہت پُرلطف رہی۔ کھانا کھانے کے لیے جب ہم ڈائننگ ہال میں پہنچے تو میں ابا' اماں کی طرف بڑھی۔

"دیکھ لیا تم نے آمنہ کے ابا۔ ہماری نازو کس قدر خوش ہے اپنے گھر میں۔" اماں کی بات نے میرے بڑھتے قدم وہیں منجمد کر دیے۔ "اگر اس دن میں اسے واپس اس کے گھر نہ بھیج دیتی تو یہ آج اس قدر خوش کہاں ہوتی۔ اور پھر ہم بھی تو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔ راج کر رہی ہے ہماری بیٹی سونے سے پیلا کر رکھا ہے سسرال والوں نے۔" ابا بولے۔

"کبھی کبھی دل بہت اداس ہو جاتا ہے۔ آج پورے پونے دو برس بعد دیکھا ہے اسے۔" اماں نے اداسی سے کہا۔

"دل چھوٹا نہ کرو۔ ہمیں خوش ہونا چاہیے کہ ہماری بیٹی خوش ہے۔ بے شک نہ ملا کرے ہم سے۔ میں کم از کم ایک بیٹی کی طرف سے مطمئن ہوں۔ اگر اس کی بھی شادی نہ ہوئی ہوتی تو شاید مجھے قبر میں بھی چین نصیب نہ ہوتا۔"

"مجھے تو باقیوں کی فکر کھائے جاتی ہے۔"

"سب ٹھیک ہو گا۔ اللہ تعالیٰ پہ بھروسہ رکھو۔"

مجھ میں مزید سننے کی تاب نہ تھی اس لیے میں الٹے قدموں لوٹ آئی۔ خوف میرے اندر ہی اندر کہیں سرائیت کر گیا۔ پھر وہی زمانے کا خوف۔ لوگوں کا خوف۔ عزتوں کے نام نہاد معیار کا خوف۔ ماں باپ کا سر جھک جانے کا خوف۔ کس کس خوف سے پیچھا چھڑاتی۔ کس دامن میں پناہ ڈھونڈتی کہ یہاں تو سب ہی کے دامن تنگ تھے۔ کس کے کاندھے پہ دو گھڑی سر ٹکا کے دل کا غبار نکالتی کہ یہاں تو سبھی کے کاندھے اپنے اپنے بوجھ سے جھکے ہوئے تھے۔ کیا واقعی اس دن اماں نے مجھے واپس بھیج کر اچھا کیا تھا؟ کیا میں اپنے گھر میں راج کر رہی تھی؟ کیا میں خوش تھی؟

سوالات جونک کی طرح میرے دماغ کی رگ رگ سے چمٹے ہوئے تھے لیکن ان کا

جواب میرے پاس نہیں تھا۔ ہاں اس کا جواب ہمارے موجودہ معاشرے کے پاس تھا۔ میرا معاشرہ کہتا تھا کہ ہر حال میں شوہر کی خدمت کرو۔ چاہے دل ٹوٹ جائے۔ روح گھائل ہو جائے۔ اُف تک نہ کرو کہ تمہارا مقام بہرحال تمہارے شوہر کا گھر ہے۔ اس گھر سے باہر نکلنے کی سزا بہت کڑی ہے۔ یہی تمہاری پناہ ہے۔ اس پناہ کو چھوڑ کر جاؤ گی تو چاروں طرف سے بھیڑیئے دبوچ لیں گے۔ بوٹی بوٹی کر دیں گے۔ چاروں طرف سے پتھراؤ ہوگا اور کہیں امان نصیب نہ ہوگی۔ وہ جیسا بھی ہے شوہر ہے تمہارا، تمہارا محافظ۔ تمہارے سر کا سائیں' تمہارے آنچل کے تقدس کی حفاظت کرنے والا۔ اپنے معاشرے کا جواب سن کر میرے اندر کی لڑکی پھر مرگئی۔

''چلیں گھر؟'' نوفل نے مجھے خیالات کے بھنور سے نکالا۔

''ہوں' چلو۔''

''کارویل سے آئس کریم کھاتے ہوئے چلیں گے۔'' نوفل بولا۔

''جیسے تمہاری مرضی۔''

''تمہاری اپنی بھی کوئی مرضی ہے؟''

''نہیں..... نہ ہے نہ تھی اور شاید کبھی ہوگی بھی نہیں۔''

''میں دیکھ رہا ہوں کہ تم سوچنے بہت لگی ہو۔''

''اس پر بھی اختیار نہیں ہے میرا؟''

''مجھ سے ناراض ہو کیا؟'' وہ تشویش سے بولا۔

''تم سے ناراض ہو کر کہاں جاؤں گی۔'' میرا لہجہ جذبات سے عاری تھا۔

''تم یقیناً ناراض ہو'' وہ بولا۔ ''شاید آج اپنے والدین سے مل کر تمہارے یہ احساسات ہوئے ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ تم بہت عرصہ سے اپنے والدین سے نہیں مل سکیں لیکن یہ بھی تو سوچو نا کہ ہمارا اسٹیٹس اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ سیٹھ شہاب الدین کی بہو اندرونِ شہر کی تنگ و تاریک گلیوں میں جائے۔ ایسے شخص کی بہو جس کا بزنس پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔''

''میں انہی تنگ و تاریک گلیوں سے یہاں آئی ہوں نوفل۔''

''ہاں کبھی گدڑی سے بھی لعل مل جاتے ہیں لیکن پھر ان کی حفاظت کی جاتی ہے' نہیں

سنوارا جاتا ہے نہ کہ واپس وہیں پھینک دیا جاتا ہے۔'' وہ بولا ''میرا تمہارا نظریاتی اختلاف ضرور ہے لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ اب تمہیں اس بات میں بھی شک ہے کہ میں روزِ اول کی طرح آج بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔''

مکڑی نے پہلے جال بُنا میرے گرد پھر
مونس بنی' رفیق بنی' پاسباں بنی

میں فقط سوچ کر رہ گئی۔ بول نہ سکتی تھی کہ زبان تو میں نے ڈیفنس کے چھ کنال کے رقبے میں پھیلے ہوئے بنگلے میں داخل ہونے کے عوض رہن رکھوا دی تھی۔

اگلے دن شادی پر بھی بہت ہنگامہ ہوا۔ دلہن کی سب سے قریبی سہیلی ہونے کے باعث میں نے تقریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آتشی گلابی کامدار لہنگے میں لمبے بالوں کی خوبصورت سی چوٹی بنائے' بالوں میں گجرے لگائے میں سب کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ شی کی کوئی بہن تو تھی نہیں۔ میں نے ہی سب رسمیں پوری کیں۔ وہ دلہن بنی اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ بے اختیار اس کی طرف نگاہیں اٹھتی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح خوب صورت اور منفرد۔ آج سے قبل میں نے اسے کبھی اتنے نارمل طریقے سے ڈریس اَپ ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے ہر انداز میں نفاست اور بے پروائی کا حسین امتزاج ہوتا تھا۔ ہلکے ہلکے بکھرے بال جو اکثر ربن کی قید سے آزاد ہو کر اس کی پیشانی چھوتے رہتے تھے۔ آج بہت نفیس جوڑے کی شکل میں بندھے ہوئے تھے..... سر پہ خوبصورت کام والا بڑا سا دوپٹہ' ماتھے پہ چمکتی ہوئی بندیا۔ ناک میں پڑی ہیرے کی لونگ کی جگہ خوبصورت نازک سی سونے کی نتھ اور آنکھوں میں آنے والے دنوں کے دھنک رنگ خواب۔ میں نے بے اختیار اس کی پیشانی چوم لی۔

''مجھ سے تو بالکل چلا نہیں جا رہا۔ پاؤں لہنگے میں پھنس رہے ہیں۔'' میں اسے مہمانوں کے بیچ لے کر جا رہی تھی تو اس نے سرگوشی کی۔ اسے عادت جو تھی نہیں ایسے لباس کی۔

''کچھ نہیں ہوتا احتیاط سے چلو۔'' میں بولی۔

اسے صوفے پر بٹھانے کے بعد سرنقوی کو بھی اس کے ساتھ بٹھایا گیا۔ رسمیں شروع ہوئیں۔ آرسی مصحف کے وقت میں نے بیگ سے چھوٹا میک اَپ مرر نکالا۔

''یہ ٹھیک رہے گا۔'' میں نے اسے فضا میں لہراتے ہوئے کہا۔

"نازی آج اپنا بدلہ لے رہی ہے۔" لیلیٰ نے خبردار کیا۔

مجھے یاد آیا شی نے میری شادی پر یہی کیا تھا۔ میں شگفتگی سے ہنس دی۔

"اس میں بھلا انہیں دکھائی کیا دے گا۔" سرنقوی کے ایک دوست نے کہا۔

"کچھ نہیں' اس میں ناک سما جائے گی۔" میں نے کہا اور سب ہنس پڑے۔

"آج نازی شی کے سب حساب بے باق کرنے کے چکر میں ہے۔" اظفر بولا۔

یونہی ہنستے کھیلتے سب رسمیں پوری کی گئیں رخصتی کے سمے میں نے شی کی آنکھوں میں دیکھا۔ ان میں اداسی کے سوا کچھ نہ تھا۔

"کاش آج ممی میرے پاس ہوتیں نازی۔" کہنے کو تو یہ ایک فقرہ تھا لیکن اس میں کتنا کرب تھا' میرا دل کٹ سا گیا۔

"وہ کہیں بھی ہوں شی' تم ان کی دعاؤں میں ہمیشہ ان کے ساتھ ہو گی۔" میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

اس کے بعد وہ اس موضوع پر کچھ نہ بولی۔ کتنا ضبط کیا تھا اس نے' میں ہی جانتی تھی۔ وہ اپنے دکھ کسی پر ظاہر نہ کرتی تھی۔ یہ دکھ تو اس کا سرمایہ تھے اور سرمایہ خواہ کیسا ہوا سے تقسیم کرنا آسان نہیں ہوتا۔ آخر جب وہ رخصت ہو گئی تو ہم بھی گھر کی طرف چل دیئے۔

"یاد ہے نازی! ہم سب طلبا نے اپنے سے عہد کیا تھا کہ جہیز کا لین دین بالکل نہیں کریں گے۔" نوفل ڈرائیونگ کرتا ہوا بولا۔

"یاد ہے۔" میں نے مختصراً کہا۔

"لوگوں کا کوئی دین' ایمان' کوئی ظرف نہیں ہوتا۔ اب شی کو دیکھو کیسے سونے میں پیلا کر کے سسرال بھیجا ہے اور لباسِ عروسی کس قدر مہنگا تھا۔"

میں چپ رہی اور نوفل سے اس کے ظرف کے متعلق کچھ نہ کہہ سکی۔ تھوڑی دیر بعد وہ خود ہی بولا۔ "پیچھے سے سرنقوی نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے ابا کہیں چپڑاسی تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ سر بہت زیادہ پڑھیں لکھیں' لیکن ایک دن وہ ٹریفک کے حادثے کا شکار ہو گئے۔ سر کی والدہ نے کپڑوں کی سلائی کر کے انہیں پڑھایا اور پھر وہ حکومت کی طرف سے ہی اسکالرشپ پر امریکہ چلے گئے۔ پڑھ لکھ تو انہوں نے لیا ہی ہے لیکن اپنے گھر والوں سے وہ نچلے طبقے کی چھاپ نہیں اتار سکے۔"

"پتا نہیں شی کیسے گزارا کرے گی ان لوگوں کے ساتھ؟"

"ہاں کرے گی اگر سسرال والوں نے کبھی اپنی زبان نہ کھولی اور ظاہر ہے ان کی زبانیں با آسانی دولت سے بند ہو جائیں گی۔ نچلے طبقے کے سسرال کا منہ بند کرنے کے لیے تو انکل کی دولت کا ایک چھوٹا سا حصہ بھی کافی ہوتا۔ یہاں تو معاملہ ہی اکلوتی بیٹی کا ہے' سب کچھ شی کا ہی تو ہے۔"

پھر بہت سے دن یونہی بے کیفی کے عالم میں گزر گئے۔ صبح شام کی وہی روٹین تھی کہ ایک دن اچانک ہی گویا دھماکہ ہوا۔ میں کمرے میں وی سی آر پر ایک معلوماتی پروگرام دیکھ رہی تھی اور خادمہ میرے کپڑے وارڈ روب میں لٹکا رہی تھی اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ خادمہ نے فون ریسیو کیا اور مجھے بتایا کہ میرا فون ہے۔

"نازو! فوراً اپنے میکے پہنچو۔" دوسری طرف ہمارے پڑوسی حبیب بھائی بول رہے تھے۔

"خیریت تو ہے حبیب بھائی۔" میں ایک دم گھبرا گئی۔ "ابا اور اماں تو ٹھیک ہیں ناں۔"

"سب ٹھیک ہے۔ اگر تم جلدی آ سکو تو آ جاؤ۔"

"آپ کچھ چھپا رہے ہیں۔"

"وہ اصل میں۔" ان سے بات ٹھیک سے شروع نہیں ہو رہی تھی۔ "آمنہ کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔"

"کیا؟" میں اس سے آگے کچھ نہ بول سکی۔

ہونی کو کون ٹال سکتا تھا اور پھر اس صورت میں کہ آمنہ آپا خود بھی اسے انہونی بنانا نہیں چاہتی تھیں۔ انہوں نے کبھی گھر والوں کو اپنے ٹی بی میں مبتلا ہونے کے بارے میں ہوا تک نہیں لگنے دی تھی۔ کبھی بیمار ہو بھی گئیں تب بھی کسی کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ ان کی بیماری کے متعلق جاننے کی کوشش کرتا۔

"خود ہی ٹھیک ہو جائے گا یہ بخار وغیرہ۔" اماں کڑک دار آواز میں کہتیں۔ "سب جانتی ہوں میں کہ بخار کیوں ہوتا ہے روز روز۔"

اس کے علاوہ آپا کے حصے کے کام بھی روز نمٹ جاتے تھے اس لیے کون پروا کرتا۔

"آپا کہتی تھیں کہ اماں کے طعنے میرا کلیجہ چھلنی کر جاتے ہیں۔" ریحانہ مسلسل رو رہی تھی۔ "راتوں کو پہروں اکیلے بیٹھ کر سسکا کرتی تھیں۔"

"تم بہت اچھی رہیں نازو! اپنے گھر میں سکون سے تو ہو۔" یاسمین باجی بولیں۔ "یہاں تو ہم ایک۔ لمحے کے سکون کے لیے ترس گئے ہیں۔ آمنہ آپا کو تو اماں کے طعنے مار گئے۔"

قل پر اماں رشتہ دار خواتین سے کہہ رہی تھیں۔ "بہن اولاد تو اپنی ہے' دکھ کسے نہیں ہوتا لیکن میں شکر کرتی ہوں کہ اللہ نے عزت سے ایک اور بوجھ کم کر دیا۔"

"میں تو کہتی ہوں بہن اب یاسمین اور نورین کی عمریں بھی گزر گئی ہیں۔ خیر سے پروین کے لیے کچھ کرو۔ اگر بڑی بیٹیوں کا ہی سوچتی رہیں ناں تو باقی سب کی بھی عمریں گزر جائیں گی۔"

"میں تو اب بالکل تھک گئی ہوں۔" اماں آہ بھرتے ہوئے بولیں۔ "کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان لڑکیوں کا کیا بنے گا۔ اگر نوید ہوتا تو آج باپ کا سہارا بنتا۔"

"اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو اللہ نے باقی سب بہنوں کے اچھے نصیب بھی اسی ایک نازو کی جھولی میں ڈال دیے ہیں۔"

"یہ اپنی یاسمین چھبیس برس کی ہو گی ناں۔" خالہ بشیراں نے بہت رازداری سے پوچھا۔

"ہاں آپا اتنی تو ہو گی پر بے چاری کے نصیب۔" ان کی چھوٹی بہن بولی۔

"ایک لڑکا ہے میری نظر میں۔" انہوں نے پھر رازداری سے کہا۔

ان کی یہ بات سن کر پاس بیٹھی سیپارہ پڑھنے والی خواتین بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"کون ہے؟ کیا کرتا ہے؟" اماں جھٹ سے آگے ہو کر بیٹھ گئیں۔

"ریگل پر چاٹ کی ریڑھی لگاتا ہے۔ اپنے یوسف بھائی کا پتر ہے۔ لاکھوں میں ایک ہے۔ ماں باپ کا فرمانبردار اتنا ہے کہ جو کماتا ہے لا کر ماں کی ہتھیلی پر رکھ دیتا ہے ایسا لڑکا آج کے دور میں ملنا تو بہت مشکل ہے۔"

"خالہ کچھ تو خدا کا خوف کرو۔" یاسمین باجی تلخی سے بولیں۔ "ابھی تین دن ہوئے ہیں میری بہن کا جنازہ یہاں سے اٹھا ہے اور تم شادی کی بات لے کر بیٹھ گئیں۔"

"اے حمیدہ! کس قدر گستاخ لڑکی ہے تیری۔" خالہ چمک کر بولیں۔ "اپنی شادی کے معاملے میں کیسے پھٹ سے بول رہی ہے۔ اتنی ڈھیل دے رکھی ہے تو نے کہ بڑے چھوٹے کا کوئی لحاظ نہیں بس بولے جا رہی ہے۔"

"میں بولوں گی اور ضرور بولوں گی۔" یاسمین باجی نے پٹاخ سے جواب دیا۔ "جو نہیں بدلتے ان کا حشر وہ ہوتا ہے جو آمنہ آپا کا ہوا اور مجھے ابھی مرنا نہیں ہے۔"

"ہائے۔ ہائے۔" خالہ نے کلیجے پیٹ ڈالے۔ "حمیدہ سنبھال اسے ذرا اور ڈھیل دی تو قابو میں نہیں رہے گی۔ تیری لڑکی۔"

"چل دفعہ ہو ادھر سے نامراد! ذرا شرم نہیں آئی ایسے پٹاخ پٹاخ بولتے۔" اس سے پہلے کہ یاسمین باجی کچھ کہتیں کہ اماں نے انہیں دو جوتے جڑ دیئے۔

یہ سب کچھ میرے لیے نیا نہیں تھا' لیکن اب یہ سمع خراشی میری برداشت سے باہر ہو گئی تھی۔

"اماں! میں اب چلتی ہوں۔"

"ارے میری رانی اتنے عرصے بعد تجھ سے ملاقات ہوئی اور تُو ہے کہ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہے۔" اماں مجھے چمکار کر بولیں۔

"جانے دے اسے حمیدہ!" ابا صرف اسی قدر بولے۔

وہ اماں کو ہمیشہ آمنہ کی ماں کہہ کر پکارتے تھے۔ آج ان کے منہ سے حمیدہ بہت نیا لگ رہا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور میں جھپاک سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

آمنہ آپا کی وفات نے میرے اندر عجیب ہلچل سی مچا دی تھی۔ اس بات کا فیصلہ کرنا میرے لیے مشکل تھا کہ میں خوش ہوں یا افسردہ۔ سوچ کی انہی لہروں نے مجھے بیمار کر دیا۔ ڈاکٹر نے مجھے وہی مشورہ دیا جو اکثر اوقات وہ امیر گھرانوں کی خواتین کو دیتے رہتے ہیں۔ یعنی آب و ہوا کی تبدیلی کی خاطر سوئٹزرلینڈ جانے کا مشورہ۔

"اچھا ہے' کچھ دن باہر گزار آؤ۔" پاپا نے سوپ پیتے ہوئے کہا۔ "صحت گر رہی ہے تمہاری اور چہرہ بھی پیلا پڑ گیا ہے۔"

"اور چونکہ سوشلائزنگ تمہیں ہی کرنی ہوتی ہے' اس لیے تمہاری صحت ٹھیک ہونی چاہیے۔" ممی نے بھی پاپا کی تائید کی۔

چند دن بعد میں نوفل کے ہمراہ یورپ کے ٹور پر نکل گئی۔

"آج ہماری شادی کو ساڑھے تین سال کا عرصہ گزر گیا ہے۔" بحیرہ روم کے نیلے پانیوں کے اوپر سفر کرتے ہوئے نوفل مجھ سے بولا۔ "لیکن پہلے پڑھائی اور پھر بزنس نے

ہمیشہ مجھے باندھے رکھا۔ اب یہ چھ مہینے ہم بھرپور طریقے سے گزاریں گے۔"

"جی۔" میں نے مختصراً کہا۔

"ہم دونوں مل کر نیپلز کے گلاب چنیں گے۔ ہالینڈ کے ٹیولپ اکٹھے کریں گے۔ نیلی جھیلوں کے دیس فن لینڈ میں مل کر خوبصورت سپنے دیکھیں گے اور۔" نوفل کہتا جا رہا تھا۔ "اور اپنے اس سفر کی یادگار کے طور پر میں...... پیرس سے ایک نہایت خوبصورت ہیروں کا سیٹ تمہیں تحفتاً دوں گا۔"

"کیا سوچ رہی ہو؟" میری خاموشی پر وہ پھر بولا۔

"سوچتی ہوں کہ پریکٹیکل لائف انسان کو بہت بدل دیتی ہے۔"

"مثلاً مجھ میں کیا بدلا ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"اچھا یا برا جو بھی ہو پہلے تم کھرے تھے۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "لیکن اب ڈپلومیٹ ہو گئے ہو۔ کونین کو شکر میں لپیٹ کر دینے والے۔"

"میں سمجھ رہا ہوں تمہاری بات۔" اس نے ہنکارا بھرا۔ "تم بہت آئیڈیلسٹ ہو نازی۔ تم جس ماحول سے آئی ہو اس میں یہ سب باتیں جن کی طرف تم نے اشارا کیا ہے نامناسب بلکہ معیوب سمجھی جاتی ہیں لیکن جس ماحول میں ہم رہتے ہیں اس کے تقاضے مختلف ہیں سمجھ رہی ہو نا میری بات۔"

"میں نے شکوہ نہیں کیا تھا۔ تم نے جو پوچھا تھا سچ سچ بتا دیا ہے مجھے کونین کو ویسے نگلنا پڑے یا شکر میں لپیٹ کر۔ اس کی تاثیر تو ویسی ہی ہو گی ناں۔ ویسے بھی جب سمجھوتا کر ہی لیا جائے تو شوگر کوٹڈ ہو یا نہ ہو فرق کیا پڑتا ہے۔"

"کافی تلخ ہو رہی ہو۔" پھر وہ قدرے توقف سے بولا۔ "میں نے ہمیشہ تم سے شدید محبت کی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ تمہیں کبھی یقین نہیں آیا لیکن یہ سچ ہے۔ مجھ میں یا یوں کہہ لو کہ ہماری کلاس میں اور جس کلاس سے تم آئی ہو۔ دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ وہاں عورت کو محکوم بنا کر رکھا گیا ہے۔ تنگ نظر ہوتے ہیں وہ لوگ اور اپنی تنگ نظری کی دلیلیں بھی ہیں ان کے پاس جبکہ ہماری کلاس کے لوگ روشن خیال ہیں۔ بیوی کو خواہ مخواہ اپنی ملکیت نہیں سمجھتے۔ اگر وہ کہیں کسی کے ساتھ ہنس بول لے تو برا نہیں مانتے اور نہ ہی اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہمیں اپنی بیویوں سے محبت نہیں۔ ہم سب اپنی بیویوں سے محبت کرتے ہیں۔"

میں تلخی سے ہنس دی۔

"کیا زبردست طریقے سے واضح کیا ہے تم نے تنگ نظری اور روشن خیالی اور محکومیت اور ملکیت کو۔ اتنے ہی روشن خیال ہوتے تم تو مجھے انکار کا حق ہوتا۔ اگر میں تمہاری ملکیت نہ ہوتی تو تمہارے اشارے پر ایک سے دوسرے مرد کی بانہوں میں نہ جھولتی اور اگر تمہیں مجھ سے محبت ہوتی تو تم دوسروں کی بیویوں کو اپنی بانہوں میں نہ تھامتے۔ تمہارے محبت، ملکیت اور روشن خیالی کے پیمانے میرے پیمانوں سے مطابقت نہیں رکھتے۔"

"تم شاید کبھی میرا یقین نہ کر سکو۔" وہ بولا۔ "ڈیفنس، آ جانے کے باوجود اندرون شہر کے خیالات و تصورات سے تم پیچھا نہیں چھڑا سکیں۔"

"میں نہ اندرون شہر کے تصورات مانتی ہوں اور نہ ڈیفنس کے، دونوں جگہ عورت محکوم ہے اور اس کی ڈور مرد کے ہاتھ میں ہے۔"

"میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ تم کیا چاہتی ہو۔ میں نے کیا نہیں دیا تمہیں، تمہاری وارڈ روب میں جو ملبوسات ہیں ان تک ہماری کلاس کے افراد کی بھی رسائی نہیں۔ تمہارے پاس پاکستان کی سب عورتوں سے زیادہ ہی زیورات کے سیٹ ہوں گے۔ تمہارے لیے میک اَپ کا ایک سے ایک بڑھیا سامان موجود ہے۔ نئے ماڈل کی کار ہر وقت تمہارے لیے کھڑی رہتی ہے۔ تفریح کے لیے روز پارٹیز ہیں۔ میں تم سے جتنی محبت کرتا ہوں کیا کبھی کسی شوہر نے اپنی بیوی سے کی ہو گی۔ کیا کمی چھوڑی ہے، میں نے تمہارے لیے۔"

"ملبوسات، زیورات، میک اَپ، کار اور تمہارے برانڈ کی محبت۔" میں ہولے سے ہنس دی۔

"جن چیزوں کو تم برا سمجھتی ہو وہ کاروباری ضرورتیں ہیں، اگر یہ نہ کیا جائے تو ہمیں وہ آسائشیں کبھی نہ مل سکیں جو تمہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں۔"

میں چپ چاپ بحیرۂ روم کے نیلے پانیوں کو دیکھنے لگی۔ اس کی پُرسکون موجوں کے بیچ میں بھی مجھے طمانیت نصیب نہ ہوئی۔ میں اپنے آپ کو فریش رکھنا چاہتی تھی کیونکہ نوفل کی خواہش تھی کہ اٹلی میں ہم دونوں اکٹھے گلاب چنیں گے۔ اور میرا ایک وفادار اور فرمانبردار بیوی کی حیثیت سے یہ فرض تھا کہ اس کے ہر حکم اور خواہش کے آگے سر جھکا دوں۔

ساڑھے تین سال کے عرصے نے مجھے بہت بدل کر رکھ دیا تھا۔ شادی کے ابتدائی

''اور عزم؟'' اس نے امید سے پوچھا۔

''بیٹا! اس زمانے میں تو انسانوں سے اعتبار ہی اٹھ گیا ہے۔ کیا کہوں دل ٹوٹ جائے گا میری بچی کا۔''

''مجھے نہیں پروا کسی کی۔'' وہ غصے سے بولی۔ ''ٹھیک ہے میں نہیں ہوں خوبصورت' لے آئے وہ اپنے لیے کوئی میم' مجھے بھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ایسے نہیں کہتے میری لاڈو' میں کس لیے ہوں' سب ٹھیک ہو جائے گا' تو کیوں فکر کرتی ہے۔''

سائرہ جب رات کو سونے کے لیے لیٹی تو پھپھو جانی سے کی ہوئی باتیں اسے یاد آنے لگیں۔

''اللہ جانے کیا ہو گیا ہے سب کو' اور خاص کر عزم کو۔ وہ ایسا تو نہیں تھا' لیکن ٹھیک ہی کہتی ہیں پھپھو جانی' آج کل کوئی اعتبار کے قابل نہیں ہے۔ اور پھر عزم نے کون سا ساتھ جینے مرنے کے وعدے کیے تھے مجھ سے کہ میں اس سے شکایت کر سکوں۔ اتنی گئی گزری تو نہیں ہوں کہ اس کے پیچھے پاگل ہو جاؤں یا اس کی منتیں کرنی شروع کر دوں۔'' اس نے تکیے میں منہ چھپا کے سونے کی کوشش کی۔

صبح جب وہ حسب معمول دو سلائس پر مکھن لگا کر کھانے لگی تو پھپھو نے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازنا شروع کر دیا۔

''بھابی جان! ذرا دیکھیں بچی کو' کتنی سی اس کی جان ہے اور صرف دو سلائس کھا کر اٹھ جائے گی۔''

''میں تو اس کے پیچھے پڑی رہتی ہوں کہ خدا کے لیے کچھ کھایا پیا کرو لیکن یہ ہر چیز ناپ تول کر لیتی ہے۔'' امی بولیں۔

''اسے زبردستی دودھ پلایا کریں۔ ذرا دیکھیں تو رنگت کیا ہو گئی ہے۔ یوں بھی آج کل کی لڑکیوں کے چہرے بے رونق ہو کر رہ گئے ہیں۔ پتا نہیں کیا فکریں پال رکھی ہیں انہوں نے۔''

''بہن جی پڑھائی بہت سخت ہے نا اس کی۔ آخر ڈاکٹری پڑھنا آسان کام ہے کیا؟''

''ارے ہاں' مجھے یاد آیا بھابی جان کل رات سے گھٹنوں میں سخت درد ہے۔ سوچ رہی

تھی کہ ڈاکٹر کو دکھا دوں۔''

''اب تو ماشاء اللہ اپنے گھر ڈاکٹر ہے۔'' امی جان نے فخریہ کہا۔

''پھپھو' پونستان لے لیں۔'' اس نے بیزار ہو کر کہا۔

''امی جان' مجھے صائمہ کی طرف جانا تھا۔''

''ادھر اتنا کام بکھرا پڑا ہے' کار بھی نہیں ہے۔''

''امی' مجھے ان بکھرے کاموں سے ہی تو الجھن ہو رہی ہے۔ میں نے پڑھنا ہے وہاں جا کر' مجھے تو بخشیں آپ۔''

''تو کیا ویگن پر جاؤ گی؟'' پھپھو اس تصور سے ہی ہول گئیں۔ ''دھوپ میں رنگت خراب ہو جائے گی۔''

''ساری دنیا ویگن پر جاتی ہے میں کوئی نرالی نہیں ہوں۔'' اس نے خود پر ضبط کر کے کہا۔ ''اور رہ گئی رنگت کی خرابی تو اب یہ مزید خراب نہیں ہو سکتی۔ کسی کو اچھی لگوں تو اسی رنگ سمیت لے جائے' میرے ماں باپ اتنے گئے گزرے نہیں ہیں کہ مجھے گھر بٹھا کے کھلا نہ سکیں۔''

''بری بات بیٹا ایسے نہیں کہتے۔'' امی جان بولیں۔ ''میں چاہتی تھی کہ کچھ گھر کا کام نمٹ جاتا تو چلی جاتیں۔''

''بھابی جان جانے دیں بچی کو' میں کس لیے ہوں سب کام سنبھال لوں گی۔''

''بہن جی' آپ بزرگ ہیں آرام کریں۔''

''اپنی بھتیجی کی شادی پر کام نہیں کروں گی تو کب کروں گی۔'' انہوں نے رسان سے بجو کی طرف دیکھا۔

''تو امی جان میں جاؤں پھر؟'' اس نے امید بھری نظروں سے امی کی طرف دیکھا۔

''جاؤ لیکن پہنچ کر فون کر دینا۔''

سائرہ تیار ہو کر بس اسٹاپ پر پہنچی۔

''ایک تو اس گرمی میں کہیں جانا کتنا مشکل ہے۔ اوپر سے ویگن بھی نئی نویلی دلہن کی طرح شرما شرما کر اپنا چہرا دکھاتی ہے۔''

ویگن کے انتظار میں پچھلے پندرہ منٹ سے کھڑی سائرہ ساتھ والی خاتون کے سامنے

اپنے دل کا غبار نکال رہی تھی۔ جب اسے اپنے بالکل قریب کار کا ہارن سنائی دیا۔

''یہ کون بدتمیز ہے۔ اتنی بھی تمیز نہیں ہے کہ...'' ابھی اس کا فقرہ ادھورا ہی تھا کہ اس کی نگاہ کار میں بیٹھے عزم پر پڑی۔ ''ارے عزم تم۔''

عزم نے اس کے لیے کار کا دروازہ کھولا تو وہ ساتھ کھڑی خاتون کو خدا حافظ کہتی ہوئی کار میں بیٹھ گئی۔

''میں تمہاری کار میں صرف اس لیے بیٹھ گئی ہوں کہ باہر بہت گرمی تھی اور میں کافی دیر سے ویگن کے انتظار میں کھڑی تھی اور پھر یہ بھی تھا کہ میں تمہارے ساتھ بیٹھنے سے انکار کر دیتی تو اسٹاپ پر کھڑے تمام افراد مل کر تمہیں Punching bag بنا لیتے کہ لڑکیوں کو تاکتا پھرتا ہے۔ اس لحاظ سے تمہیں میرا شکر گزار ہونا چاہیے۔''

''بس یا کچھ اور؟''

''گاڑی کا رخ کینٹ کی طرف کر دو اور ذرا Mile سٹیج مجھے دکھا دینا' اترتے وقت میں تمہیں کرایہ دے کر اُتروں گی۔''

''اس سے پہلے ہی میں تمہیں چلتی گاڑی سے باہر پھینک دوں گا۔''

''ہاں اسی کی کسر رہ گئی تھی تاکہ جو رہی سہی شکل ہے میری' وہ بھی بگڑ جائے۔ ناک تو پہلے ہی میری موٹی ہے' اب کیا لیبل لگوانا ہے؟''

''خود ہی بولتی جاؤ گی یا میری بھی کچھ سنو گی؟''

''بہت کچھ سن لیا ہے میں اب مزید کچھ سننا نہیں چاہتی۔'' وہ بگڑ کر بولی۔ ''اور یہ بھی بتا دوں تمہیں کہ تمہاری گاڑی میں بیٹھنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں تم سے کوئی شکوہ شکایت کرنا چاہتی ہوں۔ جو بات ختم ہوگئی سو ختم ہوگئی اور یہ بھی نہ سمجھنا کہ میں تمہاری خاطر جوگ لے لوں گی یا تمہارے نام کی مالا جپتی جنگلوں بیابانوں کا رخ کر لوں گی' میں اپنے بل بوتے پر زندہ رہنا جانتی ہوں۔''

''تمہاری بات ختم ہوگئی یا ابھی کچھ اور کہنا ہے؟''

''میں چپ ہو جاتی ہوں' تم بتا دو کیا کہنا ہے۔'' وہ تلخی سے بولی۔ ''لڑکی پسند آ گئی کوئی یا ابھی اپنی نادیدہ دلہن کے لیے ہی بَری بنوانے میں مصروف ہو۔''

''خدا کی قسم سارو! اگر تم نے مزید بکواس جاری رکھی تو میں نے کار سامنے والے ٹرک

سے ٹکرا دینی ہے۔''

''مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا' میں تو ہوں ہی بدشکل لیکن تمہاری شکل بگڑ گئی تو تمہیں اپنے خوابوں کی تعبیر کوئی حور پری نہیں ملے گی بھلے ا[illegible] لیبل ساتھ لگا ہو۔''

''اُف میرے خدایا۔'' وہ کراہ اٹھا۔ ''میری بات سننے کا کوئی بھی روادار نہیں ہے۔''

''مجھ سے بات کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' وہ تیز لہجے میں بولی۔ ''مجھے صرف یہ بتا دو کہ جب تمہیں یہ احساس ہوگیا تھا کہ میں بدصورت ہوں۔''

''اب تم نے اپنے لیے یہ لفظ استعمال کیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ''اس وقت سے میں تمہاری بکواس سن رہا ہوں آخر حد ہوتی ہے کسی چیز کی۔''

''بڑی جلدی حدود کا خیال آ گیا ہے تمہیں۔'' سائرہ طنز سے بولی۔ ''اور مسٹر عزم میں خوبصورت نہیں ہوں یہ حقیقت ہے اور میں اس حقیقت کو تسلیم کر چکی ہوں۔''

''یہ جلی کٹی باتیں کرنے کے بجائے کیا بہتر نہیں ہوگا کہ ہم مل کر اس غلط فہمی کا سرا ڈھونڈیں۔''

''بہت خوب تو یہ غلط فہمی ہے؟'' وہ ہنسی۔ ''اسے غلط فہمی کہہ کر تم مجھے کسی خوش فہمی میں مبتلا کرنا چاہتے ہو؟''

''صرف اتنا سن لو سارو کہ میرے دل میں' میری زندگی اور میرے گھر میں ہمیشہ تم رہو گی۔ تمہارے علاوہ کوئی نہیں۔'' وہ ایک لمحے کو اسے دیکھتی رہ گئی اس کا لہجہ واقعی سچا تھا۔

''اور تائی اماں' وہ برداشت کر لیں گی مجھے؟''

''انہیں کرنا پڑے گا۔'' اس نے زور دے کر کہا۔ ''یوں بھی وہ میری خواہش رد نہیں کر سکتیں۔''

''لیکن عزم میں چاہتی ہوں کہ جس گھر میں بھی جاؤں وہاں مجھے زبردستی برداشت نہ کیا جائے بلکہ سب مجھے دل سے چاہیں اور اس گھر کے ایک فرد کی حیثیت دیں۔''

''تم ایک مرتبہ میرے گھر میں داخل ہو جاؤ پھر سب کے دلوں میں گھر کرنا تمہارے لیے کیا مشکل ہوگا؟ یوں بھی ہمارا رشتہ ایک طرح سے طے ہو چکا تھا میں زور دوں گا تو اماں اور آغا جی کبھی انکار نہیں کریں گے۔''

''جب دلوں میں بال آ جائے تو ایک دوسرے کی اچھی بات بھی بُری لگنے لگتی ہے۔'' وہ

بولی۔ ''اور میں ایسے ماحول کی عادی نہیں ہوں۔ میں خود سب سے کھلے دل سے ملتی ہوں تو ان سے بھی یہ توقع رکھتی ہوں۔ میں تمہارے گھر میں اسی وقت داخل ہوں گی جب اس میں سب کی مرضی اور خوشی ہو گی ورنہ نہیں۔ توقعات کے سہارے زندگی بسر کرنے کی میں قائل نہیں ہوں۔''

''میں اس وقت کا انتظار کر سکتا ہوں لیکن سارو یہ تمام مسائل مل بیٹھ کر ہی حل ہو سکتے ہیں جب کہ یہاں تو کوئی ایک دوسرے کی شکل تک دیکھنے کا روادار نہیں ہے۔ میرا زیادہ وقت آفس میں گزرتا ہے یا پھر دوستوں کے ساتھ۔ مجھے تو صحیح طریقے سے علم بھی نہیں ہے کہ خاندان کی سیاست کا رخ کس طرف ہے۔''

''خبر تو مجھے بھی نہیں ہے کہ میرے پیچھے کیا ہوا ہے۔ تائی اماں نے فون پر مجھ سے ایسے بات کی جیسے ابھی کچا ہی چبا جائیں گی۔ لالہ جی اور بڑی اماں ساتھ والے گھر آئے لیکن وہ لوگ ہم سے ملے بغیر ہی چلے گئے جب کہ انہیں پتا بھی تھا میرے گھر آنے کا۔ پھر چاچو چاچی اور شعیب کار پر گزرے۔ میں نے انہیں ہاتھ بھی ہلایا لیکن انہوں نے نظر انداز کر دیا۔ آنے سے پہلے تم سے فون پر بات ہوئی لیکن تم نے کسی بات کا ذکر ہی نہیں کیا۔''

''میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے ذکر نہیں کیا۔'' وہ بولا۔

''اور تمہیں اتنی توفیق بھی نہیں ہوئی کہ گھر آ جاتے ملنے کے لیے' دو قدم کا تو فاصلہ ہے۔ یا آنے سے پاؤں دکھتے تھے تو کم از کم فون ہی کر دیتے۔''

''تمہارے گھر آ کے میں نے اپنی ٹانگیں نہیں تڑوانی تھیں اور فون پر تین مرتبہ رابطہ کیا لیکن خبر ملی کہ محترمہ گھر پر موجود نہیں ہیں۔''

''میں تو گھر پر ہی تھی۔'' وہ بولی۔ ''بس کل بجو کی شادی کی خریداری کرنے بازار گئی تھی۔ اور یہ بھی بتا دوں کہ میرے گھر والے اتنے بدتمیز نہیں ہیں کہ تمہاری ٹانگیں توڑتے۔ ہم خاصے وضع دار لوگ ہیں۔''

''پتا نہیں توڑتے یا نہ توڑتے لیکن مجھے یہی پتا چلا تھا کہ اب میں نے تمہارے گھر کی طرف دیکھا بھی تو میری خیر نہیں۔''

''بکواس مت کرو' بھلا ایسے کون کہہ سکتا ہے؟''

''اس بات کو چھوڑو۔ بہت معتبر ذریعے سے پیغام بھجوایا گیا تھا۔'' وہ بولا۔ ''لیکن اس

میں تمہارا کوئی قصور نہیں اس لیے اس بات کو رہنے دو۔ میرا خیال ہے باقی گفتگو آئس کریم ٹیبل پر بیٹھ کر کرتے ہیں۔''

وہ جانتا تھا کہ آئس کریم سائرہ کی کمزوری ہے اور وہ یہ آفر رد نہیں کر سکتی۔ اس نے آئس کریم پارلر کے سامنے کار پارک کی۔ اندر کا خنک ماحول بہت خوشگوار تھا۔ ویٹر نے مینو کارڈ ان کے سامنے رکھا۔ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں تھی وہ دونوں یہاں ہمیشہ [illegible] کو ترجیح دیتے تھے۔ آرڈر دے کر عزم اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''ہمیں اس غلط فہمی کا سرا ڈھونڈنا ہے۔''

''اس سے کیا فرق پڑے گا؟''

''یہ ہمارے مستقبل کا سوال ہے۔ تم تو میری خاطر جوگ نہیں لو گی لیکن میں تمہاری خاطر ضرور بیابانوں کی خاک چھاننے لگوں گا۔''

''سب کہنے کی باتیں ہیں کوئی کسی کے لیے اپنی زندگی اور آسائشوں کو نہیں چھوڑتا۔''

''نہ میں' کوئی ... اور نہ تم کسی۔'' وہ بولا۔ ''ہمیں بزرگوں کو آپس میں ملانا ہے' ایک خاندان بن کر رہنا ہے جیسے ہم پہلے رہا کرتے تھے۔''

''مجھے تو یہ بھی علم نہیں ہے کہ بات کہاں سے شروع ہوئی تھی۔''

''یہ بات تب شروع ہوئی تھی جب تمہاری امی جان کی طرف سے پیغام موصول ہوا تھا کہ وہ تمہاری شادی مجھ سے نہیں کریں گی۔''

''کیا کہہ رہے ہو۔'' سائرہ نے اس کی بات کاٹی۔

''بات تب شروع ہوئی تھی جب تمہاری اماں نے مجھے موٹی ناک والی بدصورت لڑکی کہا تھا۔ کون ماں برداشت کر سکتی ہے اس قسم کی بات۔''

''خود سوچو سارو' اماں اس قسم کی بات کر سکتی ہیں؟ وہ کس قدر پیار کرتی ہیں تم سے' جب بھی لاہور آتی ہو' وہ خود تمہیں ساتھ لے کر جاتی ہیں۔''

''اب انہیں تمہارے بڑے عہدے اور بڑی تنخواہ کے لیے کسی بڑے گھر کی خوبصورت لڑکی چاہیے جو تمہارے ساتھ سج سکے۔ اب تو انہیں مجھ میں برائیاں نظر آئیں گی ناں' کیوں کہ میں جہیز میں صرف تعلیم اور تربیت لا سکتی ہوں اور ابو جان کے تمہارے جیسے بڑے عہدے والوں سے تعلقات بھی نہیں ہیں۔'' وہ تلخی سے بولی۔ ''بہتر ہو گا کہ تم بھی اپنے پرانے فیصلے پر

نظرِ ثانی کرلو ورنہ بقول تمہاری اماں کے میرا اور تمہارا وہی حساب ہوگا کہ پہلوئے حور میں لنگور۔ Mind you ان کی نظر میں حور تم اور لنگور میں ہوں۔"

"شک تو خیر مجھے بھی نہیں ہے اس میں۔" وہ ہنسا۔

"بہت بہت شکریہ کہ تم نے جلد ہی اپنا فیصلہ سنا دیا۔" وہ بیگ کندھے پر ڈال کر اٹھنے لگی۔

"بیٹھو یہاں۔" اس نے سائرہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھا دیا۔" Where is your sense of honour (تمہاری حسِ مزاح کو کیا ہوا۔)

"میں مذاق میں بھی ایسی بات برداشت نہیں کرسکتی۔ اپنی خوبصورتی رکھو اپنے پاس، مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے اس کی۔ میری نظر میں مقابل کی خصوصیت صرف اس کی انٹیلی جینس اور تعلیم ہوتی ہے۔ میں صرف اسی چیز کی تعریف کرسکتی ہوں جو جدوجہد سے حاصل کی گئی ہو۔"

"لیکچر سننے کے موڈ میں نہیں ہوں میں۔"

"تم مجھے مجبور بھی مت کرو اس کے لیے۔" وہ بولی۔ "اور اب بتاؤ کیا ارادہ ہے؟"

"تم میرے ساتھ میرے گھر چلو۔"

"تائی اماں کے سامنے؟" اس نے کہا۔ "سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس دن فون پر تو وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکی تھیں لیکن سامنے دیکھ کر مجھے ضرور کچا چبا ڈالیں گی۔"

"تم نے میری اماں کو آدم خور سمجھ رکھا ہے کیا؟"

"تمہاری اماں ہیں، تمہیں ہی پتا ہوگا۔" وہ بے نیازی سے بولی۔

"یہ معاملہ ایسے حل نہیں ہوگا۔"

"ہاں اس لیے اب یہاں بیٹھنا فضول ہے، اتنی دیر ہوگئی ہے مجھے۔ گھر بھی جانا ہے۔"

عزم نے بل ادا کیا اور دونوں باہر آ گئے۔

"میں چلتی ہوں۔"

"کیا مطلب؟ کیسے چلتی ہو؟"

"ویگن سے۔"

"تمہارا دماغ بھی ان چار مہینوں میں خراب ہوگیا ہے۔ اپنے پاس کار ہوتے ہوئے

میں تمہیں ایسے جانے دے سکتا ہوں۔"

"میں تو تمہارے بھلے کو ہی کہہ رہی تھی۔"

"ڈر تو ہے مجھے بھی اپنی ٹانگیں ٹوٹ جانے کا لیکن چلو تمہاری خاطر رسک لے لیتا ہوں۔" وہ سائرہ کی بات کاٹ کر بولا۔

"میرے ابو پہلوان نہیں ہیں کہ تمہاری ٹانگیں توڑ ڈالیں۔"

"میں کیا جانوں وہ کیا ہیں۔ پیغام تو ایسا ہی آیا تھا تمہارے گھر سے۔"

"پھر میری خاطر یہ رسک لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا پتا ان چار مہینوں میں ابو جان نے پہلوانی سیکھ لی ہو۔" وہ چڑ کر بولی۔ "یوں بھی بہت سے انہونی تبدیلیاں آئی ہیں اس عرصے میں۔"

"اگر قیس لیلیٰ کی خاطر مجنوں ہوسکتا ہے تو کیا میں تمہاری خاطر لنگڑا نہیں ہوسکتا۔"

"بکواس مت کرو۔" سائرہ نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اور اب بھی اتنی دور سے پیچھے [illegible] نہیں لوگی۔" عزم [illegible] وہ خوش ہوگئی۔

"اب چپ چاپ کار میں بیٹھ جاؤ۔" سائرہ کے پاس اب کوئی چارہ نہیں تھی اس لیے وہ چپ چاپ کار میں بیٹھ گئی۔

"اب بکو کے بعد تم بھی پیا دیس سدھار [illegible]"

"تم اب زیادہ ہی فری نہ ہو جاؤ۔" وہ ابھی تک اپنی حرکت پر جھینپی ہوئی تھی۔

"اب تو ہمیں اپنی طاقت کا اندازہ ہوگیا ہے، اس لیے اب ہم تم پر خوب رعب جھاڑیں گے۔" اس نے اکڑ کر کہا۔

"واپس آ جاؤ اپنے حواسوں میں ورنہ شیخ چلی کی طرح تمام انڈے توڑ دو گے۔ میں نے تو محض انسانی ہمدردی کی بنیاد پر بات کی تھی۔"

"اب بتاؤ میری طرف چلنا ہے یا..." عزم نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑی۔

"مجھے آدم خور قبیلے میں جانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔"

"اور مجھے بھی پہلوانوں کے اکھاڑے میں جانے کا شوق نہیں ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ کوئے یار اور سوئے دار ایک ہی جگہ ہے اور ہر راہ جو ادھر کو جاتی ہے مقتل سے گزر کر جاتی

ے۔‘‘اس نے کارگیئر میں ڈالی۔

’’ایک بات بتاؤ عزم۔‘‘

’’پوچھو۔‘‘

’’آپس کے اختلافات کی بات تو سمجھ میں آتی ہے لیکن لالہ جی‘ بڑی اماں اور چاچو اور چاچی کی ناراضگی سمجھ میں نہیں آتی۔انہیں کیا ہوا ہے؟‘‘

’’بہت لمبی بات ہے۔مختصراً بتا دیتا ہوں۔‘‘ عزم نے کہا۔’’جب تمہارے گھر سے پیغام آیا کہ تمہاری میری شادی نہیں ہوسکتی تو اس پر ہمارے ساتھ جو ہوا سو ہوا چاچو کی تو پوچھو ہی نہ کہ کیا حالت ہوئی۔ وہ تم لوگوں کے گھر گئے لیکن مسئلہ سلجھنے کے بجائے الجھتا ہی گیا۔ دوسری طرف اماں کو بھی تاؤ آگیا تھا اس لیے بات کیسے بن سکتی تھی۔ایسے ہی مذاکرات کے دوران ایک دن چاچو‘ چاچی تمہارے امی ابو سے جھگڑ کر آ گئے۔‘‘

’’جھگڑ کر آ گئے؟‘‘

’’ہاں! جب ہر کوئی اپنی کہنا چاہتا ہو لیکن کسی کی سننے کا روادار نہ ہو تو معاملہ بگڑتا ہی ہے سنورتا تو نہیں ہے۔‘

’’اور لالہ جی؟‘‘

’’ہاں ان کے تم لوگوں سے تعلقات درست تھے۔ یہاں تک کہ لالہ جی تم لوگوں کے وکیل کی حیثیت سے ہمارے ہاں آئے تھے۔ان کے خیال میں سارا قصور اماں کا تھا جنہوں نے تمہیں بدصورت کہا تھا۔اماں نے قسمیں بھی اٹھائیں کہ انہوں نے ایسی بات نہیں کہی لیکن تم لوگوں نے ان کی بات مانی ہی نہیں۔ اس طرح لالہ جی اور بڑی اماں کا دل ہماری طرف سے کھٹا ہو گیا۔ دوسری طرف انہی دنوں بجو کا رشتہ ظفر بھائی سے طے کر دیا گیا۔ لالہ جی اور بڑی اماں کو اس کا بہت رنج ہوا۔‘‘

’’خاندان میں کوئی کمی تھی لڑکوں کی۔‘‘ بڑی اماں نے شکوہ کیا۔’’میرا ارسلان بھی نظر نہیں آیا آپ کو۔‘‘

’’آپ نے کبھی ارسلان کا اشارتاً بھی ذکر نہیں کیا۔ میں نے سوچا آپ کی مرضی نہیں ہو گی یہاں۔ میں کب تک بیٹی گھر بٹھائے رکھتی۔‘‘

’’میں تو اس کے پاکستان واپس آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ پہلے سے کیسے بات کر

دیتی؟ صرف اس لیے چپ تھی کہ میں یہاں زبان دے دوں اور وہ باہر سے میم اٹھا لائے تو کس قدر شرمندگی ہوگی۔ابھی چند دن پہلے اس کا عندیہ لینے کے لیے اسے خط لکھا تھا کل ہی جواب آیا ہے۔اتنا فرمانبردار ہے میرا ارسلان‘ لکھ دیا ہے اس نے کہ جہاں چاہوں گی وہیں شادی کرے گا۔‘‘

’’اب آپ خود بتائیں میرا کیا قصور ہے اس میں۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’کوئی چھوٹی سی بات کوئی اشارہ ہی دے دیتے آپ لوگ۔‘‘

’’بھابی جان یہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ لوگوں نے تو فیصلہ کرتے ہوئے بھی ہمیں شامل نہیں کیا۔‘‘ لالہ جی نے گلہ کیا۔’’کم از کم ہم سے پوچھ ہی لیا ہوتا۔‘‘

اور پھر دلوں میں گرہ پڑ گئی۔چھوٹی چھوٹی باتوں پر شکوہ شکایتیں۔ہم سے تو وہ پہلے ہی ناراض تھے تم لوگوں سے بھی ناراض ہو گئے۔ارسلان بھائی نے پاکستان آ کر ہنگامہ کر دیا۔ یہ تو ہمیں ہی معلوم تھا کہ وہ بجو کو کتنا چاہتے ہیں۔‘‘

’’لیکن وہ بجو کے پیچھے پاگل تھے۔ بجو نہیں تو پھر ہنگامہ کیسا؟‘‘

’’ہنگامہ انہوں نے اپنے گھر کھڑا کیا تھا کہ لالہ جی اور بڑی اماں پہلے ان کا رشتہ کیوں نہیں لے گئے تم لوگوں کی طرف؟‘‘

’’لیکن انہوں نے تو اپنی شادی کا سارا اختیار بڑی اماں کو دے دیا تھا۔‘‘

’’یہ تو بڑی اماں نے کہا تھا ناں لیکن حقیقت یہ تھی کہ انہوں نے بجو کے لیے ہامی بھری تھی اور خط میں صاف لکھ دیا تھا کہ شادی کریں گے تو صرف ان سے۔‘‘ عزم نے بتایا۔’’اور زیادہ حالات انہی کی وجہ سے خراب ہوئے۔‘‘

’’لیکن میری بجو ظفر بھائی سے شادی پر بہت خوش ہیں۔‘‘

’’انہیں خوش ہونا بھی چاہیے۔ارسلان بھائی صرف ان کے کزن ہیں جبکہ ظفر بھائی سے کچھ دن میں ان کی شادی ہونے والی ہے۔میں انہیں جانتا ہوں‘ وہ بہت اچھے ہیں۔ بجو کو یقیناً خوش ہونا چاہیے۔‘‘

’’عزم یہ حالات تو اتنے پیچیدہ ہیں کہ اب ان کا سدھرنا ناممکن ہے۔‘‘

’’ہمیں اپنے مستقبل کی خاطر انہیں بہتر کرنا ہوگا۔‘‘ وہ بولا۔’’ناراضگیاں کہاں نہیں ہوتیں، ہمارے درمیان بھی ہوتی تھیں لیکن اتنی شدت سے کبھی نہیں ہوئیں۔‘‘

"تم پر امید ہو لیکن میں نہیں۔" سائرہ نے گہری سانس لی۔ "پتا نہیں کیا کیا ہے تم لوگوں نے۔" گاڑی کے بریک چرچرائے۔ باتوں باتوں میں سائرہ کو پتا بھی نہیں چلا کہ گھر کب آیا۔

"اچھا عزم خدا حافظ۔ رابطہ رکھنا۔"

"خدا حافظ۔" کہہ کر اس نے کار آگے بڑھالی۔

"اچھا عزم بھائی کے ساتھ گھوم رہی تھیں۔" بے بی نے اس کے لیے گیٹ کھولا۔

"اتفاق سے مل گیا تھا تو اس کے ساتھ چلی گئی تھی۔"

"کہاں؟ تائی اماں کی طرف؟"

"وہاں جاتی تو کیا تم مجھے یہاں زندہ سلامت دیکھ سکتی تھیں؟"

"پھر کہاں؟"

"آئس کریم کھانے چلے گئے تھے۔"

"عیش ہیں تمہارے عزم بھائی تو روز آئس کریم کھلاتے تھے تمہیں۔"

"صرف مجھے نہیں کھلاتا تھا چنوری اماں' سب کو کھلاتا تھا اور تم سب سے آگے ہوتی تھیں۔" اس نے بیگ صوفے پر رکھا۔ "سب گھر والے کہاں ہیں؟"

"ابو جان آفس میں' امی اور بجو مجھے صفائی پر لگا کر ساتھ والی مارکیٹ چلی گئی ہیں اور پھپھو جانی لالہ جی کی طرف۔"

"کب آئیں گی امی جان؟"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو گئی ہیں۔" بے بی اس کے لیے ٹھنڈے پانی کا گلاس لے آئی۔ "ویسے سارو اگر امی جان نے تمہیں عزم بھائی کے ساتھ دیکھ لیا ہوتا تو تمہاری خیر نہ ہوتی۔"

"کیوں؟" سائرہ نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"اس لیے کہ انہوں نے تم سمیت ہم سب کو بہت برا بھلا کہا ہے۔"

"ممکن ہی نہیں ہے۔" سائرہ نے اس کی بات کاٹی۔

"نہ مانو تم۔ ابھی کل ہی تو پھپھو جانی نے امی جان کو بتایا ہے۔"

سائرہ کے کان کھڑے ہو گئے۔ "کیا بتایا ہے؟"

"وہی کہ عزم بھائی نے کہا ہے کہ ان کے گھر وہی لڑکی آئے گی جسے تائی اماں لائیں گی اور یہ کہ لڑکی کا گھرانہ اونچا ہونا چاہیے ان کا عہدہ کوئی چھوٹا موٹا تو ہے نہیں۔"

ایک لمحے کو سائرہ چکرا کر رہ گئی۔ "لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے' اس نے خود مجھ سے کہا ہے کہ....." اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

کہیں نہ کہیں کچھ گڑبڑ تھی۔ عزم ایسا نہیں کہہ سکتا تھا۔ کل رات پھپھو جانی سے بات کرنے کے بعد وہ خود بھی بدگمانی کا شکار ہو گئی تھی لیکن آج عزم نے اس کے سب خدشے دھو ڈالے تھے تو یہ نئی کہانی سامنے آ گئی۔ خیر' اب سائرہ بدگمانی کا شکار نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ عزم کے دل میں اس کے لیے کیا جذبات ہیں۔

"سارو! اب کم از کم امی جان کے سامنے تم یہ ذکر مت کرنا کہ تم عزم بھائی کے ساتھ آئی ہو۔"

"کمال کرتی ہو تم' میں نے کبھی کوئی بات امی سے چھپائی ہے؟ اور اگر مجھے یہ بات چھپانی ہوتی تو میں گھر کے گیٹ کے سامنے کار سے نہ اترتی۔ اس قسم کی باتوں کو میں بہت گھٹیا سمجھتی ہوں۔"

"کبھی بات سمجھنے کی بھی کوشش کیا کرو۔" بے بی نے چڑ کر کہا۔ "اتنی ذرا سی بات تمہاری عقل میں نہیں سماتی۔ امی جان ان سے کہہ چکی ہیں کہ ہمیں ان سے کوئی' حمایت نہیں چاہیے اور ہم ان سے کوئی رشتہ داری نہیں رکھنا چاہتے۔ اب اگر انہیں یہ پتا چلا کہ تم عزم کے ساتھ آئی ہو تو کیا شرمندگی نہیں ہو گی انہیں۔" پھر بے بی نے خاندانی سیاست کی ایک طویل کتھا سنا کر اسے یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ امی جان کو اس بات کا علم ہوا تو نہ صرف ان کو سب کے سامنے شرمندگی اٹھانی پڑے گی بلکہ خود سائرہ کی بھی خیر نہیں ہے۔

"اپنی تو مجھے پروا نہیں ہے البتہ صرف امی جان کی وجہ سے اتنا کر سکتی ہوں کہ نہ کچھ بتاؤں گی اور نہ' چھپاؤں گی۔ اگر امی جان نے خود سے نہ پوچھا تو نہیں بتاؤں گی لیکن کچھ پوچھ لیا تو کچھ بھی نہیں چھپاؤں گی۔"

"یا وحشت! یہ اثر ہوا ہے تم پر۔ یہ کبھی ممکن ہے کہ امی جان نہ پوچھیں؟ تم نے ان کی ہدایت کے مطابق فون بھی نہیں کیا تھا۔"

"میں صائمہ کے گھر گئی ہی نہیں تو فون کیسے کرتی؟"

''آج تمہاری بچت کا چانس بہت کم ہے۔'' بے بی نے افسوس سے سر ہلایا۔

لیکن شکر ہوا کہ امی جان کو کچھ پوچھنے کا خیال نہیں آیا۔ یوں بھی شادی والے گھر کا حلیہ اچھا خاصا بگڑا ہوا ہوتا ہے' خاص طور پر جب صفائی اور اس قسم کے کاموں کا چارج بے بی جیسے شخص کے ہاتھ میں ہو۔ اور ایسے ہنگامے میں کم ہی ایسی باتوں کا خیال آتا ہے۔

''سارو جان! کوئی اور تو یہ کام کرے گا نہیں' تم ہی ذرا مہمانوں کی فہرست بنا لینا۔'' امی جان نے آتے ہی اسے کام تھما دیا۔ کاپی پنسل ہاتھ میں لیے وہ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھی۔

''تم یہاں بیٹھی ہو اور ہم نے تمہارے لیے سارا گھر چھان مارا۔'' بے بی ہاتھ میں چند رسالے لیے اس کے قریب ہی آ بیٹھی۔ ''اب تو ہم سنجیدگی سے سوچ رہے تھے کہ تلاشِ گمشدہ کا اشتہار لگا دیں۔''

''کیا لکھتیں تم اشتہار میں؟'' اس نے کاپی پنسل ایک طرف رکھتے ہوئے پوچھا۔

''لکھتی کہ ایک بدصورت دوشیزہ جس کی ناک فٹ بال جیسی ہے اور جس کے سر پر بال نہ ہونے کے برابر ہیں' پچھلے ایک گھنٹے سے لاپتا ہے' ڈھونڈنے والے کو انعام میں......''

''بکواس بند کرو۔'' سائرہ نے منہ بنایا۔

''ہم کہیں تو بکواس ہے اور تائی اماں ارشاد فرمائیں تو تم مانتیں نہیں' ایک دم سے فیصلہ صادر کر دیتی ہو کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔''

''بے بی! کیا تمہیں یقین ہے کہ تائی اماں یا عزم نے ایسا کہا ہوگا؟''

''سارو! اب تو کم از کم دنیا کو سمجھ لو۔ بہت Painted لوگ ہیں یہاں کے۔ بہت نقاب ہیں سب کے چہروں پر۔''

''لیکن بے بی آج عزم یہ بات صاف صاف بھی کہہ سکتا تھا مجھ سے' میں کیا بگاڑ لیتی اس کا؟ اس نے تو آج مجھے اتنا یقین دلایا ہے کہ اس کی زندگی میں میرے علاوہ اور کوئی لڑکی نہیں آ سکتی۔''

''سب کہنے کی باتیں ہیں سارو' کون کسی کے لیے مرتا ہے۔ تم بھی اب افسانوں کی دنیا سے نکل آؤ۔''

''مجھے کسی نے یہ تک نہیں بتایا تھا کہ لالہ جی' اور بڑی اماں بھی ناراض ہیں ہم سے۔''

''ان کی تو خواہ مخواہ کی ناراضگی ہے۔ خود سوچو انہوں نے کبھی اشارتاً بھی بجو کے لیے

ارسلان بھائی کا ذکر نہیں کیا تھا اب ہمیں الہام تو ہونے سے رہا کہ وہ یہ چاہتی ہیں۔ ہمارے تو فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا اس بات کا اس لیے جب ظفر بھائی کا رشتہ آیا تو امی ابو نے ہاں کر دی۔ ظاہر ہے انکار کی وجہ بھی کوئی نہیں تھی۔ جب ہم نے رشتہ طے کر دیا تو انہیں خیال آیا کہ خاندان میں بھی لڑکی موجود ہے۔''

''اچھا اب تم جاؤ' ہم دونوں اکٹھے بیٹھے رہے تو مہمانوں کی لسٹ کبھی نہیں بن سکے گی۔''

''ایسے ہی چلے جائیں ہم' جو اصل کام تھا وہ تو درمیان میں ہی رہ گیا ہے۔'' وہ بولی۔

''کیا کام تھا؟''

''ہم نے تمہیں گلوں کے ڈیزائن دکھانے تھے گو کہ یہ گلے اصل گلے کی حدود سے کچھ دور واقع ہیں پھر بھی انہیں گلا کہا جا سکتا ہے۔''

''کن گلوں کی بات کر رہی ہو۔ اس وقت سے گلے گلے کی گردان لگا رکھی ہے۔'' سائرہ نے کہا۔

''بھئی تم کہہ رہی تھیں ناں کہ ہمیں فیشن کے میگزین میں سے گلے نہیں ملیں گے' تو دیکھ لو پورے دو گلے نکال ہی لیے ہیں ناں ہم نے۔'' اس نے فاتحانہ انداز سے سائرہ کی طرف دیکھا۔ ''یہ دیکھو۔''

''ہیں تو یہ گلے ہی لیکن ان میں ڈیزائن کیا ہے؟ سادہ سا گول گلا ہے۔'' سائرہ نے تصویر کا جائزہ لیا۔

''بھئی ہم اس وقت ڈیزائننگ کی بات نہیں کر رہے صرف یہ دکھا رہے ہیں کہ ان رسالوں میں گلے مل سکتے ہیں۔''

''خدا کے واسطے اب ان گلوں سمیت یہاں سے بھاگ جاؤ ورنہ......''

''جاتے ہیں' جاتے ہیں۔ تم تو فوراً ہی ہم سے تنگ آ جاتی ہو۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اور بے بی! ایک صفحے پر اپنی سہیلیوں کے نام لکھ دینا مجھے۔ بجو کی سہیلیوں کا تو مجھے پتا ہے لیکن تمہارا وسیع ترین حلقہ احباب میری چھوٹی سی یادداشت میں نہیں سماتا۔''

''شام کو دے دیں گے ہم۔'' وہ کمرے سے باہر نکل گئی تو سائرہ نے پھر کاپی پنسل سنبھالی۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ بجو چلی آئیں۔

''پورے گھر میں یہی ایک ٹھنڈا کمرہ ہے۔ ہائیں تم یہاں اکیلی بیٹھی کیا کر رہی ہو؟''

''میں مہمانوں کی لسٹ بنا رہی تھی۔'' سائرہ نے بتایا۔ ''اتنا مسئلہ ہے یہ لسٹ بنانا بھی۔ کبھی کسی کا نام دو دو دفعہ لکھ دیتی ہوں۔''

''اس سے زیادہ بڑا مسئلہ جہیز کی لسٹ بنانا ہے' روز ایک نئی چیز یاد آ جاتی ہے۔''

''بہت کنگلا سسرال ملا ہے آپ کو۔ ڈونگے چمچ تک نہیں ہیں' ان لوگوں کے پاس۔ کبھی سوچتی ہوں کہ کیا بے چارے زمین پر رکھ کے روٹی سالن کھاتے ہیں یا درختوں کے پتوں کی جگالی کرتے ہیں۔''

''یہ امی جان سے جا کر پوچھو' مجھے کیا خبر؟'' انہوں نے بے نیازی سے کہا۔

''کیا پوچھوں ان سے؟ یہ کہ آپ میری بجو کو اتنے جنگلیوں میں کیوں بیاہ رہی ہیں جن کے پاس کھانے کو برتن اور پہننے کو کپڑے تک نہیں ہیں؟''

''میری طرف سے کھلی اجازت ہے پوچھ لو۔ اس کے بعد تمہاری اس ننھی سی جان کی ضمانت نہیں دے سکتی میں۔''

''ظفر بھائی کیسے لگتے ہیں آپ کو؟'' سائرہ نے اچانک سوال کیا۔

''کیسے لگنے چاہئیں؟'' انہوں نے الٹا سوال کیا۔

''بعض اوقات چاہنے اور ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے۔''

''مجھے تو بہت اچھے لگتے ہیں ورنہ میں ہامی کیوں بھرتی ان کے لیے۔''

''اور ارسلان بھائی؟''

سائرہ کے سوال پر ناخنوں کو شیپ دیتی بجو نے اپنا سر اٹھایا۔ ''یہ سوال کیوں پوچھا تم نے؟''

''بس یونہی۔'' اس نے کندھے اُچکائے۔ ''سنا تھا وہ آپ کے پیچھے کافی مجنوں ہو گئے تھے۔''

''وہ ہوا ہوگا' میں تو نہیں ہوئی تھی۔ میری منگنی کے بعد خواہ مخواہ مجھ سے نتھی ہونے کی کوشش کر رہا تھا' اس لیے میں نے دماغ درست کر دیا اس کا۔''

''کیا مطلب؟'' یہ سائرہ کے لیے ایک نیا انکشاف تھا۔ اس بات کی تو اسے خبر بھی نہیں تھی۔

''میری باقاعدہ منگنی ہو گئی تھی جب وہ پاکستان آیا تھا۔ پہلے تو اس نے اپنے گھر میں جھگڑا کھڑا کیا اور پھر اپنے' عشق کی فریاد لے کر میرے پاس آ گیا۔ بھلا تھی کوئی تک اس بات کی؟ میرا تو غصے سے دماغ گھوم گیا اور جو میرے منہ میں آیا میں نے کہہ دیا۔ کتنی گری ہوئی حرکت تھی' اس کی۔''

''ایسا تو واقعی نہیں کرنا چاہیے تھا انہیں۔''

''لیکن ایسا کیا اس نے۔ ٹھیک ہے وہ بحیثیت کزن مجھے پسند تھا لیکن اس سے زیادہ میں نے اس کے متعلق کبھی کچھ سوچا نہیں تھا۔ یہ بھی درست ہے کہ اگر اس کا رشتہ پہلے آتا تو میں اس کے متعلق ضرور سوچتی لیکن ایسا نہیں ہوا اور اس کی اس گھٹیا حرکت کے بعد میں شکر ادا کرتی ہوں کہ ایسا نہیں ہوا۔ میں کسی بھی چیپ انسان کو بحیثیت شوہر قبول نہیں کر سکتی۔''

''اس بات کا کس کس کو علم ہے؟''

''اصل میں جس دن یہ بات ہوئی تھی میں لالہ جی کے گھر گئی ہوئی تھی۔ اس وقت میں کچن میں بڑی اماں کے لیے چائے بنا رہی تھی جب وہ وہیں چلا آیا۔ بڑھی شیو کے ساتھ منہ میں سگریٹ دبائے ہوئے۔ پہلے اس نے چائے مانگی جو میں نے دے دی۔ پھر وہ ڈائیلاگ بولنے لگا۔ پہلے تو میں نے تحمل سے کام لیا لیکن کب تک؟ وہ کچھ زیادہ ہی مجنوں ہو رہا تھا' پھر تو میں نے غصے میں اسے بے نقط سنا ڈالیں۔ شور سن کر بڑی اماں کچن میں آئیں تو میں نے ان کی بھی پروا نہیں کی۔ گھر آ کے میں نے امی جان اور پھپھو کو بھی بتایا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے لالہ جی اور ابو جان کو بھی خبر ہو گی اس بات کی۔''

''میں نے پروا ہی نہیں کی' چاہے سارے محلے کو خبر ہو جائے۔''

''میں ارسلان بھائی کو ایسا تو نہیں سمجھتی تھی۔'' سائرہ کو ان کی اس حرکت پر بہت افسوس ہو رہا تھا۔

''ایک ارسلان پر کیا موقوف' یہاں سب ایک سے ایک ہیں۔ تائی اماں اور تایا ابا کو ہی لے لو' وہ لوگ کم ہیں کسی سے۔''

''آخر کیوں ہو گئے وہ ایسے؟''

''دولت اور اسٹیٹس کی پٹی آنکھوں پر چڑھ جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔''

''مجھے یقین نہیں آتا۔''

"سارہ جان، نکل آؤ اب خوش فہمیوں سے اور بھول جاؤ ان کو۔ یہ لوگ اس قابل نہیں ہیں کہ ان پر افسوس کیا جائے۔ اپنی زندگی برباد کرنے کا کیا فائدہ، یہ تو خوش رہیں گے، ہمیں اپنا دل جلانے کی کیا ضرورت ہے۔"

"اٹھو اٹھو یہاں سے، مہمان آ گئے ہیں۔" بے بی کسی ناگہانی اُفتاد کی طرح کمرے میں نازل ہوئی۔

"مہمان اس وقت کہاں سے آ گئے؟" سائرہ نے اٹھ کر جلدی سے کشن اپنے اصل مقام پر منتقل کیے۔ ہوا سے اُڑتا اُڑتا اس کا چائنا سلک کا جو دوپٹہ بیرونی دروازے پر پہنچ گیا تھا اسے اٹھایا اور ایک ہاتھ میں کاپی پنسل اور ایک میں شربت کے خالی گلاس سمیت کر لاؤنج کی طرف بڑھی۔

"امی اس وقت کون آ گیا؟"

"بہت خاص مہمان ہیں۔" بے بی ہنسی۔

"سارو! تم ذرا اپنا حلیہ درست کرو، ہر وقت خود سے بے پروا رہتی ہو۔" امی نے کہا اور عجلت میں ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئیں۔

"اُف، آخر یہ کس قسم کے مہمان ہیں۔" وہ بڑبڑائی۔

"تم سارو! کم از کم بال ہی برش کر لو۔" بجو نے اسے برش پکڑایا۔

"آپ لوگ سب کام چھوڑ چھاڑ کر مجھے تختۂ مشق بنانے پر کیوں تُلے ہوئے ہیں؟"

"تمہیں تکلیف کیا ہو جائے گی اگر تم بال ٹھیک کر لو گی۔" بجو اس کے سوال و جواب سے چڑ گئیں۔

"اچھا اچھا، کر لیتی ہوں لڑنے کی کیا ضرورت ہے۔" اس نے برش بالوں میں پھیرا۔

"اب تو خوش ہیں ناں۔"

"آنکھوں میں کاجل تو لگا لیا کرو، کتنی بری لگتی ہیں ایسے۔"

"میرے کان کھڑے ہو چکے ہیں اور مجھے خطرے کی بُو بھی محسوس ہو رہی ہے۔" وہ بولی۔ "بات کیا ہے اصل میں؟"

ابھی اس کی بات درمیان میں ہی تھی کہ امی جان دو خوش پوش خواتین کے ساتھ لاؤنج میں چلی آئیں۔

"یہ میری بیٹی سائرہ ہے اور ان سے تو آپ مل چکی ہیں پہلے۔" انہوں نے پہلے سائرہ کا تعارف کروایا اور پھر بجو اور بے بی کی طرف اشارہ کیا۔

سلام و جواب کے سلسلے کے بعد ان خواتین نے سائرہ کا باقاعدہ انٹرویو شروع کر دیا۔

"آپ کی سب سے بہت تعریفیں سنی تھیں لیکن ملنے پر ہر تعریف سے بڑھ کر پایا ہے۔" ایک نے تمہید باندھی۔

معاملہ کچھ کچھ سائرہ کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ اسے فوری طور پر دفاعی منصوبہ بندی کرنی تھی۔ "یا عزم، یا کوئی نہیں۔" اس نے دل میں سوچا اور پھر مسکرا کر ان خاتون کو مخاطب کیا۔

"میں اتنی خوبصورت تو نہیں ہوں کہ ایک نظر دیکھنے میں ہی اچھی لگ جاؤں، خاص طور پر اس حلیے میں۔" اس نے اپنے شکن آلود کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

خاتون ایک لمحے کو تو دنگ رہ گئیں پھر کھسیانی ہنسی ہنس پڑیں۔ "یہ تو ہم سے پوچھیں کہ آپ کیا ہیں؟"

"پوچھنا ہی پڑے گا کہ میں کیا ہوں۔" وہ دبے لہجے میں بولی لیکن دانستہ آواز اتنی اونچی رکھی کہ ان تک بآسانی پہنچ جائے۔

"بیٹا یہ مسز احمد ہیں۔" امی حالات کو نازک رخ اختیار کرتے دیکھ کر میدان میں کود پڑیں۔ "انہیں بہت شوق تھا تم سے ملنے کا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اب ہم بھی اہم ہو گئے ہیں۔"

"تم تو ہمیشہ سے ہی اہم ہو۔" امی نے ہنسی میں بات اُڑانی چاہی۔ "میری یہ بیٹی سارو بہت چنچل ہے۔ ایک منٹ میں سب میں گھل مل جاتی ہے اور ہنسی مذاق شروع کر دیتی ہے۔ بہت ہنس مکھ طبیعت ہے اس کی۔"

اسے امی جان پر حیرت ہو رہی تھی جو اس کی ان حرکتوں کی صفائیاں پیش کر رہی تھیں۔

"بہت اچھی چائے بناتی ہے سائرہ۔" امی پھر بولیں۔ یہ واضح اشارہ تھا کہ اسے یہاں سے اٹھ جانا چاہیے۔ "چلو بیٹا جلدی سے چائے بنا لاؤ۔"

"ہم بھی آپ کے ہاتھ کی چائے پئیں گے۔" دوسری خاتون نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ اب تک وہ اسے صرف تنقیدی نظروں سے گھور رہی تھیں۔ "لیکن چائے بہت اچھی ہو۔"

مجھ سے بُری بنی ہوئی چائے پی ہی نہیں جاتی۔''

اسے اس اجنبی خاتون کے حکم پر غصہ تو بہت آیا لیکن تحمل سے بولی۔ ''جی امی جان نے بتایا ہے ناں آپ کو کہ میں بہت اچھی چائے بناتی ہوں' آپ پئیں گی تو پیالی چاٹتی رہ جائیں گی۔ یوں بھی مجھے صرف چائے ہی تو بنانی آتی ہے اور یہ میرا اصول ہے کہ جو چیز آتی ہو وہ بہترین طریقے پر آتی ہو۔''

اب دونوں خواتین کے منہ کے زاویے تبدیل ہونا شروع ہو گئے تھے۔ مسز احمد' جن کی پوری بتیسی باہر نکل رہی تھی' اب مروت میں صرف اپنے دو دانتوں کی نمائش کر رہی تھیں جب کہ ان کے ساتھ والی خاتون اس کا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد اب بیزار دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ کچن میں چولہے پر چائے کا پانی چڑھانے گئی۔

''یہ کیا حرکت ہے؟'' امی جان اس کے پاس چلی آئیں۔ ان کی آواز بہت دبی دبی تھی۔

''کیا حرکت؟'' سائرہ نے معصومیت سے پوچھا تو امی اسے گھور کر رہ گئیں۔

''تم سے تو میں ابھی ملتی ہوں۔ ذرا انہیں جانے دو۔'' انہوں نے اسے دھمکی دی۔ ''اور اب ذرا تمیز اختیار کرنا ان کے سامنے۔'' پھر وہ بجو کی طرف مڑیں۔ ''تم بناؤ چائے اور بے بی تم برتن لگاؤ ٹرالی میں' اس سے باتیں بنانے کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔''

''بے بی تم ٹرالی لے بھی جانا' میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔'' سائرہ نے کہا تو امی کا پارہ اور ہائی ہو گیا۔

''ٹرالی تم نے لانی ہے' بے بی نے نہیں۔'' ان کا لہجہ سخت لیکن آواز بہت مدھم تھی۔

''پاگل' یہ خواتین چائے پینے نہیں' تمہیں دیکھنے آئی ہیں۔'' بجو نے تشویش ناک حد تک سنجیدہ لہجے میں اسے مطلع کیا۔

''ہم تو ہیں ہی دیکھنے کی چیز۔'' سائرہ نے اپنا گریبان چٹکی میں پکڑ کر بڑے اسٹائل سے چھوڑا۔

''تو ذرا تمیز اختیار کرو ناں پھر۔''

''کہاں سے ملتی ہے؟ جب خریدنے جانا تو تھوڑی سی میرے لیے بھی لیتی آنا۔'' اس نے ٹرالی میں سجایا جانے والا ایک بسکٹ اٹھا کر منہ میں ڈال لیا۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں سارو۔ تم تو اچھی خاصی عقلمند ہو۔'' بجو کی حیرت بھی بجا تھی وہ شوخ ضرور تھی لیکن بدتمیز نہیں تھی۔

''بجو! مجھے یہ مسز احمد اور ان کی حواری بالکل اچھی نہیں لگیں۔''

''کیا برائی ہے ان میں؟ کیا چہرے پر لکھا ہوا ہے ان کے کہ وہ اچھی نہیں ہیں؟''

''چہرے پر نہیں لکھا ہوا' ان کی حرکتیں بتاتی ہیں یہ سب۔'' وہ بولی۔ ''مجھے دیکھ کر بھلا انہیں کیسے پتا چل گیا تھا کہ میں قابلِ تعریف ہوں؟''

''اچھا اچھا بس کرو اب۔ یہ ٹرالی لے کر جاؤ لیکن دیکھو کوئی بدتمیزی مت کرنا۔ امی جان کا خیال ہی کر لو کچھ' انہیں تمہاری ان حرکتوں سے شرمندگی ہو گی۔'' بجو نے اسے اچھا خاصا لیکچر دے ڈالا۔

وہ ٹرالی گھسیٹ کر لاؤنج میں لے گئی۔

''چائے تو واقعی بہت اچھی ہے۔'' مسز احمد نے گھونٹ بھر کے تعریف کی۔

''جی میں شکریہ ادا نہیں کروں گی' یہ کام بجو کو ہی کرنا پڑے گا جنہوں نے چائے بنائی ہے اور جو اس تعریف کی اصل حق دار ہیں۔''

''اصل میں اس کے ہاتھ پر چوٹ لگی ہوئی ہے ناں!'' امی ایک بار پھر میدان میں کود پڑیں۔ ''ویسے بھی یہ اپنے ابو جان کی لاڈلی ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ اسے چوٹ لگی ہوئی ہے تو فوراً اسے منع کر دیا کام کرنے سے۔ کہتے ہیں کہ یوں بھی چھٹیوں میں اس سے کام مت لیا کرو۔ تھکی ہاری تو آتی ہے وہاں سے۔'' امی کی بات پر دونوں خواتین نے سر ہلا کر تائید کی۔

''مجھے تو جب پتا چلا کہ آپ میڈیکل پڑھ رہی ہیں تو مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ آپ لائق بھی ہیں کوئی آسانی سے تو نہیں مل جاتا داخلہ میڈیکل میں۔'' مسز احمد شاید اب بھی پُرامید تھیں۔

''آپ کی تعریف کا شکریہ لیکن میں بہت زیادہ لائق نہیں ہوں ورنہ ملتان کے بجائے لاہور کے کسی میڈیکل کالج میں پڑھ رہی ہوتی۔'' سائرہ اطمینان سے بولی۔ ''ویسے آنٹی بہت مزہ آتا ہے جب لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ میں میڈیکل پڑھ رہی ہوں۔ سب خواہ مخواہ امید میں ہو جاتے ہیں یہ سوچ کر کہ میں' کے ای میں پڑھ رہی ہوں۔ میں نے بھی کبھی زحمت نہیں

کی ان کی تصحیح کرنے کی۔ خود ہی ایسا سمجھ لیتے ہیں تو مجھے کیا ضرورت پڑی ہے انہیں یہ بتانے کی کہ میں' کے ای میں نہیں ہوں۔"

"بیٹا! میرا خیال ہے آپ کو آپ کے ابو جان بلا رہے ہیں۔" امی جان نے کہا تو وہ وہاں سے اٹھ گئی۔ ابھی اتنی ڈوز بھی کافی تھی۔

تھوڑی دیر بعد انہیں رخصت کر کے امی کمرے میں آئیں تو ان کا پارہ آسمان پر پہنچ چکا تھا۔

"یہ کیا حرکت تھی سارو؟"

"کون سی؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"اتنی بھولی تو نہیں ہو کہ پتا بھی نہ چلے تمہیں۔"

"امی میں نے اسے منع بھی کیا تھا کہ ایسے بات چیت نہ کرے۔" بجو نے امی کو لقمہ دیا۔

"آپ کی شادی نہ ہونی ہوتی کچھ دن بعد تو میں آپ سے نمٹتی۔" سائرہ بڑبڑائی۔

"پتا ہے کتنا اچھا رشتہ تھا۔ ڈاکٹر تھا لڑکا۔"

"ڈاکٹر؟" وہ چلائی۔ "سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ مجھے گھر کو ہسپتال نہیں بنانا اور امی جان یہ بھی بتا دوں آپ کو کہ میں نے ان کے سامنے کوئی غلط بات نہیں کی تھی۔ سب سچ بولا تھا۔ میڈیکل کالج کے متعلق بھی اور کچن سے ناواقفیت کے متعلق بھی۔ باقی رہ گئی ان کی تعریف تو مجھے منہ پر بلامقصد تعریف کرنے والے بالکل پسند نہیں ہیں۔"

"کوئی جگہ ہوتی ہے' موقع محل ہوتا ہے سچ بولنے کا بھی۔" امی پھٹ پڑیں۔

"یہ تعلیم نہیں دی تھی آپ نے مجھے صرف یہ پتا تھا کہ مجھے سچ بولنا ہے۔ اب یہ تعلیم بھی دے دیں کہ موقع محل اور جگہ کون سی ہونی چاہیے۔" وہ بولی تو امی جان کا پارہ کچھ کم ہوا۔

"سارو جان! یہ بات میں اب سمجھی ہوں کہ کبھی کبھی اپنے اوپر نقاب ڈال لینا کوئی بری بات نہیں ہے۔" ان کی آواز میں دکھ تھا۔

"امی آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں' جھوٹ پر تعمیر ہونے والی عمارت کب تک کھڑی رہ سکتی ہے؟ ہم جو ہیں جیسے ہیں اگر ایسے کسی کو پسند ہیں تو آ جائے لیکن آپ مجھ سے یہ توقع نہ

رکھیں کہ میں خود کو پینٹ کر کے پیش کروں گی۔"

"بیٹا! دنیا بہت کچھ سکھا دیتی ہے۔ ہم نے جینے کے ڈھنگ نہیں سیکھے۔" وہ وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

شام کو پھپھو کی واپسی پر امی جان نے ان کے سامنے بھی یہ ذکر چھیڑ دیا۔

"ابھی بچی ہے' اس لیے نہیں سمجھتی کہ ماں باپ کی کتنی ذمہ داری ہوتی ہے۔ لڑکا ڈاکٹر ہے تو اور بھی اچھی بات ہے' ایسے رشتے روز روز نہیں ملتے۔ کوشش کریں کہ بات بن جائے۔"

"بہن جی! اب تو بہت مشکل ہے۔ میری بیٹیوں کی تربیت بھی تو بہت مختلف ہے۔"

اور ابھی یہ مسئلہ نہیں سلجھا تھا کہ ایک اور دھماکا ہو گیا۔ وہ اور بجو اپنے کمرے میں باتوں میں مشغول تھے کہ بے بی اندر چلی آئی۔

"کچھ پتا چلا؟" اس کے چہرے سے لگ رہا تھا جیسے اس کے پاس کوئی خاص خبر ہے۔

"خیریت تو ہے؟" بجو حسب عادت ایک دم گھبرا گئیں۔

"بالکل خیریت ہے لیکن خبر زوردار ہے۔"

"اللہ! تم نے تو اس دنیا میں مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔" انہوں نے اپنے تکیہ کلام کا استعمال کیا۔

"ظاہر ہے' ہم تو اسی دنیا میں ڈرائیں گے۔ اگلی دنیا میں آپ کو ڈرانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بہت اعلیٰ انتظام کیا ہوا ہے۔"

"اب بک بھی چکو کہ کیا خبر ہے۔" سائرہ نے کہا۔

"ابھی ابھی پھپھو خبر لائی ہیں کہ چاچو' چاچی نے شعیب کی منگنی کر دی ہے۔"

"کیا؟" دونوں اچھل پڑیں۔

"ہمیں بتایا بھی نہیں۔" بجو بے حد حیران تھیں۔

"جی نہیں۔ ان کے خیال میں اس کی ضرورت نہیں تھی۔ صرف تائی اماں اور آغا جان وغیرہ کو بلایا تھا انہوں نے۔"

"Strange wave حیرت ناک۔" سائرہ بولی۔ "پھر کوئی وجہ تو ہو گی نا؟"

"اسٹرینج وغیرہ کچھ نہیں۔ کہہ رہے تھے کہ ہم نے بجو کی شادی کے سلسلے میں مشورہ نہیں کیا تھا ان سے۔"

''لیکن چاچو چاچی میری منگنی میں تو آئے تھے اور اگر انہیں کوئی شکوہ تھا تو اس وقت کہہ سکتے تھے۔''

''کتنی سی دیر کے لیے آئے تھے' بس صرف دستک دینے کی بات کی تھی انہوں نے۔'' بے بی بولی۔

''ایک تو میں امتحانوں کی وجہ سے آپ کی منگنی میں بھی نہیں آسکی تھی۔''

''ہاں تم بہت سی باتوں سے محروم رہ گئی ہو اور سارو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔'' بالآخر بجو نے فیصلہ صادر کیا۔ ''اس سے پہلے کے چار فنکشنوں میں بھی انہوں نے ہمیں مدعو نہیں کیا تھا۔''

''لیکن ان میں سے کوئی فنکشن شعیب کی منگنی جتنا اہم نہیں تھا۔'' بے بی نے رائے دی۔

سائرہ منہ کھولے یہ انکشاف سن رہی تھی۔

''کیا شازی کے بیٹے کی پیدائش کی خوشی کا فنکشن اہم نہیں تھا۔'' بجو بے بی سے بحث میں الجھ گئیں۔ ''کامران ایم اے میں فرسٹ آیا' کیا وہ اہم فنکشن نہیں تھا؟''

''یہ آپ لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں؟'' سائرہ فریاد کرنے والے لہجے میں بولی۔

''شازی کا بیٹا کب پیدا ہوا اور کامران کا رزلٹ کب نکلا؟''

''چھوڑو ان باتوں کو' بہت زخم کھائے ہیں ہم نے۔''

''چلو وہاں برآمدے میں چلتے ہیں' پھپھو جانی بہت خبریں لائی ہیں۔'' گوسپ (چغل خوری) یوں بھی بے بی کا دل پسند مشغلہ تھا اور یہ گوسپ تو تھی بھی بہت دلچسپ اس لیے تینوں ہی باہر برآمدے میں آگئیں۔

''نہ جانے دلوں میں اتنی کدورتیں کیوں ہوگئی ہیں۔ انہوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ وہ تم لوگوں کے گھر کسی خوشی میں شریک نہیں ہوں گے' غمی کی بات البتہ علیحدہ ہے۔'' وہ برآمدے میں پہنچے تو پھپھو جانی امی سے کہہ رہی تھیں۔

''خدا تعالیٰ کبھی اس گھر پر غموں کا سایہ نہ کرے۔'' بجو بول پڑیں۔

''بہن جی! ہم نے تو آج تک ان کے ساتھ برا نہیں کیا پھر بھی اگر وہ اس طرح کے رشتے رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں بتادیں کہ ہم غم بھی اکیلے ہی سہار لیں گے۔ ان کے دیئے بہت سے زخم سہے ہیں ہم نے' یہ بھی سہہ لیں گے۔'' امی نے دکھ سے کہا۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے کسی کو ہمارے غموں میں شریک ہونے کی۔ اور اپنی خوشی میں ہم خود بھی انہیں شریک نہیں کریں گے۔''

''بھابی جان! میرا تو دل ہی دہل گیا جب انہوں نے یہ بات کی۔ چھوٹی بھابی بہت بول رہی تھیں بلکہ ساری پٹی ہی ان کی پڑھائی ہوئی ہے۔'' پھپھو جان نے کہا۔ ''خود سوچیں اس موقع پر یہ کہنا کہ ہم ان کے گھر کی کسی خوشی میں شریک نہیں ہوں گے اس کا کیا مطلب ہے؟''

''اس کا مطلب صاف ظاہر ہے۔'' اب کے پھر بجو بولیں۔ ''وہ میری شادی میں نہیں آنا چاہتے تو ان سے کہہ دیں کہ ہمیں بھی کوئی شوق نہیں ہے انہیں اپنے گھر کی خوشیوں میں شامل کرنے کا کم از کم میری شادی پر ان میں سے کوئی نہیں آئے گا۔''

''بُری بات ہے! ایسے نہیں کہتے' ہمارے اختلافات ہیں کوئی دشمنی تو نہیں ہے۔'' [illegible] جان نے سرزنش کی۔

''ہم نے تو دشمنی نہیں کی ان سے کوئی لیکن انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔'' بجو بولیں۔

''بلائیں گے تو ضرور ہم۔ اب یہ ان کی مرضی ہے کہ وہ آئیں یا نہ آئیں۔''

''بلائیں گے تو انہیں آنا ہی پڑے گا۔'' پھپھو جانی نے قیافہ شناسی سے کام لیا۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے انہیں بلانے کی۔'' بے بی نے بھی اپنی ٹانگ اڑائی۔ ''آ کے بھی انہوں نے ہم پر باتیں ہی کرنی ہیں اس لیے بہتر ہے کہ بھوکے پیٹ ہی باتیں سنا دیں۔''

''ہاں یہ تو ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ آئیں اور پیچھے باتیں نہ کریں۔ ہمیں کیا تکلیف ہے کہ خرچ بھی اپنے پلے سے کریں اور انعام میں ان کی باتیں سنیں۔'' بجو نے اس سے اتفاق کیا۔

''کیا ہی اچھا ہوتا کہ سب مل جل کر اتفاق سے رہتے۔'' پھپھو نے آہ بھری۔

سائرہ انہیں باتیں کرتا چھوڑ کر لاؤنج میں آگئی۔ وہ عزم سے بات کرنا چاہتی تھی۔

''پتا نہیں وہ گھر پر بھی ہوگا یا نہیں اور ہوا تو بھی پتا نہیں کون ریسیو کرے گا۔'' اس نے

نمبر ڈائل کرتے ہوئے سوچا۔

دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔

"ہیلو!" فون مومو نے اٹھایا تھا۔

وہ تذبذب کا شکار ہو گئی۔ مومو سے اس کی بہت اچھی دوستی تھی لیکن وہ اور وقت تھا۔ اب پتا نہیں اس کے دل میں کتنی گرہیں ہوں گی۔ سائرہ نے فون رکھ دیا۔ چند منٹ بعد اس نے پھر فون کیا۔

"ہیلو!" اب دوسری طرف عزم تھا۔

"شکر ہے' تمہاری آواز تو سنائی دی۔"

"اس سے پہلے بھی تم نے ہی فون کیا تھا ناں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں میں نے کیا تھا۔ مومو نے اٹھایا تھا۔"

"میں نے اسی وقت اندازہ لگا لیا تھا کہ تمہارا فون ہوگا۔ اس لیے میں قریب ہی آ گیا۔ کہو ٹھیک ہو ناں؟"

"میں تو ٹھیک ہوں لیکن پھپھو جانی چاچو کی طرف سے گڑبڑ کی اطلاع لائی ہیں۔"

"کیا مطلب؟ گڑبڑ کیسی؟"

"انہوں نے شعیب کی منگنی کر دی' تم لوگوں کو بھی بلایا تو کیا ہم سوتیلے تھے؟"

"یا تو میری عقل بہت چھوٹی ہے کہ میں تمہاری بات سمجھ نہیں رہا یا پھر تم واقعی عجیب بات کر رہی ہو۔"

"کیا مطلب؟ میں عجیب بات کر رہی ہوں تو چاچو نے عجیب وغریب بات کی ہے۔"

"انہوں نے عجیب وغریب بات کی ہے یا تم لوگوں نے؟ ان کے بلانے کے باوجود بھی نہیں آئے تم لوگ اور الزام بھی سارا ان پر؟"

"یا تو میری عقل بہت چھوٹی ہے کہ میں تمہاری بات نہیں سمجھ رہی یا پھر تم واقعی عجیب بات کر رہے ہو۔" سائرہ نے اس کی بات اسی پر پلٹائی۔ "تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہمیں کسی نے انوائٹ نہیں کیا تھا۔"

"یا میں جھوٹ بول رہا ہوں یا تم غلط بیانی سے کام لے رہی ہو۔"

"مجھے ایسا کوئی شوق نہیں ہے اور اپنے متعلق تم زیادہ بہتر طور پر جانتے ہو۔"

"میرے سامنے چاچو' چاچی نے پھپھو جانی کو بطور خاص تاکید کی تھی کہ وہ تم لوگوں کو اطلاع دیں۔"

"اور انہوں نے نہیں بتایا۔" سائرہ چڑ کر بولی۔ "کمال کرتے ہو تم لوگ' یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے پھپھو جانی کو کہا ہو اور انہوں نے نہ بتایا ہو۔"

"شاید وہ بھول گئی ہوں۔" عزم نے خیال ظاہر کیا۔

"جی نہیں نسیان کی بیماری لاحق نہیں ہے' باقی باتیں وہ نہیں بھول سکتیں تو کیا یہی بھول گئی ہوں گی۔"

"باقی کون سی باتیں؟"

"یہی کہ چاچو' چاچی اور تم لوگ ہماری خوشیوں میں شامل نہیں ہوئے' غمی کی بات البتہ اور ہے۔"

"یہ بات تو ہمیں تم لوگوں کی طرف سے موصول ہوئی تھی۔"

سائرہ ایک بار پھر چکرا گئی۔ آخر اصل بات کیا تھی؟ اور پھر اس کے ذہن میں جیسے جھماکا سا ہوا۔

"عزم تم مجھ سے کہیں مل سکتے ہو؟" اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"کیا مطلب؟ تم ایسی بات کہتی تو نہیں ہو۔"

"عزم' یہ بہت ضروری ہے' مسئلے روز بروز الجھ رہے ہیں۔ کل دو خواتین کو میں نے ٹالا ہے' لیکن کب تک؟ اگر ابھی کچھ نہ ہوا تو پھر کبھی بھی نہیں ہوگا۔"

"کیا وہ تمہیں؟" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ہاں وہ مجھے دیکھنے آئی تھیں اور دوسری طرف ہمارے آپس کے مسئلے بری طرح الجھ رہے ہیں۔"

"تم میری طرف آ جاؤ میں تمہاری طرف آ جاتا ہوں۔"

"نہ میں تمہارے آدم خور قبیلے میں آنے کی پوزیشن میں ہوں اور نہ تم میرے پہلوانوں کے اکھاڑے میں' میرا مطلب ہے کہ جب تک حالات درست نہیں ہو جاتے تب تک۔" سائرہ بولی۔ "کہیں اور ملو مجھ سے۔"

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔" وہ ہنسا۔ "اگر یہ واقعی نیکی ہو تو۔"

’’میں نیک نیت سے مل رہی ہوں تم سے۔‘‘ سائرہ نے برا مان کر کہا۔

’’اچھا تو پھر جگہ بھی خود ہی سجیسٹ کرو۔‘‘

’’کل دوپہر پونے ایک بجے بانگ کانگ میں آ جانا لیکن لنچ تمہیں کرانا ہوگا۔‘‘

’’واقعی کافی صاف اور نیک نیت ہے تمہاری۔‘‘ عزم ہنس پڑا۔

’’میری خاطر مقتل سے گزر سکتے ہو لیکن بٹوہ نہیں کھول سکتے اپنا۔‘‘

’’کیا کروں مجبوری ہے۔ مہینے کی آخری تاریخیں ہیں اس لیے میں تمہارے لیے ستارے توڑ کر لا سکتا ہوں، مقتل سے گزر سکتا ہوں، ٹانگیں تڑوا سکتا ہوں، قیس کی طرح لیلیٰ لیلیٰ کی بجائے سوری سائرہ سائرہ کر کے بیابانوں کی خاک چھان سکتا ہوں لیکن نہ تو کار میں پٹرول ڈلوا سکتا ہوں اور نہ ہی لنچ کروا سکتا ہوں۔‘‘

’’مرو دفع ہو۔‘‘ سائرہ کو غصہ آ گیا۔ ’’کیا ساری تنخواہ بری بنانے میں لگ رہی ہے؟‘‘

’’کیسے فوراً جلن شروع ہو گئی ہے۔‘‘ وہ ہنسا۔ ’’چلو تم بھی کیا یاد کرو گی کس رئیس سے پالا پڑا تھا۔ کل تمہیں لنچ کروا کے حاتم طائی کی قبر کو ایک زوردار لات رسید کر ہی دیں گے۔‘‘

’’کوئی ضرورت نہیں ہے، اپنا بل میں خود ادا کروں گی۔‘‘ ابھی سائرہ بول ہی رہی تھی کہ امی جان کے پکارنے کی آواز سن کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

’’جی امی جان!‘‘

’’بیٹا پھپھو جانی کو جائے نماز دے کر اسٹور میں آنا۔ جہیز کی لسٹ پتا نہیں کہاں گم ہو گئی ہے، ابھی وقت ہے ہم نئی لسٹ بنا سکتے ہیں۔‘‘

’’جی امی جان!‘‘ وہ جلدی سے الماری کی طرف بڑھی۔ پھپھو کو جائے نماز دے کر وہ اسٹور روم میں امی جان کی مدد کروانے لگی لیکن اس کا ذہن ابھی تک خاندان کے مسئلوں کی طرف الجھا ہوا تھا۔

’’اگر چاچو اور چاچی نے پھپھو جانی کو شعیب کی منگنی کی اطلاع دینے کی تاکید کی تھی تو انہوں نے یہ اطلاع کیوں نہیں دی۔ اور پھر عزم نے یہ کیوں کہا کہ خوشیوں غموں میں شامل ہونے کی بات ان کی طرف سے کسی نے نہیں کی بلکہ ہم لوگوں نے کہی ہے۔ کتنے بدل گئے ہیں سب ان چار مہینوں میں۔ شعیب تو امی جان کے علاوہ کسی کے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیز کھاتا

تک نہیں تھا اور اب یہی شعیب امی جان کے بغیر کتنے اطمینان سے منگنی کر بیٹھا۔‘‘ سائرہ نے سوچا۔

امی جان کو بھی منگنی میں نہ بلائے جانے کا بے حد رنج تھا۔ ’’یا تو کسی کو نہ بلاتے یا پھر ہر ایک کو خبر کرتے، یہ کیا کہ آدھوں کو بلا لیا اور آدھوں کو چھوڑ دیا۔‘‘ گو کہ وہ اونچی بول رہی تھیں لیکن ان کا مخاطب کوئی نہیں تھا۔ ’’اور وہ شعیب کہا کرتا تھا کہ میری ماں نے تو مجھے صرف جنم دیا ہے۔ میری اصلی امی تو چھوٹی تائی جان ہیں۔ خیر بیٹا جہاں رہو خوش رہو سکھی رہو۔‘‘

’’امی دفع کریں ہمیں کسی سے کچھ نہیں لینا دینا۔‘‘ بجو بولیں۔ ’’آپ کیوں دل جلاتی ہیں اپنا، صرف اپنی اولاد اس دنیا میں اپنی ہوتی ہے اور وہی ساتھ دیتی ہے یہ بات یاد رکھنا ہمیشہ۔‘‘

’’بیٹا! ہم نے تو کبھی کسی کے لیے برا نہیں چاہا میرا تو نمک ہی خراب ہے۔‘‘

’’بس امی آئندہ کسی کو نمک والی چیزیں آفر ہی نہ کیا کریں۔ چینی پر ٹرخا دیا کریں سب کو۔‘‘ بے بی نے امی جان کو نہایت عقلمندانہ مشورہ دیا۔

’’چینی کون سی سستی ہے؟‘‘ بجو بولیں۔

’’کیا منگنی کے وقت میں اسے یاد بھی نہیں آئی ہوں گی۔‘‘ امی جان ابھی تک وہیں پھنسی ہوئی تھیں۔

’’امی! منگنی شادی کے وقت لوگ اپنے سگے ماں باپ کو بھول جاتے ہیں آپ تو صرف تائی ہیں اس کی۔‘‘ بجو نے چاول صاف کرتے کرتے سر اٹھایا۔

’’ہاں بیٹا! یہ بھلا کوئی پائیدار رشتہ ہے۔‘‘ امی نے آہ بھری اور پیٹی سے چیزیں نکالنا شروع کیں۔

سائرہ کو امی جان کی حالت دیکھ کر افسوس ہو رہا تھا۔ کہنے کو تو وہ شعیب کی تائی تھیں لیکن بچپن سے ہی انہوں نے اسے ماں بن کر پالا تھا۔ ان کا دکھ قدرتی تھا۔ جب سے انہیں شعیب کی منگنی کا معلوم ہوا تھا تب سے وہ چپ چپ تھیں۔

’’کیا ہو جاتا جو چاچو چاچی، پھپھو جانی سے کہنے کے بجائے خود ہی امی کو بلا لیتے۔‘‘ سائرہ نے جہیز کی چیزوں کی لسٹ بناتے ہوئے سوچا۔ ’’وہ خود بھی جانتے تھے کہ امی جان شعیب سے کتنی محبت کرتی ہیں اور خود چاچی ہی کہا کرتی تھیں کہ میں نے اپنا یہ بیٹا آپ کے

حوالے کر دیا ہے پرائی اولاد اپنی ہی ہوتی ہے۔ خدمتیں میری ماں سے کروا کے اب بیٹا لے کر الگ ہو گئے ہیں۔ امی کو تو یہ بھی نہیں پتا کہ کس سے منگنی کی ہے اس کی۔''

''بیٹا! میں تو تھک گئی ہوں' باقی کام تم خود ہی کر لو۔'' امی کی آواز سن کر وہ خیالات کی دنیا سے واپس پلٹ آئی۔

''امی جان! آپ آرام کریں' میں کر لوں گی۔'' وہ جانتی تھی کہ منٹوں میں کام نمٹا لینے والی اس کی امی جان اتنی تھکی تھکی کیوں ہیں۔

سارا دن گھر میں خاموشی رہی۔ امی جان نے جب ابو کو یہ خبر سنائی تو انہیں بھی بہت شاک پہنچا لیکن انہوں نے صرف اتنا کہا۔

''ہر ایک کی اپنی مجبوری ہوتی ہے پتا نہیں انہیں کیا مجبوری تھی کہ ہمیں خبر نہیں کی۔'' لیکن صاف دکھائی دے رہا تھا انہیں دکھ ہوا ہے۔

''اتنے چپ چپ تو امی جان اور ابو اس وقت بھی نہیں تھے جب پھپھو جانی نے شازی کے بیٹے کی پیدائش کی خوشی کرنے کی خبر دی تھی اور پھپھو جب کامران کے فرسٹ آنے پر دی جانے والی پارٹی میں انہوں نے ہمیں نہیں بلایا تھا تب بھی دونوں پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا تھا لیکن آج تو دونوں ہی۔'' بے بی نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''بہت سمجھایا ہے میں نے امی جان کو لیکن پتا نہیں کیوں اتنا اثر لیا ہے انہوں نے اس بات کا۔'' بجو نے کہا۔

سائرہ چپ چاپ لیٹی ان کی گفتگو سن رہی تھی۔ وہ اس مسئلے کو حل کرنا چاہتی تھی۔ اپنے لیے' عزم کے لیے' کیوں کہ موجودہ حالات میں یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ ان کا بندھن بندھ سکتا۔ انہوں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ درمیان میں کوئی دیوار بھی آ سکتی ہے۔ اگر یہ علم ہوتا تو شاید ان کے درمیان کوئی عہد و پیمان ہوتے لیکن چونکہ تمام حالات ان کے حق میں تھے اس لیے اس بات کی طرف کبھی ان کی توجہ ہی نہیں گئی تھی۔ کبھی کبھار عزم یا کوئی اور کزن شوخی میں اس بات کا ذکر کر بیٹھتا تھا لیکن سائرہ کی لاابالی طبیعت نے کبھی اس بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ یوں بھی اسے ہر وقت اپنے باغ اور پڑھائی کی فکر کھائی رہتی تھی۔ اب خود کو ان حالات میں جکڑے دیکھ کر اسے احساس ہوا تھا کہ عزم اس کی زندگی کا ایسا حصہ ہے جسے وہ خود سے کبھی جدا نہیں کر سکتی۔ اب انہی دونوں کو کچھ کرنا تھا۔ کل اسے عزم سے ملنا تھا لیکن کسی کو بھی

کچھ بتائے بغیر' وہ ایسا کرنا نہیں چاہتی تھی لیکن حالات درست کرنے کے لیے ایسا کرنا بہت ضروری تھا اور یہ اس کی مجبوری تھی۔ اسے امی جان سے بہانے سے اجازت لینی تھی۔ حالات درست ہوتے تو اسے کسی نے منع نہیں کرنا تھا لیکن اب سب کچھ تبدیل ہو چکا تھا۔ جو کچھ وہ چھوڑ کے گئی تھی' وہ سب کچھ بدل چکا تھا۔

''امی جان! آج ہم فرینڈز نے لنچ اکٹھے کرنا ہے۔'' اس نے صبح ناشتے کے دوران امی کو بتایا۔

''کہاں کرنا ہے؟''

''ہانگ کانگ میں کرنے کا ارادہ ہے۔''

''کس کے ساتھ جاؤ گی؟'' پھپھو نے پوچھا۔

''اکیلی ہی جاؤں گی۔'' وہ بولی۔ ''اصل میں لاہور کی جتنی لڑکیاں وہاں ملتان کے میڈیکل کالج میں پڑھتی ہیں وہ سب ہوں گی۔''

''دھیان رکھنا بیٹے' زمانہ بہت خراب ہے۔'' پھپھو نے حسبِ عادت بیسویں صدی میں کیڑے نکالنے شروع کر دیے۔ ''اپنی بچیوں پر تو اعتبار ہے ہمیں لیکن زمانے پر اعتبار نہیں ہے' اچھا ہوتا کوئی مرد بھی تم لوگوں کے ساتھ ہوتا۔''

''واہ پھپھو!'' سائرہ ہنسی۔ ''گیدڑ کی شامت آئے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے اور کسی مرد کی شامت آئے تو وہ ہم جیسی بیس لڑکیوں کے ٹولے کا۔ پتا ہے ہم کیا درگت بناتے ہیں ایسے بندے کی۔''

''توبہ کرو بچی توبہ کرو' کیسی باتیں کر رہی ہو۔''

''پھپھو! یہ ناقابلِ اعتبار زمانہ بیسویں صدی کا ہے تو ہم بھی بیسویں صدی کی ہی لڑکیاں ہیں۔''

''بھابی جان سنا آپ نے؟'' پھپھو جانی اس کی بات سن کر بالکل ہی دہل گئیں۔

''اٹھو سارو! اپنا کمرہ ٹھیک کرو۔'' امی جان نے آنکھ کے اشارے سے اسے وہاں سے اٹھنے کا حکم دیا۔

''پھپھو کے سامنے ایسی باتیں مت کیا کرو۔'' بعد میں انہوں نے اسے ڈانٹا۔

''خود بتائیں میں نے کوئی غلط بات کی تھی بھلا؟''

''وہ تمہارے اس قسم کے مذاق کو نہیں سمجھتیں' تم جو کہو گی اسے بالکل سچ سمجھیں گی وہ۔ گاؤں کی بھولی بھالی خاتون ہیں۔''

''امی! گاؤں کے لوگ ہم شہر والوں سے زیادہ تیز ہوتے ہیں' اور اب کیا ان کی خاطر ہم منہ بند کر کے بیٹھ جائیں۔'' اس نے منہ بنایا۔

''یہ کس نے کہا ہے میری جان۔ اتنے دن بعد تو آئی ہو تم۔'' امی نے اسے چمکارا۔ ''میرے ساتھ چاہے جتنی باتیں کرو' جو دل چاہے وہ باتیں کرو لیکن پھپھو کے سامنے ایسی باتیں نہ کیا کرو۔ وہ اس قسم کی باتوں کی عادی نہیں ہیں۔ کیا پتا کون سی بات انہیں ناگوار محسوس ہو۔''

☆=====☆=====☆

وقتِ مقررہ پر وہ ہانگ کانگ کے خنک ماحول میں داخل ہوئی۔ بائیں کونے کی آخری میز پر عزم بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

''تم پہلے ہی آئے ہوئے ہو؟'' اس نے بے تکا سوال کیا۔

''نہ صرف آیا ہوا ہوں بلکہ دیدہ و دل فرشِ راہ کیے ہوئے ہوں تم نے یاد کیا تھا کیسے نہ آتا۔''

''شعر و شاعری میں دیدہ و دل فرشِ راہ کرنا کتنا اچھا لگتا ہے لیکن حقیقت میں نہ تو کوئی عاشق دیدہ و دل فرشِ راہ کر سکتا ہے اور نہ شہر بدر ہو کے بیابانوں کی خاک چھان سکتا ہے۔'' سائرہ نے اپنے لیے کرسی گھسیٹی۔ ''اس لیے میں ان باتوں میں آنے والی نہیں ہوں۔ اپنے پیسے میں خود ہی ادا کروں گی۔''

''دوبارہ یہ بات منہ سے نکالی تو چیچ ڈونگوں سمیت تمہیں باہر پھینک دوں گا۔''

''جانتی ہوں میں تمہارے بازوؤں میں بہت طاقت ہے اور تم مجھ پر اس کا استعمال کر سکتے ہو۔''

''تمہاری تمام تر اشتعال انگیز گفتگو کو میں پیپسی کے ساتھ پی جانا چاہتا ہوں۔''

اور بعد میں کھانے کے دوران سائرہ نے وہ گفتگو شروع کی جس کے لیے اس نے عزم سے باہر ملنے کو کہا تھا۔

''عزم! اصل میں مَیں نے تم سے ایک خاص بات کرنی تھی۔''

''مجھے بھی کرنا تھی۔'' وہ بولا۔ ''سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ کون تمہیں دیکھنے آیا تھا اور کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟''

''نہیں گڑبڑ نہیں ہوئی۔ بچت ہو گئی ہے۔ میں نے ان کے ساتھ کسی حد تک بدتمیزی بھی کر دی اور بعد میں امی جان سے ڈانٹ بھی کھائی۔'' پھر اس نے تفصیل سے تمام بات عزم کو بتا دی۔

''ہوں!'' اس نے پُرخیال انداز میں سائرہ کی طرف دیکھا۔ ''تو تمہارے امی ابو واقعی اس رشتے کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔''

''وہ کیا چاہتے ہیں یہ الگ بات ہے۔'' سائرہ نے کہا۔ ''اگر ابھی بھی حالات بہتر ہو جائیں تو تمام رشتہ داریاں دوبارہ قائم ہو سکتی ہیں۔''

''میں تو سوچ سوچ کے تھک گیا ہوں۔''

''کل تم سے گفتگو کر کے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ ہماری تمام تر غلط فہمیوں کا محور پھپھو جانی کی ذات ہے۔''

''کیا مطلب؟ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟'' اس نے کھانے سے ہاتھ روک کر پوچھا۔

''بہت سادہ سی بات ہے اور یہ بات میں تم سے اس لیے کر رہی ہوں کہ کوئی اور یہ بات مانے گا نہیں بلکہ الٹا مجھے ہی ڈانٹ پڑ جائے گی۔'' سائرہ نے نیپکن سے ہاتھ صاف کیے۔ ''بات یہ ہے کہ آج کل سب گھروں میں صرف پھپھو جانی کا ہی آنا جانا ہے اور تمام پیغام رسانی کا واحد ذریعہ وہی ہیں۔ تم نے کہا تھا کہ چاچو نے بطورِ خاص انہیں تاکید کی تھی کہ ہم شعیب کی منگنی میں شامل ہوں جب کہ انہوں نے نہ صرف ہمیں ایسی کوئی اطلاع نہیں دی بلکہ وہاں سے آنے کے بعد وہ مسلسل اس بات پر اظہارِ افسوس کر رہی تھیں کہ انہوں نے ہمیں نہیں بلایا اور انہوں نے تو یہاں تک بھی کہہ دیا کہ تم لوگوں نے ہمارے گھر کی خوشیوں میں شامل ہونے سے انکار کر دیا ہے۔'' سائرہ مسلسل بول رہی تھی۔ ''اب صرف تین باتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تم جھوٹ بول رہے ہو یا میں اور یا پھر پھپھو جانی۔''

''بات تو کچھ سمجھ میں آ رہی ہے لیکن سارو پھپھو جانی بھلا ایسا کیوں کرنے لگیں؟''

''ان کا تو نہیں پتا البتہ اپنا اور تمہارا کہہ سکتی ہوں کہ ہمیں اس قسم کی غلط فہمی سے فائدہ نہیں سراسر نقصان ہی ہے اس لیے کم از کم ہم یہ بات نہیں کر سکتے۔''

"لیکن پھپھو جانی ہم سے بہت زیادہ پیار کرتی ہیں۔" عزم نے اعتراض کیا۔

"میں نے کب انکار کیا ہے۔ بظاہر تو وہ واقعی بہت پیار کرتی ہیں۔"

"کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ یہ محبت صرف ظاہری ہے۔"

"پتا نہیں۔ میں بغیر ثبوت کے ان پر الزام کیسے لگا سکتی ہوں۔"

"پھر آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"صرف یہ کہ جب پھپھو جانی تم لوگوں کی طرف جائیں تو تم سب کی نظر بچا کر ان کی باتیں ٹیپ کر لینا میں بھی یہی کروں گی خود ہی سب دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔"

"میں ایسا کرنا نہیں چاہتا لیکن صرف اس لیے کروں گا تاکہ تمہارے خدشے دور ہو جائیں۔"

"تم کرتو لو چاہے جو بھی سوچ کر کرو۔"

اور گھر جا کر سائرہ ایسے موقع کی تلاش میں رہی جب پھپھو خاندان سے متعلق کوئی بات اس سے کریں اور وہ اطمینان سے سب کچھ ٹیپ کر لے۔ اس کا چھوٹا سا ڈکٹا فون اس کے پاس تھا' جو کبھی کبھی کلاس میں لیکچر ٹیپ کرنے کے کام آتا تھا۔

"پھپھو جانی! آج آپ چاچو چاچی کی طرف گئی تھیں؟" بالآخر اس نے مناسب موقع دیکھ کر خود ہی گفتگو شروع کر دی۔

"نہیں بچی دل ہی نہیں کیا جانے کا۔" وہ بولیں۔ "کیا کرتی جا کر؟ یہاں بھابی جان کو افسردہ دیکھتی ہوں تو دل کٹ کر رہ جاتا ہے۔ کتنا پیار کرتی ہیں شعیب سے اور انہیں تو اتنی توفیق بھی نہیں ہوئی کہ منگنی پر جھوٹے منہ ہی پوچھ لیتے۔"

"پھپھو جانی! انہوں نے مٹھائی بھی تقسیم نہیں کی تھی؟"

"مٹھائی؟ ارے ٹوکرے تھے بھرے ہوئے مٹھائی کے کہاں کہاں نہیں بانٹی۔"

"ہم سے ناراضگی تھی ان کی' دشمنی تو نہیں تھی۔"

"بس بچی! منہ سے کچھ کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ کہیں غیبت ہی نہ ہو جائے۔"

"پھپھو سارا گناہ میرے سر' آپ بتائیں۔"

"تمہارے مجبور کرنے پر کہہ رہی ہوں جو لوگ تمہارے غم خوشی میں شریک نہ ہونا چاہتے ہوں انہوں نے تم لوگوں کو اپنی خوشیوں میں کیا شامل کرنا ہے۔"

"لیکن شعیب تو امی جان سے بہت محبت کرتا ہے۔"

"کرتا تھا کہو' کرتا تھا۔ جوان اولاد ماں باپ کو نہیں پوچھتی تو تایا تائی کو کیا پوچھے گی۔ اس نے تو مڑ کے پوچھا بھی نہیں کہ کسی نے تائے تائی کو بھی اطلاع بھجوائی ہے یا نہیں۔"

"ویسے آنا تو اسے خود چاہیے تھا۔"

"ہونے کو تو بہت کچھ ہونا چاہیے لیکن......" وہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر خاموش ہو گئیں۔

"چپ کیوں ہو گئیں پھپھو جانی!" سائرہ بولی۔

"سوچتی ہوں کہ کیا ہی اچھا ہوتا جو بزرگوں کے اختلافات تم لوگوں تک نہ پہنچتے۔ تم سے زیادہ اچھی بہو ملے گی بھابی جان کو۔"

چھوڑیں پھپھو جانی سب مقدر کی بات ہے۔ جہاں اللہ نے چاہا وہاں شادی ہو جائے گی۔"

"ہاں ہاں کوئی کمی تو نہیں ہے میری بچی میں۔ انہیں تم بدصورت لگتی ہو تو صرف اس لیے کہ بیٹا اچھا کما رہا ہے۔ شکل صورت بھی اچھی ہے' لیکن میں نے تو بھابی سے کہہ دیا تھا کہ چاہے ملکہ حسن لے آئیں میری سارو کے مقابلے میں سب صفر ہیں۔ پر میری بات کوئی سنے تو۔" وہ ایک بار پھر افسردہ ہو گئیں۔ "میں تو کہتی ہوں بچی کہ چھوڑو ان لوگوں کا خیال جو تم جیسے ہیرے کی قدر نہیں کر سکے۔ میں نے وہ ڈاکٹر دیکھا ہے۔ صورت شکل میں عزم جیسا نہیں ہے تو اتنا برا بھی نہیں ہے۔ اسی جتنا کما بھی رہا ہے' اس کے لیے ہاں کر دو۔"

"لیکن میں نے تو خاصی بدتمیزی کر دی تھی ان سے۔"

"وہ میں سنبھال لوں گی۔ آخر کس کے لیے ہوں یہاں۔ تم ہاں کرنے والی بنو۔"

"مجھے تو عزم پر حیرت ہے۔" اس نے بات پلٹی۔

"حیرت کاہے کو کرتی ہو۔ مرد ذات ہے وہ' اس کا کیا بھروسہ کل تک کہتا تھا کہ مر جائے گا لیکن شادی تم ہی سے کرے گا اور آج یہ حال ہے کہ خود اپنے منہ سے کہتا ہے کہ اماں لڑکی گوری ہو' ناک ستواں ہو' بال لمبے ہوں' پڑھی لکھی چاہے ہو یا نہ ہو لیکن ہو اونچے خاندان کی۔ پیسے والے گھرانے کی لڑکی کو خود ہی اٹھنا بیٹھنا آ جاتا ہے۔"

"دیکھ لوں گی کہ کیسی ملتی ہے اسے۔"

"تو کیوں فکر کرتی ہے میری بچی' کوئی کمی تو ہے نہیں تجھ میں۔ ایک سے ایک اچھا رشتہ

موجود ہے۔تُو ہاں کرنے والی تو بنے۔"

سائرہ نے ٹیپ سنبھال کر رکھ لی۔شام ہی کو پھپھو جانی آغا جان اور تائی اماں سے ملنے کو بے چین ہو گئیں۔

"چاہے جیسے بھی ہیں پر ہیں تو میرے اپنے بھائی جان۔" انہوں نے چپل گھسیٹے سائرہ کے تو دل کی کلی کھل اٹھی۔سارا کام خود ہی آسان ہو رہا تھا۔

"رات کا کھانا یہیں آ کر کھانا۔" امی جان نے کہا۔

"جی بھابی جان یہیں آ جاؤں گی۔وہاں یوں بھی میرا دل نہیں لگتا۔سارو کی شکل نگاہوں میں پھر جاتی ہے۔"

"بہن جی! میری سارو لاوارث نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ کے فیض سے باپ کا سایہ ہے سر پر۔ہمیں زبردستی کسی کے سر پر مسلط ہونے کا شوق نہیں ہے۔" امی جان نے تلخی سے کہا۔

رات کو پھپھو جانی کی واپسی کے تھوڑی ہی دیر بعد فون کی گھنٹی بجی۔ابو جان نے فون اٹھایا تو دوسری جانب سے کال کاٹ دی گئی۔

"ہو نہ ہو عزم کا فون ہو گا۔" سائرہ نے سوچا اور فون کے قریب والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد پھر فون کی گھنٹی بجی تو اس نے ریسیور اٹھایا۔ٹی وی پر حالاتِ حاضرہ لگا ہوا تھا اس لیے سب ہی گپیں لگانے میں مصروف تھے۔

"ہیلو!" اس نے کہا۔

"ہیلو نصر میں عزم بول رہا ہوں۔کب سے تمہیں ٹرائی کر رہا تھا۔" دوسری طرف عزم ہی تھا لیکن شاید اکیلا نہیں تھا۔

"میں تو ٹھیک ہوں تم کیسی ہو صائمہ۔" اس نے کن اکھیوں سے اردگرد دیکھا لیکن کوئی بھی متوجہ نہیں تھا۔

"تم نے جو کام دیا تھا وہ میں نے کر لیا ہے۔"

"کیا فزیالوجی کا؟"

"ہاں انہی فائلوں کا۔" عزم بولا۔

"اچھا تو پھر مجھے نوٹس کب دو گے؟" دونوں محتاط انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔

"جب تم کہو گی۔"

"اچھا تو تم نے کل لبرٹی شاپنگ کے لیے جانا ہے۔" سائرہ نے کہا۔"میرا بھی جانے کا ارادہ ہے۔بجو کے لیے چیزیں لینی ہیں وہی جہیز کی۔"

"تو میں آ جاؤں گا۔"

"زیادہ چیزیں این ایم سے ہی لینی ہیں کل چھ بجے۔"

"اوکے تمہیں تمہاری چیزیں مل جائیں گی۔" وہ بولا۔

"اور تمہیں بھی۔"

دونوں نے فون رکھ دیا۔سائرہ کو این ایم جانے کا شدت سے انتظار تھا۔اس نے جو اندازہ لگایا تھا اگر وہ درست تھا تو حالات یقیناً درست ثابت ہو سکتے تھے ورنہ نہیں۔ٹھیک چھ بجے جب بجو نے این ایم کے سامنے کار پارک کی تو عزم کی کچھ دور کھڑی کار سب سے پہلے بے بی کو نظر آئی۔

"لگتا ہے عزم بھائی بھی یہیں کہیں ہیں۔"

"شش چپ کرو۔" سائرہ نے آہستہ آواز میں اسے ڈانٹا۔شکر تھا کہ امی جان نے آگے آگے چلنے کی وجہ سے بے بی کی بات نہیں سنی تھی۔

"تو کیا تم نے بلایا ہے انہیں؟" بے بی نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"ہاں لیکن پلیز یہ بات اپنے تک رکھنا اور امی اور بجو کو کہیں دائیں بائیں الجھائے رکھنا۔"

"کم از کم اتنی عقلمندی دکھا دیتیں کہ جب امی اور بجو کے ساتھ تھیں تو انہیں نہ بلواتیں۔"

"بس تم اپنے مشورے اپنے پاس رکھو اور جو تم سے کہہ رہی ہوں تم صرف وہ کرو۔"

"ہم تو تمہارے بھلے کو کہہ رہے تھے لیکن خیر اب تو جو ہوا سو ہوا' آگے کا ہمیں کو سنبھالنا ہو گا۔"

"امی وغیرہ بیسمنٹ میں چلے گئے اور سائرہ مردوں کے گارمنٹ کے سیکشن کی طرف چلی گئی۔

"مجھے دیر تو نہیں ہوئی؟" اس نے عزم سے پوچھا۔

"بالکل نہیں' مجھے تمام رات بھی تمہارا انتظار کرنا پڑتا تو وہ بھی کرتا۔"

"بس کرو مجنوں کی اولاد۔" سائرہ ہنسی۔ "یہ رہی تمہاری کیسٹ۔"

اس نے بیگ سے ایک کیسٹ نکال کر عزم کے حوالے کی۔ عزم نے بھی اسے ایک پیکٹ پکڑا دیا۔

"کافی بھاری ہے۔" سائرہ نے پیکٹ بیگ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "وزن سے تو لگتا ہے جیسے پھپھو نے سال بھر کی باتیں صرف چند گھنٹوں میں کہہ ڈالی ہیں۔"

"گھر جا کر دیکھ لینا۔" عزم نے کہا "اور اب جاؤ یہاں سے امی جان نے دیکھ لیا تو میری ٹانگوں کی خیر نہیں۔"

وہ ہنستے ہوئے وہاں سے ہٹ آئی۔ ساری شاپنگ کے دوران وہ کیسٹ سننے کے لیے بے چین رہی اور شاپنگ تھی کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

"تم نے اتنی جلدی عزم بھائی سے بات بھی کر لی۔" بے بی نے موقع دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔

"کیوں مجھے کتنی لمبی بات کرنی چاہیے تھی۔"

"ہمارا مطلب ہے شکوے شکایت میں تو کافی وقت درکار ہوتا ہے۔"

"تم سے کس نے کہہ دیا کہ ہم شکوے شکایت کر رہے تھے؟"

"پھر بھی بڑی جلدی واپس آ گئیں تم۔ ہم تو سوچ رہے تھے کہ پتا نہیں امی اور بجو کو کن کن حیلوں سے روکنا پڑے۔"

خدا خدا کر کے رات ساڑھے نو بجے وہ گھر پہنچے۔

"امی مجھے کھانا نہیں کھانا۔" اس نے کیسٹ سننے کی جلدی میں آج کھانا گول کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔

"کیوں میری لاڈو!" پھپھو جانی بول پڑیں۔ "دیکھا ہے کتنا بے رونق لگ رہا ہے تمہارا چہرہ۔ پتا نہیں آج کل کی لڑکیوں کو کیا بیماری ہو گئی ہے' چہرہ بے رونق' رنگت سنولائی ہوئی' دبلی دبلی سی لڑکیاں۔ کیا کہتے ہوں گے باہر والے کہ کیا گھر میں انہیں کچھ کھانے کو نہیں ملتا۔"

"پھپھو جانی کا لیکچر سننے سے تو بہتر تھا کہ تم کھانا کھا لیتیں۔" بے بی نے آہستگی سے کہا تو اس نے بھی اس میں بچت جانی لیکن یہاں حساب وہی تھا۔ سو پیاز سو جوتوں والا۔ کھانا

بھی کھانا پڑا اور پھپھو جانی کا لیکچر بھی جاری رہا۔ کھانا کھاتے ہی وہ اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔ دروازے کی کنڈی چڑھائی اور کیسٹ نکالنے کے لیے پیکٹ کھولا۔ پیکٹ میں نہ صرف کیسٹ تھی بلکہ فرنچ پرفیوم کی بڑی سی بوتل بھی تھی۔

"اچھا تو سارا وزن اس کا تھا۔" وہ مسکرائی۔

بوتل ڈریسنگ ٹیبل پر سجائے وہ کیسٹ کی طرف متوجہ ہوئی۔

"یہ سوٹ اچھے ہیں ناں؟" تائی جان کی آواز کیسٹ پلیئر پر ابھری۔ "سارو پر نیلا اور گلابی رنگ کتنا اچھا لگتا ہے۔"

"بھابی جان بہت بھولی ہیں آپ جو سارو کے لیے بری بنا رہی ہیں۔" یہ پھپھو جان کی آواز تھی۔

"کیوں بہن جی پھر کوئی بات ہوئی کیا؟" تائی اماں نے تشویش سے پوچھا۔

"چھوڑیں بھابی جان کچھ کہہ دیا تو غیبت ہوگی۔"

"لیکن آپ بتائیں کیا بات ہوئی ہے میں جو پوچھ رہی ہوں۔"

"بھابی جان! آپ کے اصرار پر بتا رہی ہوں ورنہ بات کرتے کلیجہ کٹتا ہے۔" پھپھو نے ہمیشہ کی طرح تمہید باندھی۔ "وہ تو بیٹی کی شادی میں بھی نہیں بلا رہے آپ کو۔"

"کیوں نہیں بلا رہے؟"

"کہتے ہیں آپ لوگوں نے کھا پی کے بھی باتیں ہی سنائی ہیں اس سے تو اچھا ہے بھوکے پیٹ باتیں سنا دیں۔"

"ہم کوئی بھوکے ننگے تو نہیں رہتے اپنے گھر میں۔" مومو نے تاؤ میں آ کر کہا۔

"تم چپ کرو مومو؟" تائی جان نے اسے ڈانٹا۔ "پھر کیا ہوا؟"

"پھر کیا بھابی جان۔ اگر ماں باپ چپ بھی ہوں تب بھی تینوں بیٹیاں بولنے کا فرض بہت اچھا ادا کرتی ہیں۔ ہاں بیسویں صدی کی نسل ہے۔ یوں بھی ماں باپ کو بہت گھمنڈ ہے کہ بیٹی ڈاکٹری پڑھ رہی ہے۔"

"لیکن سارو بہت مختلف لڑکی ہے۔"

"چھوڑیں بھابی جان' کل تو میں توبہ تائب ہو گئی یوں تو اب عزم سے اس کی شادی کے سب ہی مخالف ہیں' گھر میں لیکن اس سے بات کرو تو اسے پتنگے ہی لگ جاتے ہیں کہتی

ہے میرے لیے وہی رہ گیا ہے کیا؟ ابھی ایک ڈاکٹر سے اس کا رشتہ طے ہونے والا ہے۔'' پھپھو نے رازداری سے بتایا۔

''کیا؟'' تائی اماں تو بوکھلا ہی گئیں۔ ''کون ہے وہ؟''

''بس نہ ہی پوچھو کون ہے اور کیسا ہے' پتا نہیں بھابی اور بھائی جان کو اس میں کیا نظر آیا ہے۔ ہاں کمائی ٹھیک ٹھاک ہے اس لیے شاید اس طرف گئے ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ یہی رشتہ ان کی نظر میں تھا جبھی تو عزم سے انکار کیا ہے۔''

''میرا عزم کم تو نہیں کماتا۔'' تائی اماں کے لہجے میں دکھ تھا۔

''صورت شکل کا کیسا ہے؟'' مومو نے پوچھا۔

''کچھ نہیں' صورت نہ شکل' جن پہاڑوں نکل۔'' وہ بولیں۔ ''ایک ہمارا عزم ہے اتنا چاند سا اور ایک وہ کہ دیکھنے کو بھی دل نہ چاہے۔''

''میں بھائی جان کے پاؤں پکڑ لوں گی سارو کے لیے۔''

''اماں آپ کو کیا تکلیف ہو رہی ہے۔'' مومو چڑ کر بولی۔ ''وہ اپنی بیٹی دینا نہیں چاہتے اور آپ مُصر ہیں لینے کے لیے' دنیا میں لڑکیاں مر تو نہیں گئیں اور ہمارے بھائی کو کون سی کمی ہے۔ رشتوں کی' کتنے لوگ آس میں بیٹھے ہیں۔ ہاں اگر آپ کو اپنی بے عزتی کروانے کا شوق ہے تو جائیں اور ضرور پاؤں پکڑیں لیکن یہ یاد رکھیں کہ میں اسے بطور بھابی تسلیم نہیں کر سکتی۔''

''کس کے پاؤں پکڑیں گی بھابی جان۔ اس گھر میں ہمارے بھائی کا عمل دخل ہی کتنا ہے' آپ کو بہت شرمندگی ہو گی وہاں جا کر جب خود لڑکی کی ہی مرضی نہ ہو تو کوئی کیا کر سکتا ہے' وہ تو کہتی ہے کہ اس گھٹیا خاندان میں شادی کرنے سے بہتر ہے کہ کنواری ہی مر جاؤں۔''

''اللہ نہ کرے۔'' تائی اماں کی آواز آئی۔

''مر جائے کنواری' ہماری بلا سے' ہم پہ احسان نہیں ہے۔'' مومو غصے سے بولی۔

''کتنا کہا کہ شعیب تڑپ رہا ہے' چلیے چلو اس کی منگنی پر لیکن بس دلوں میں گرہیں پڑ گئی ہیں۔'' پھپھو نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ''پہلے آغا جان کی بیماری کا بتایا تھا تب بھی بھابی جان نے کہہ دیا کہ اچھے خاصے ہٹے کٹے ہیں۔ کچھ نہیں ہو گا انہیں۔''

''ان سے کیا شکوہ کرنا لیکن بہن جی آپ بتائیں۔ میں کیا کروں میں نے تو اپنی مومو سے بھی بڑھ کے پیار دیا ہے سارو کو۔'' تائی اماں بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔

''بس بھابی صرف اپنی اولاد ہی اپنی ہوتی ہے۔ شازی کے بیٹے کی خوشی تھی میں جو سے پر زور دیتی رہی لیکن انہوں نے شامل ہونا گوارا نہ کیا۔ کامران ماشاء اللہ فرسٹ آیا۔ انہوں نے کہہ دیا کہ کون سا کمال کیا ہے اس نے۔''

''سب سے زیادہ زیادتی شعیب کے ساتھ ہوئی ہے۔'' مومو نے افسردگی سے کہا۔ ''رات نو بجے تک گیٹ پہ کھڑے ہو کر انہوں نے انتظار کیا تھا۔''

''تو کیا ارسلان کے ساتھ نہیں ہوئی زیادتی' خاندان کا دیکھا بھالا لڑکا تھا لیکن پتا نہیں جی میں کیا آئی کہ ظفر سے رشتہ طے کر ڈالا۔ میں نے سوچا منگنی ہی ہوئی ہے نکاح تو نہیں ہوا ناں۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔'' پھپھو انکشافات کر رہی تھیں۔ ''بے چارا ارسلان بند کمرے میں سگریٹ پہ سگریٹ پھونکے جا رہا تھا۔ آخر پھپھو ہوں اس کی' کب تک برداشت کر سکتی ہوں۔ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ سمجھا بجھا کے بمشکل اسے راضی کیا بجو کے پاس جانے کے لیے کہ ایک مرتبہ پوچھ تو لو کہ کہیں اماں ابوا نے رشتہ زبردستی تو طے نہیں کر دیا۔ آخر خاندان کا لڑکا تھا' کیا پتا بجو نے کبھی اس کے متعلق سوچا ہو۔ بس اتنی سی بات پر اس لڑکی نے اسے بے نقط سنائیں کہ بس نہ ہی پوچھو۔''

''وہ تو خیر بڑی اماں کی بھی غلطی تھی کہ انہوں نے کبھی ذکر نہیں کیا ارسلان بھائی کا۔''

''یہ بھی کہنے کی بات ہے ذکر نہیں کیا۔ میں نے دبے دبے انداز میں بات چلانے کی کوشش کی تھی لیکن میں ہوں ہی کس کھاتے میں۔ کسی نے توجہ ہی نہیں دی۔'' یہ ایک نیا انکشاف تھا۔ ''اور چلو مان لیا کہ کسی نے ذکر نہیں کیا تب بھی کم از کم رشتے میں ہی صلاح لے لیتے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' مومو نے تائید کی۔

''اچھا اب میں چلوں واپس۔ دیر ہو رہی ہے۔'' پھپھو نے چپل گھسیٹے۔

''کہاں چل دیں کھانا تیار ہے کھا کر جائیں۔'' تائی اماں کی آواز آئی۔

''دل تو میرا بھی چاہتا ہے لیکن کیا کروں' بھابی جان کو ناگوار گزرتا ہے۔''

''یہ بھی تو آپ کی بھابی کا گھر ہے۔''

"ہے تو لیکن مجبوری ہے وہاں بجو کی شادی کا سارا کام میرے سر ہے' وہ کون کرے گا۔"

اس کے بعد کیسٹ خالی تھی۔

"تو میرے خدشے درست تھے۔" سائرہ نے سوچا۔ "لیکن پھپھو کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ اٹھ کر امی جان کے کمرے میں آ گئی۔ امی جان اور ابو دونوں ہی جاگ رہے تھے۔ ابو جان حسب معمول اخبار پڑھ رہے تھے اور امی جان رسالہ۔

"مجھے آپ لوگوں سے ایک بات کرنی ہے۔" اس نے کہا۔

"کریں بیٹا۔" ابو جان نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ وہ ہمیشہ ایسی ہی توجہ سے بچوں کی بات سنتے تھے۔

"ابو جان یہ کیسٹ میں نے آپ کو اور امی جان کو سنوانی تھی۔"

"بیٹا! صبح سنیں گے' اس وقت تو میں اخبار پڑھ رہا ہوں۔"

"ابو جی یہ کوئی عام کیسٹ نہیں ہے' یہ بہت اہم ہے' اس میں پھپھو جانی کے بہت سے انکشافات ہیں۔"

"کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔"

"لیکن بیٹا! مجھے آپ کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

"ابھی آ جائے گی ابو جان' سب سمجھ میں آ جائے گی۔ میں ذرا بے بی اور بجو کو بھی بلا لاؤں۔"

بجو اور بے بی ابھی جاگی ہوئی تھیں۔ وہ انہیں لے کر ابو امی کے کمرے میں آ گئی۔

"سب سے پہلے تو میں آپ کو یہ بتا دوں کہ میں نے ان چند دنوں میں کچھ کام آپ لوگوں کی مرضی کے بغیر یعنی چھپ چھپ کر کیے ہیں میں کبھی ایسا نہ کرتی لیکن مجبوری تھی' اور ابھی کچھ دیر میں آپ لوگ بھی یہ مجبوری سمجھ جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ ایک بڑے اچھے کام کے لیے میری یہ چھوٹی سی غلطی آپ لوگ معاف کر دیں گے۔" پھر اس نے کیسٹ لگا لی۔ ایک

ایک فقرے پر ابو امی حیران ہو رہے تھے' بجو اور بے بی کا الگ برا حال تھا۔ بالآخر کیسٹ کے ختم ہونے پر اس پر سوالوں کی بوچھاڑ ہو گئی۔ بڑی مشکل سے جان چھڑا کر اس نے کمرے کا رخ کیا۔

اگلا دن بہت خوبصورت تھا۔ ابھی وہ سوئی ہوئی تھی کہ اس پر پڑنے والے ٹھنڈے پانی کی بوچھاڑ نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ سامنے ہی مومو پانی کی بوتل ہاتھ میں لیے کھڑی ہنس رہی تھی۔

"ہم سب کو آپس میں ملا کر خود کتنے مزے سے سوئی ہوئی ہو۔" مومو نے کہا۔

سائرہ اسے دیکھتے ہی چھلانگ لگا کر بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور دونوں دیر تک ایک دوسرے سے لپٹی رہیں۔ ان کے گھر میں بہت رونق تھی' سب لاؤنج میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ چاچو چاچی' لالہ جی اور بڑی اماں اور سب کزنز۔ پھپھو حیران تھیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور پریشان بھی کہ اب کیا ہو گا۔ شکوے شکایتیں' ملامتیں اور آخر میں وضاحتیں۔ کسی نے پھپھو جانی کو کچھ نہ کہا۔

"امی جان میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ پھپھو کا گلا دبا دوں۔" بجو نے ان کی غیر موجودگی میں کہا۔ "کیا پھوپھیاں ایسی ہوتی ہیں۔"

"چپ بدتمیزی نہیں کرتے۔" امی جان نے انہیں ڈانٹا۔

"اچھا میں بدتمیزی نہیں کر رہی اور انہوں نے کیا کیا ہے ہمارے ساتھ' یہ بھول گئی ہیں آپ؟"

"کبھی نہیں بھول سکتی۔" امی جان نے کہا۔ "لیکن بیٹا اپنے ظرف کو بلند رکھو۔"

"بیٹا اس قسم کی بات سوچیں بھی مت۔" ابو جان نے کہا۔ "اصل میں وہ گاؤں کی سادہ لوح خاتون ہیں۔ بات درست انداز میں سمجھ نہیں سکیں اس لیے یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی۔ ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔"

"ابو جانی! کاش ہم بھی ان کی طرح سادہ لوح ہوتے۔" بے بی بولی۔ "ان جیسے ایک دو حکومت کو مل جائیں تو روس اور امریکہ دونوں گھن چکر بن جائیں ان کے بنائے ہوئے چکر میں۔"

"میرا خیال ہے پھپھو کا اپنا گھر نہیں بس سکا اس لیے وہ کسی کو ہنستا بستا نہیں دیکھ

سکتیں۔'' سائرہ نے بالآخر ایک وجہ نکال ہی لی۔ ''اس لحاظ سے یہ ہماری توجہ اور ہمدردی کی مستحق ہیں۔''

''بالکل ٹھیک۔'' بڑوں کو اس کی بات پسند آئی۔

''لیکن بزرگوں کو بھی یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ سنی سنائی پر یقین کرنا ٹھیک نہیں۔ اختلافات کو اگر ایک جگہ بیٹھ کر حل نہ کیا جائے تو انہیں ہوا ملتی رہتی ہے اور سب کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس معاملے میں بھی سب اپنی اپنی جگہ درست ہونے کے ساتھ ساتھ غلط بھی تھے اور اسی لیے سب نے تکلیف اٹھائی۔ اس کے علاوہ ہم سب کو درگزر کی عادت بھی اپنانی چاہیے۔''

''بالکل ٹھیک کہا میری بیٹی نے۔'' آغا جان نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''ہمیں آپس میں ملانے کا سہرا ہماری بیٹی اور بیٹے کے سر ہے۔ اس لیے انہیں کچھ انعام بھی ملنا چاہیے۔''

وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیے۔ آج ایک بار پھر ان کے ملن کے راستے میں حائل سب دیواریں گر چکی تھیں اور ایک خوشگوار مستقبل ان کا انتظار کر رہا تھا۔

☆=====☆=====☆

تم سے محبت ہے

اپنی ذات کے خول میں بند ایک حسین لڑکی کا دلگداز ماجرا، جسے معاشرے نے مسترد کر دیا تھا۔ اس نے اپنے گرد ایک حصار قائم کر کے اندر داخل ہونے کے سب دروازے بند کر دیئے تھے پھر ایک دیوانہ اس حصار میں نقب لگا کر اس کے روبرو جا پہنچا تو

عدنان نے الیکٹرک ڈرم پر بیٹ دی، اولیس نے آرگن بجانا شروع کیا۔ عامر اور ایرج نے گٹار کے تار چھیڑے۔ ایرج نے مائک پر جھک کر گانا شروع کیا۔

To the sprit of the night i srrender

گانا جاری تھا۔ الحمرا کا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ نوجوانوں پر مشتمل مجمع خوب زور و شور سے انہیں داد دے رہا تھا، ایسے میں گانا گاتے ایرج نے ہال کا جائزہ لیا۔ سامنے کی قطار میں بیٹھا ہوا لڑکے لڑکیوں کا ایک گروپ شرارت کے موڈ میں نظر آ رہا تھا۔ ایسے کنسرٹس کے موقع پر بعض اوقات کچھ نوجوان شرارت کی حد پار کر کے بدتمیزی کی حد میں بھی داخل ہو جاتے ہیں۔ ایرج کے گروپ پیشن (Passion) کا یہ پہلا کنسرٹ تھا اور اس کی اچھی کارکردگی کی بناء پر ہی وہ لاہور کے دیگر اچھے گروپس میں اپنی جگہ بنا سکتے تھے۔ اور اپنی جگہ بنانا اتنا آسان بھی نہ تھا کیونکہ اب ان گروپس کے درمیان مقابلہ بہت سخت ہوتا تھا۔ ایرج کے گروپ کو یہ بھی معلوم تھا کہ اس قسم کے کنسرٹس دیکھنے کے لئے لاہور کے تقریباً سبھی تعلیمی اداروں کے منچلے طلباء ضرور آتے ہیں اور ایسے میں کوئی نہ کوئی شوخی اور کبھی کبھار بدتمیزی بھی کر گزرتے ہیں۔ اس قسم کی حرکتیں پہلے بھی ہو چکی تھیں جس کا انتظامیہ نے سختی کے ساتھ نوٹس بھی لیا تھا۔ بہر حال یہ تمام باتیں جانتے ہوئے بھی انہوں نے اپنا گروپ بنا لیا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد انہوں نے میوزک گروپ کا نام تجویز کیا۔ امریکہ میں مقیم عامر کے پاپا سے گٹار، آرگن اور ڈرمز منگوائے تھے اور پھر اپنے پہلے شو کی انہوں نے خوب پبلسٹی کی۔ مختلف کالجز میں پوسٹر لگوائے، لاہور کے نوجوان تو اللہ تعالیٰ سے ایسی تفریح کے لئے دعائیں مانگا کرتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ شو شروع ہونے پر ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

اور پھر وہی ہوا جس کا ایرج کو ڈر تھا۔ سامنے کی قطار میں بیٹھے ہوئے لڑکے اور لڑکیوں

کے گروپ نے مونگ پھلی اور چلغوزے کے چھلکوں سے بھرا ہوا لفافہ سٹیج پر پھینکا۔ لفافہ عین درمیان میں گرا اور اسے پھینکنے والے لڑکیوں اور لڑکوں نے انہیں ہُوٹ کرنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر ایرج نے گانا اور گٹار بجانا بند کر دیا اور عدنان نے ڈرم اسٹکس ڈرم کے اوپر رکھ دیں۔ جب ہوٹنگ کچھ تھمی تو ایرج مائک قریب کرتا ہوں انگریزی میں بولا۔

''موسیقی کا تعلق انسان کی حسِ جمال سے ہوتا ہے اور آپ کی حسِ جمال کا اندازہ سٹیج پر پڑے اس لفافے سے بخوبی لگا سکتا ہوں۔ اگر ایسی حرکات جاری رہیں تو مجھے افسوس سے کہنا پڑے گا کہ ہم یہ پروگرام جاری نہیں رکھ سکیں گے۔ ہم یہاں آپ کو تفریح فراہم کرنے آئے ہیں۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ ہم اس مقصد میں ناکام رہے ہیں تو آپ کو اجازت ہے آپ میں سے جو بھی خود کو بہتر سمجھتا ہے وہ سٹیج پر آ کر اپنے فن کا مظاہرہ کرے۔''

یہ کہہ کر اس نے ایک نظر ہال میں موجود لوگوں پر ڈالی۔ سامنے کی تیسری قطار سے ایک بے حد حسین لڑکی کھڑی ہوئی۔ ہال میں بیٹھے سب افراد اس کی طرف دیکھنے لگے۔ لڑکی نے سینٹ مائیکل کی نیلی جینز اور نیلی شرٹ پہن رکھی تھی۔ صورت سے وہ غیر ملکی لگتی تھی۔ خوبصورت شہابی رنگ جیسے دودھ میں شہد گھول دیا گیا ہو۔ اس کی آنکھیں یا تو تھیں ہی نیلی یا پھر اس کے لباس کے عکس کی وجہ سے ایسی دکھائی دے رہی تھیں۔ باب سٹائل میں کٹے اس کے سرخ چمکدار بال اس کے کاندھوں پر لہرا رہے تھے۔ وہ بے حد اعتماد کے ساتھ اسٹیج پر آئی اور مائیک اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

''میں محض آپ کے چیلنج کی وجہ سے اسٹیج پر آئی ہوں۔'' اس نے خوبصورت انگریزی لہجے میں کہا۔ ''میں یہ بات واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ اسٹیج پر آنے سے میرا مقصد یہ قطعاً نہیں کہ جن لوگوں نے بدتمیزی کی ہے، میں کسی صورت ان کی حوصلہ افزائی کرنا چاہتی ہوں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ میں خود کو اس میدان میں آپ سے بہتر سمجھتی ہوں اور اسی لئے یہاں آئی ہوں۔ میں آپ کو موقعے اور مقام کی مناسبت سے نغمہ سناؤں گی۔''

اس کی بات کے اختتام پر ہال میں اس کے لئے داد و تحسین کی بہت سی صدائیں بلند ہوئیں اور نوجوانوں نے تالیاں بجا کر اس کا خیر مقدم کیا۔ ایرج نے مڑ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

''ٹھیک ہے دیکھتے ہیں کتنے پانی میں ہے۔'' اس نے آنکھوں آنکھوں میں ان سب سے کہا۔

لڑکی نے گانا شروع کیا۔

We built this city on rock and roll

ایک مرتبہ پھر ڈرم، آرگن اور گٹار بجنا شروع ہوئے اور...... اور واقعی لڑکی نے سب کو مسحور کر دیا۔ سب نے اس کا نغمہ بہت تمیز کے ساتھ سنا اور داد دی۔ ''میری آپ سے گذارش ہے کہ پروگرام کے باقی نغموں سے بھی اچھے اور ڈیسنٹ لوگوں کی طرح لطف اندوز ہوں۔'' پھر اس نے اپنے ساتھ کھڑے ایرج کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''یہ لوگ بھی اچھا گا رہے ہیں۔'' اور پھر واپس اپنی نشست پر چلی گئی۔

باقی پروگرام ٹھیک ٹھاک گزرا لیکن ایرج کی نگاہیں رہ رہ کے لڑکی پر پڑ رہی تھیں جو نہایت انہماک کے ساتھ پروگرام دیکھ رہی تھی۔

''کتنا اچھا ہوتا اگر اس کے اسٹیج سے اُترنے سے قبل ہی میں اس کا نام پوچھ لیتا۔'' ایرج نے سوچا۔ ''خیر پروگرام ختم ہونے کے بعد پوچھ لوں گا۔''

لیکن یہ ممکن نہ ہوا کیونکہ انہیں ہال سے نکلتے دیر ہوگئی اور تب تک وہ لڑکی جا چکی تھی۔

☆======☆======☆

''کیا سوچ رہے ہو ایرج؟'' عدنان نے پوچھا۔

''کچھ نہیں یار!'' اس کی آواز میں بیزاری نمایاں تھی۔

''میں بتاتا ہوں یہ کیا سوچ رہا ہے۔'' عامر اپنی فزکس کی کتاب صوفے پر رکھ کر بولا۔ ''یہ سوچ رہا ہے وہ کون تھی؟''

''اب چھوڑ بھی دو اس بے چاری کو، پتا نہیں ہمارے یاد کرنے سے کتنی چھینکیں آ رہی ہوں گی۔'' اویس نے کہا۔ ''پورے بارہ دن سے ہم اسے یاد کر رہے ہیں۔''

''ویسے بڑا مار گئی تھی وہ اس دن۔'' عامر ہنسا۔

''یہ بات تم اور کتنی مرتبہ کہو گے؟'' ایرج بگڑ کر بولا۔

''اچھا ختم کرو اس بات کو مجھے کچھ کتابیں لینی ہیں اٹھو چلو۔'' عامر نے میز سے موٹر بائیک کی چابیاں اٹھائیں۔

بک شاپ میں شیلف سے سڈنی شیلڈن کی ''ونڈ ملز آف دی گاڈز'' اٹھاتے ہوئے ایرج کی نظر سامنے کھڑی ہوئی سرخ بالوں والی لڑکی پر پڑی۔ پشت ہونے کے باوجود اسے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ یہ وہی لڑکی ہے جس سے ان کی ملاقات الحمراء میں ہوئی تھی۔

''کدھر گم ہو گئے؟'' اویس نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

''یہ وہی ہے ناں؟''

اویس نے ایرج کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ ''ہاں یہ وہی فتنہ جاں اور غارت گر دین و ایمان ہے۔ کیا تمہیں تعارف کی خواہش ہے؟''

''نام میں کیا رکھا ہے شیکسپیئر کہتا ہے گلاب کو جس نام سے بھی پکارا جائے وہ گلاب ہی رہے گا۔'' عدنان کتاب اٹھا لئے جانے کے بعد شیلف میں خالی جگہ سے تاک جھانک کرنے لگا۔

''یار میری کتابیں تو کل ہی ملیں گی۔'' عامر ان کے قریب آ کر بولا۔ ''اگر تم لوگوں نے خریداری کر لی ہے تو اب چلتے ہیں۔''

''خریداری تو ہوگئی ہے لیکن چلنا بہت مشکل ہے میرا مطلب ہے ایرج کے لئے۔'' اویس نے کہا۔

''خیریت تو ہے ناں ایرج؟'' عامر نے تشویش سے پوچھا۔

''تھی، اب نہیں رہی۔'' وہ بدستور اسی جانب دیکھتا ہوا بولا۔

''میرا خیال ہے آج یہ قصہ مکا ہی دینا چاہئے۔'' عامر کو لڑکی نظر آئی تو وہ بولا۔ ''چل یار چل کے نام پوچھتے ہیں اس کا، کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے اور اگر اس سے پہلے لاہور میں تھی تو ہمیں کیوں نظر نہیں آئی؟''

''تم چپ کر کے بیٹھو۔ تمہارے جملہ حقوق ابھی پچھلے مہینے ہی سامعہ کے نام محفوظ ہوئے ہیں۔ کچھ تو شرم کرو۔'' اویس بولا۔

''میں تو ایرج کے لئے کہہ رہا تھا۔'' عامر شرمندہ ہوگیا۔

''مجھے لگتا ہے کہ آج بھی موقع نکل جائے گا اور ہم اس کا نام پھر نہیں پوچھ سکیں گے۔'' عدنان نے کہا۔ ''تم لوگ باتیں کرتے رہو باتیں۔ اور اگر یہ لڑکی آج پھر نکل گئی تو سمجھو ہمارا دوست ساری عمر کنوارا ہی رہے گا۔ اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں اور اویس ابھی جا کر اس سے اس کا نام اور پتا معلوم کر کے آتے ہیں۔''

اویس نے عدنان کے ساتھ قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ عامر نے اسے واپس کھینچ لیا۔

''تم یہیں ایرج کے پاس ٹھہرو۔'' اس نے کہا۔ ''میرے اور عدنان کے جملہ حقوق

محفوظ ہیں اس لئے اس مشن پر ہم دونوں جائیں گے۔ ہم نہیں چاہتے کہ یہاں ایک ٹروجن وار کا آغاز ہو جائے۔''

اویس برا سا منہ بنا کر رہ گیا۔ بڑی غلط جگہ عامر نے بدلہ لیا۔

لڑکی کے قریب پہنچ کر عامر اور عدنان نے ایک الوداعی نظر اویس اور ایرج پر ڈالی جو کتابیں دیکھنے کے بہانے بک شیلف سے انہیں کو دیکھ رہے تھے۔ جواباً انہوں نے بھی وکٹری کا نشان بنا کر دونوں کو وش کیا۔

عدنان اور عامر کتابیں دیکھنے کے بہانے لڑکی کے قریب ہی رک گئے۔ ٹیڑھی آنکھوں سے اسے دیکھا اور پھر عدنان نے یوں پوز کیا جیسے اچانک ہی اسے لڑکی دکھائی دی ہو۔

''ارے آپ!'' عدنان نے خوشدلی سے اسے انگریزی میں مخاطب کیا۔

لڑکی نے مڑ کر اسے دیکھا۔

''واقعی یہ دنیا بہت چھوٹی ہے۔ آپ سے اتنی جلدی دوسری ملاقات ہوگی، اس کا تو مجھے گمان بھی نہیں تھا۔'' اس نے تائید طلب نظروں سے عامر کو دیکھا جس نے ایک دم سے ہاں میں سر ہلا دیا۔

''معاف کیجئے، میں آپ کو پہچان نہیں سکی۔'' لڑکی کی آنکھوں میں موجود اجنبیت کے تاثر کو دیکھ کر عدنان اور عامر دونوں ہی گڑبڑا گئے۔

''وہ آپ، میرا مطلب ہے آپ وہی ہیں ناں جو میرا مطلب ہے اس دن۔'' اس کی آنکھوں میں اجنبیت کے تاثر کو مزید گہرا ہوتے دیکھ کر عامر بھی مزید گڑبڑا گیا۔

''شاید آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔'' وہ انتہائی خشک لہجے میں بولی۔

''نہیں بالکل غلط فہمی نہیں ہوئی۔'' عدنان جلدی سے بولا۔

''پھر اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو لڑکیوں سے دوستی لگانے کے لئے الٹے سیدھے بہانے تراشتے رہتے ہیں۔'' وہ سختی سے بولی اور آگے چل دی۔

عامر اور عدنان ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

''اب ادھر ٹھہر کر کیا کرنا ہے، آؤ واپس چلیں۔'' عامر نے مری مری آواز میں کہا۔

''کس منہ سے جائیں گے وہاں؟''

''فی الحال تو اسی منہ سے گزارا چلانا ہوگا کیونکہ اس کا اسپیئر پارٹ ملنا بہت مشکل ہے۔''

دوسری طرف ایرج اور اویس ان دونوں کی واپسی کا شدت سے انتظار کر رہے تھے۔

''میرا خیال ہے بات کچھ بنی نہیں ورنہ ان دونوں کے منہ پر بارہ نہ بج رہے ہوتے۔'' انہیں واپس آتے دیکھ کر اویس نے رائے دی۔

''کیا رہا؟'' ان کے قریب آنے پر دونوں نے بے چینی سے پوچھا۔

''اتنے تو ہم زندگی میں کبھی شرمندہ نہیں ہوئے جتنے آج ہوئے ہیں۔'' عامر منہ بگاڑ کر بولا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لڑکیوں کو اتنا ڈانٹنے کی عادت کیوں ہوتی ہے۔'' عدنان کا موڈ بھی آف تھا۔ ''ادھر عائشہ سے بات کرتا ہوں تو وہ بھی بات بات پر ڈانٹ دیتی ہے۔''

''کچھ بتاؤ گے بھی یا ادھر اُدھر کی ہانکتے رہو گے؟'' ایرج نے کہا۔

''سنو، اگر سننا چاہتے ہو۔'' اور پھر عامر نے تمام گفتگو من وعن انہیں سنا دی۔

''ایویں ہی کہہ دیا ہوگا کہ پہچانتی نہیں تمہیں۔'' اویس بولا۔ ''تم لوگوں کی شکل بھی تو اس قابل نہیں کہ کوئی ڈھنگ کی لڑکی بات کرے تم سے۔''

''دیکھو دیکھو اویس، ہم اس بات پر شدید احتجاج کرتے ہیں۔ یہ کہہ کر تم عائشہ اور سامعہ کو ڈھنگ کی لڑکیوں سے فہرست سے نکال رہے ہو۔''

''ان بے چاریوں پر بھی ترس آتا ہے مجھے۔''

''وہ جا رہی ہے کاؤنٹر پر بل دینے۔'' ایرج بولا۔ ''اب میں جاتا ہوں۔''

''او بھائی میرے چھوڑ دے اس کا خیال، ہم تو صرف باتیں سن کر آ گئے ہیں۔ کیا پتا اس کا موڈ زیادہ بگڑ جائے تو ہمیں ہمپٹی ڈمپٹی کی طرح تیری بھی ہڈیاں نہ مل سکیں۔''

لیکن ایرج اس سے قبل ہی کاؤنٹر پر جا چکا تھا۔

لڑکی نے بل بنوانے کے لئے کاؤنٹر پر کتابیں رکھیں، ایرج نے بھی قریب ہی اپنی کتاب رکھ دی۔ کاؤنٹر کلرک نے ایک ایک کر کے تینوں کتابیں اٹھائیں تا کہ بل بنا سکے۔

کاموکی، دی ریبل۔ ایرج کتابوں کے نام پڑھ رہا تھا۔ پھر دوسری طرف اس نے اپنا رکھا ہوا سڈنی شیلڈن کا ناول دیکھا تو خود کو دنیا کا سب سے احمق شخص محسوس کیا۔ لڑکی اپنی کتابیں اٹھا کر باہر نکل گئی۔ ایرج نے بھی بل بنوایا اور دوستوں کے ہمراہ نکل آیا۔

''تم نے کیوں نہیں پوچھا اس کا نام؟'' عامر نے مذاق اُڑانے والے لہجے میں کہا۔

''سارا امپریشن ہی خراب ہو گیا۔'' ایرج بولا۔ ''اس نے اتنے فلسفیانہ ناول اٹھائے

اور میں احمقوں کی طرح فکشن اٹھا کر لے گیا۔"

اس کا یہ کہنا تھا کہ لڑکوں نے بھرپور قہقہہ لگایا۔

☆======☆======☆

"صاحب جی! یہ خط ڈاکیا دے گیا ہے۔" چوکیدار نے ایرج کو لفافہ پکڑایا۔ لفافے میں کوئی خط نہیں بلکہ پاکستان کے سب سے بڑے آرٹس کالج کی طرف سے سیلاب زدگان کی امداد کے لئے ہونے والے کنسرٹ کا دعوت نامہ تھا۔ یہ دعوت نامہ ہاتھ سے انتہائی خوبصورتی سے پینٹ کیا گیا تھا۔ اس کنسرٹ میں لاہور کے تمام بڑے گروپس کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی اور اس میں اچھی کارکردگی Passion کے لئے کامیابی کے دروازے کھول سکتی تھی۔

دوسری طرف ایرج کے ایم بی اے، عامر کے فزکس اور اولیس کے ایم اے انگریزی کے فائنل امتحان بالکل سر پر تھے۔ گھر والوں سے میوزک گروپ بنانے کی اجازت انہیں اس شرط پر ملی تھی کہ وہ پڑھائی میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کریں گے اور ہمیشہ کی طرح اب بھی اچھی کارکردگی دکھاتے رہیں گے۔

"یہ تو بہت بڑا مسئلہ ہوگیا اب کیا کریں؟" عامر فکرمند ہوگیا۔

"اس وقت انکار کردینے کا مطلب یہ لیا جائے گا کہ ہم ان باقی گروپس کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔" اولیس بولا۔

"تم لوگوں کی تو خیر ہے میرا تو مضمون بھی بہت مشکل ہے۔" عامر بدستور فکرمند تھا۔

"اور تم نالائق بھی ہو۔" عدنان کیسٹ الٹ پلٹ کرتا ہوا بولا۔

"یہ طے ہے کہ ہم اس مقابلے سے منہ نہیں موڑ سکتے۔" ایرج نے فیصلہ کن انداز اختیار کیا۔ "اب پڑھائی کس وقت کرنی ہے اور پریکٹس کس وقت یہ مسئلہ طے کرنا ہوگا۔"

"یہ بھی بعد میں دیکھ لیں گے پہلے تو تم اچھا سا پوسٹر بناؤ پبلسٹی کے لئے۔" عدنان نے ایرج کو مارکر اور شیٹ پکڑائی۔

"کتنے پوسٹر بناؤں؟"

"فی الحال تین بنالو۔ ایک آف بیٹ کے لئے، ایک جم خانہ کے لئے اور ایک Pot Pouri کے لئے۔"

کافی محنت سے بنائے گئے یہ پوسٹر لگانے کے لئے سب سے پہلے انہوں نے جم خانہ کا

رخ کیا۔ پوسٹر لگا کر جب وہ واپسی کے لئے پلٹے تو سامنے سے وہی لڑکی بلیئرڈ روم کا دروازہ کھول کر باہر نکلتی دکھائی دی۔

"آج اسے یوں نہیں جانے دینا۔" اولیس جوش سے بولا۔

"ہاں۔ جب یہ ہمارے قریب پہنچے گی تو ایرج انتہائی شائستگی سے اس کا نام پوچھ لے گا۔" عامر کی بات کی سب نے تائید کی۔

لڑکی قریب پہنچی تو ایرج نے کھنکھار کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن ابھی اس کی یہ کوشش شروع ہی ہوئی تھی کہ سامنے کوریڈور سے اس کے تایا، عدنان کے والد آتے دکھائی دیئے۔ ایرج کی بقیہ آواز اس کے حلق میں ہی دم توڑ گئی اور لڑکی بڑے اطمینان سے ان کے قریب سے گزرتی چلی گئی۔

"پاپا کدھر سے آگئے اس وقت؟" عدنان گڑبڑا کر بولا۔

اتنے میں تایا ابا بالکل قریب پہنچ گئے اور پھر اگلے دس منٹ انہیں تایا ابا کو یہ یقین دلانے میں گزر گئے کہ وہ میوزک کے شوق کو پڑھائی میں بالکل رکاوٹ نہیں بننے دیں گے۔ اور اس سے اگلے دس منٹ انہیں تایا ابا کا تعلیم کی افادیت پر لیکچر سننے میں لگ گئے۔ پھر تایا ابا کے دوست نظر آئے اور وہ انہیں ان کے حوالے کرکے دُم دبا کر بھاگ نکلے۔

"آج پھر موقع ہاتھ سے نکل گیا اور ایک بار پھر امپریشن سخت خراب ہوگیا۔" ایرج نے کہا۔

"تمہاری کھنکھار پاپا کو دیکھتے ہی حلق میں جو دب گئی تھی۔ ظاہر ہے اس نے سوچا ہوگا کہ لوفروں کا کوئی ٹولہ اس کے پیچھے پڑ گیا ہے۔"

"اب اس پر افسوس کرنے کی بجائے آف بیٹ چلو، آہیں پڑھائی کے وقت بھر لینا۔" عامر ایرج کو گھسیٹتا ہوا بولا۔

چاروں اپنے اپنے کے ای ون سیون فائیو پر بیٹھ کر فورٹریس سٹیڈیم پہنچے۔ آف بیٹ میں انہیں ایک اور خوشگوار حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ سامنے وہی دشمن جاں کیسٹیں دیکھ رہی تھی۔

"اسے کہتے ہیں قبولیت کی گھڑی۔" ایرج مسکرایا۔ "تم لوگ پوسٹرز لگاؤ میں ذرا کیسٹیں دیکھ لوں۔"

وہ لڑکی سے ذرا فاصلے پر کھڑا بظاہر یوں ہی کیسٹ دیکھ رہا تھا لیکن اس کی توجہ کا اصل

مرکز وہی لڑکی تھی لیکن یا تو وہ بہت اچھی اداکاری کر رہی تھی اور یا پھر اس نے واقعی ایرج کو نہیں پہچانا تھا ورنہ شناسائی کی ہلکی سی رمق تو اس کی آنکھوں میں دکھائی دیتی۔ وہ تو بالکل اجنبی اور لاتعلق بنی کھڑی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ بھی تو اس کی طرف نہ دیکھا تھا۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اس نے ہمیں پہچانا نہ ہو۔'' ایرج نے سوچا۔ ''اب ہم اتنے گئے گزرے بھی نہیں ہیں اور پھر اس بات کو دن بھی کتنے ہوئے ہیں، بمشکل دو ہفتے۔ پھر اس کا اسٹیج پر آ کر گانا بھی کوئی معمولی بات نہیں تھی کہ یہ اس واقعے اور اس سے متعلق لوگوں کو بھلا دے۔ ہم کم از کم تین گھنٹے تو اسٹیج پر اس کی نگاہوں کے سامنے موجود رہے تھے۔ یقیناً یہ اجنبیت کی اداکاری کر رہی ہے، لیکن پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیوں؟'' وہ سوچتا اور الجھتا رہا۔

لڑکی اپنی پسند کے کیسٹس منتخب کر کے کاؤنٹر پر پہنچی تو ایرج بھی سامنے پڑی دو کیسٹیں لے کر اسی طرف چل دیا۔

''ہوں! اقبال بانو کی کلام فیض، کلام فیض بزبان فیض۔'' ایرج نے کیسٹ پر درج نام پڑھے۔ بل ادا کر کے لڑکی مڑی تو ایرج نے اسے دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے نام کی طرح اس کی مسکراہٹ بھی سورج کی کرنوں کا سا اثر دکھاتی ہوئے پڑے گی لیکن لڑکی نے اس پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

''یس سر! بل بناؤں؟'' کاؤنٹر پر کھڑے سیلز مین کی آواز سن کر ایرج چونکا۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر کاؤنٹر پر رکھی کیسٹس دیکھیں۔ میڈونا کی Like a pryer اس کا منہ چڑا رہی تھی۔

''اُف خدایا! ایک مرتبہ پھر موقع ہاتھ سے نکل گیا۔'' اس نے دل میں کہا اور پھر جھنجلائے ہوئے لہجے میں سیلز مین سے بولا۔ ''نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے یہ میرے پاس پہلے ہی موجود ہیں۔''

''چل یار! اب گھر چلیں تیری دال یہاں نہیں گلے گی۔'' اویس اس کی جھنجلاہٹ سے محظوظ ہو رہا تھا۔

☆======☆======☆

اس کے بعد ایرج نے جم خانہ، آف بیٹ اور بک شاپ کے کئی چکر لگا ڈالے لیکن گوہر مقصود اس کے ہاتھ نہ آیا۔ جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے ایرج کے دماغ میں اس لڑکی کا

تصور اور دل میں اسے پا لینے کی آرزو بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ابھی تک اسی شش و پنج میں تھا کہ لڑکی پاکستانی ہے یا غیر ملکی۔ شکل و صورت اور بول چال سے وہ غیر ملکی دکھائی دیتی تھی لیکن جو کیسٹ اس نے خریدی تھیں وہ دونوں اردو کی تھیں۔ دن گزرتے جا رہے تھے اور ایرج کا دل نہ پڑھائی میں لگ رہا تھا اور نہ ہی میوزک کی پریکٹس میں۔

''میرا موڈ بالکل نہیں ہے کنسرٹ میں جانے کا۔'' وہ اکثر جھنجلا کر کہتا' لیکن اسے معلوم تھا کہ وہاں جانا بھی بے حد ضروری ہے۔

پھر وہ دن بھی آ گیا۔ ایرج انتہائی بے دلی سے تیار ہو کر آرٹس کالج پہنچا۔ عامر، عدنان اور اویس بھی اس کے ساتھ ہی تھے۔ کالج میں ان کے جاننے والے بہت سے لڑکے اور لڑکیاں زیر تعلیم تھے۔ تھوڑی دیر ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ پھر سب کو آڈیٹوریم میں بلا لیا گیا اور اسی لمحے اورنج گھاگھرے اور سبز چولی کے ساتھ ململ کا بڑا سا ٹائی اینڈ ڈائی دوپٹہ لئے وہ اپنی ایک سہیلی کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔

''زینی۔'' ایک [illegible] ''یہ [illegible] کی سمت بے ایک نظر دیکھ لو۔''

''زینی!'' ایرج زیر لب بڑبڑایا۔

زینی نے ایک طائرانہ نگاہ لسٹ پر ڈالی اور پھر سامنے کی قطار میں بیٹھے ہوئے گروپس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک ایک گروپ کو دیکھ رہی تھی اور پھر ایرج کے گروپ پر اس کی نگاہ پڑی۔ تھوڑی دیر وہ انہیں دیکھتی رہی، آنکھوں میں ہمیشہ کی طرح اجنبیت کا تاثر لئے۔

''تھینک یو۔'' اس نے لڑکے سے کہا اور اسٹیج کی طرف بڑھ گئی۔

پروگرام شروع ہوا۔ زینی کمپیئرنگ کر رہی تھی، اس کا لہجہ، آواز کا اتار چڑھاؤ اور لفظوں کا انتخاب سبھی کچھ بہترین تھا۔ تین گروپس کے بعد Passion کو بلایا گیا۔

عدنان نے الیکٹرک ڈرم پر بیٹ دی۔ اویس نے آرگن بجانا شروع کیا۔ عامر اور ایرج نے گٹار کے تار چھیڑ دیئے۔ ایرج نے مائک پر جھک کر گانا شروع کیا۔

I thought it was you

You said you will die for me

And now you have given me

Given me

Nothing but shaltered dreams

اس مشہور نغمے پر ایرج گروپ کو بے پناہ داد ملی۔ ان کے بعد اور گروپس بھی آئے لیکن جو رنگ ایرج نے جما دیا تھا وہ پھیکا نہ پڑ سکا۔ آخر میں کالج کا گروپ سٹیج پر آیا۔ طلباء و طالبات نے ان کے حوصلے بلند کرنے کے لئے گانے سے قبل ہی ان کا پُر جوش خیر مقدم کیا۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ زینی گروپ میں موجود نہیں ہے انہوں نے شور مچا دیا۔ جب طلباء کا اصرار بڑھنے لگا تو انہیں چپ کرانے کے لئے اس نے اعلان کیا کہ مقابلے کے نتائج مرتب ہونے وقت وہ نغمہ سنائے گی۔ اس وعدے پر طلباء چپ ہوئے۔

جب مقابلے کے نتائج مرتب ہونے گئے تو زینی حسب وعدہ اسٹیج پر آئی اور حسب معمول انگریزی میں سامعین کو مخاطب کیا۔

''کسی بھی ملک کی ثقافت اور روایات اس کا عظیم سرمایہ ہوتی ہیں، اسی بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں آپ کو کچھ سناؤں گی۔''

اور پھر جب اس نے اپنی شیریں آواز میں ہیر وارث شاہ گانی شروع کی تو پورے ہال میں سناٹا چھا گیا۔ ایرج کا گروپ ہونقوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

''یہ تو ٹھیٹھ پنجابی لہجے میں ہیر گا رہی ہے۔'' عامر نے سرگوشی کی۔

''مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں اس لڑکی کے اندر کی بھول بھلیوں میں کھو رہا ہوں۔'' ایرج بولا۔

زینی نے ہیر وارث شاہ ختم کی تو داد و تحسین دیتے ہوئے طلباء نے ہال سر پر اٹھا لیا۔ منصفین بھی اس کی آواز کے سحر میں ایسے گرفتار ہوئے کہ اپنا کام ادھورا چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ چونکہ ابھی منصفین کا کام باقی تھا اس لئے اس بار Passions کو بلایا گیا۔ ایرج نے گانا شروع کیا۔

میں رانجھا تخت ہزارے کا سن ہیرے نی
میرے خوابوں کی تعبیرے نی

زینی بہت غور سے ان کا نغمہ سن رہی تھی۔

''یہ لڑکی اپنے تاثرات چہرے پر بالکل نہیں آنے دیتی۔'' ایرج نے اس کا تجزیہ کیا۔ ''اس کے بے تاثر چہرے میں بھی ایک سحر ہے۔ وہ دیکھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس کا پورا وجود برف میں لپٹا ہوا ہے۔ کم از کم اب میں ایک بات

پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس نے پہلے روز ہی ہمیں پہچان لیا تھا۔ پھر کیوں اس نے اجنبیت کا لبادہ اپنے اوپر اوڑھے رکھا۔ میں نے کس کس جگہ اسے تلاش کیا اور یہ نظر آئی تو کہاں؟ خیر میں شائستہ سے اس کے متعلق پوچھوں گا۔ یہیں پڑھتی ہے یقیناً جانتی ہوگی''۔

رزلٹ تیار ہو چکا تھا۔ زینی اعلان کرنے اسٹیج پر آئی منصفین کے فیصلے کے مطابق Passion کو بہترین گروپ قرار دیا گیا تھا۔ ان کے لیے یہ بہت بڑی کامیابی تھی اس لیے ان کا خوش ہونا ایک فطری بات تھی لیکن ایرج کو اتنا ہوش کہاں تھا۔ وہ تو آڈیٹوریم سے باہر جاتے طلبا کے ہجوم میں شائستہ کو تلاش کر رہا تھا تا کہ اس سے زینی کے متعلق پوچھ سکے۔ شائستہ اس کے چچا کی بیٹی تھی اور اسی کالج میں زیر تعلیم تھی۔ یوں تو اس کے اور بھی بہت سے جاننے والے اس کالج میں پڑھ رہے تھے لیکن کسی اور سے زینی کے متعلق پوچھنا جنگل میں آگ لگا دینے کے برابر تھا اور فی الحال وہ یہ نہیں چاہتا تھا۔ بڑی مشکلوں سے اس نے شائستہ کو تلاش کیا جو اپنی سہیلیوں کے ساتھ پارکنگ میں ایک درخت کے نیچے کھڑی خوش گپیوں میں مصروف تھی۔

''شائستہ پلیز' ذرا اپنی فرینڈز سے ایکسکیوز (معذرت) کر لو''۔

''پہلے تو آپ ہم سب کی طرف سے ڈھیر ساری مبارکباد قبول کریں۔'' اس کی ایک سہیلی نے کہا۔

''جی شکریہ۔'' ایرج بولا۔'' پھر اس نے شائستہ کی طرف دیکھا۔

''خیریت تو ہے، بہت بے چین لگ رہے ہو۔'' وہ بولی۔

''میرے ساتھ آؤ، صرف چند منٹ کے لئے۔''

''او کے فرینڈز میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔''

وہ دونوں میوزیم کے اندر ہی کالج کی کینٹین میں ایک میز پر جا بیٹھے۔

''مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ جیتنے کی خوشی میں کچھ کھلا پلا تو دو۔'' شائستہ نے کہا۔

''منگواؤ، جو کچھ منگوانا ہے۔''

''بانکے۔'' شائستہ نے آواز لگائی۔ ''دو پیپسی اور دو چپس کے پیکٹ لانا۔'' پھر وہ ایرج کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''اب بتاؤ تمہارے چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟''

''مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے، اگر تم رازداری کا وعدہ کرو۔''

''ہوں۔'' شائستہ نے ہوں کو لمبا کیا اور آگے ہو کر بیٹھ گئی۔ ''دیکھو ایرج رازداری کی

فیس الگ ہوگی اور معلومات کی الگ۔ مثلاً ہانگ کانگ میں لنچ، کارویل میں آئس کریم اور پیسٹا (Pesta) میں پیزا وغیرہ۔"

"اگر بات اہم نہ ہوتی تو میں تمہارے مطالبات تسلیم کرنے کے بجائے یہاں سے واک آؤٹ کر جاتا۔"

"ارے ہم طلباء کے مطالبات تو انتظامیہ بھی رد کرنے کی جرأت نہیں کرتی۔ خیر تم بتاؤ کہ بات کیا ہے؟"

"موقع تمہارے ہاتھ میں ہے جو کچھ کہنا ہے کہہ لو، ویسے مجھے زینی کے متعلق پوچھنا تھا۔"

"او بھائی! کس چکر میں پھنس گئے ہو، وہ کسی کو لفٹ نہیں کراتی۔"

"شائستہ! میں سیریس ہوں۔"

"مجھے اس کے متعلق زیادہ تو نہیں معلوم، البتہ میں جتنا جانتی ہوں اتنا بتا دیتی ہوں۔ اس کا نام زینب ہے لیکن سب اسے زینی کہتے ہیں۔ اس کے ابو کا بزنس ہے امپورٹ ایکسپورٹ قسم کا۔ اکلوتی بیٹی ہے، ڈیزائن ڈیپارٹمنٹ میں کمرشل ڈیزائننگ پڑھ رہی ہے۔ فائنل ایئر کی اسٹوڈنٹ ہے۔ ان چار سالوں میں جو اس نے یہاں گزارے بہت سے لڑکے اس سے عشق لڑانے کی کوشش میں منہ کی کھا چکے ہیں۔ اس کے اس رویئے کو آج تک کوئی نہیں سمجھ سکا۔ ویسے بہت اچھی، ڈیسنٹ اور ہنس مکھ لڑکی ہے لیکن جہاں دیکھا کہ کوئی پٹری سے اُترنا چاہتا ہے وہاں بالکل برف ہو جاتی ہے۔ یہاں Artichitecture ڈیپارٹمنٹ کا ایک لڑکا مسلسل چار سال سے اس برف کو پگھلانے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔"

"اس کے علاوہ کوئی معلومات؟"

"بس مجھے اتنا ہی پتا ہے اس کے متعلق۔ ویسے ایک اور بات یہ ہے کہ اپنے مضمون میں یہ ہمیشہ شاندار نمبر لیتی ہے اور اس کی ڈرائنگ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس مقابلے کے دعوت نامے بھی اسی نے پینٹ کئے تھے اور اب ایک آخری بات تمہارے لئے۔"

"وہ کیا؟"

وہ یہ کہ بقول مصطفیٰ زیدی "دنیا میں مہ لقاؤں کی کوئی کمی نہیں، اس لئے برف کی اس مورتی سے سر ٹکرانے کے بجائے بقول اقبال کر کسی سینۂ پُر سوز میں خلوت کی تلاش۔"

"میرا نام بھی ایرج ہے۔ میری کرنیں برف کی اس مورتی کو ضرور پگھلائیں گی۔"

☆======☆======☆

"اچھا تو یہ بات ہے کہ وہ کسی کو لفٹ ہی نہیں کراتی۔" عامر نے کہا۔ "میں بھی سوچ رہا تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس نے ہمیں پہچانا نہ ہو۔"

"میرا مشورہ مان تو چھوڑ دے اس کا خیال ورنہ تیرے سہرے کے پھول عمر بھر نہیں کھلیں گے۔" اویس نے مشورہ دیا۔

"اب جب میں نے قدم آگے بڑھا لئے ہیں تو میرے لئے پیچھے ہٹنے کا تصور ہی ناممکن ہے۔"

"وہ بے چارہ جو پچھلے چار سال سے انتہائی استقامت سے اپنی محبت کا ثبوت دے رہا ہے۔ زینی نے اسے نہیں پوچھا تو تیری کیا سُنی ہے اس نے۔" عامر نے کہا۔

"بندے بندے میں فرق ہوتا ہے اور پھر کیوپڈ اندھا ہوتا ہے۔ شاید میرے حصے کا تیر اس کے دل میں پیوست کر کے اس کے حصے کا تیر میرے دل میں پیوست کر دے۔ کیا سمجھے؟"

"میں تو کچھ نہیں سمجھا" عامر نے کہا۔ "اور فی الحال فزکس کے علاوہ کچھ سمجھنا بھی نہیں چاہتا۔ روز سامعہ کا فون آ جاتا ہے کہ اچھے بچوں کی طرح پڑھا کرو۔ سپلی منٹری تک اماں ابا انتظار نہیں کر سکتے۔ اس لئے پہلی Attempt میں ہی امتحان پاس کرنا ہوگا۔"

"مجھے بھی امتحان کی تیاری کرنی ہے، اس لئے میں بھی اب چلتا ہوں، رات کو عدنان کی طرف ملاقات ہوگی۔" اویس اپنی جگہ سے اٹھا۔

اویس اور عامر کے جانے کے بعد ایرج نے بھی کتاب اٹھائی۔ امتحان سر پر تھے اور پڑھائی سے اس کا دل اچاٹ ہو چکا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے زینی کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گردش کرتا رہتا۔ امی نے بھی بہت دفعہ اس بات کو محسوس کیا تھا اور کھانے کی میز پر کھانا کھانے کے بجائے اپنے خیالوں میں گم ہو جانے پر اسے کریدا بھی تھا لیکن وہ کیا بتاتا، جانتا ہی کتنا تھا وہ اس لڑکی کے بارے میں۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ زینی کی بے رخی کی وجہ کیا ہے؟ اسے اچانک کیا ہو جاتا تھا کہ وہ اتنی اجنبی، اتنی کٹھور ہو جاتی تھی۔ یوں جیسے پہلے کبھی ان کا آمنا سامنا ہی نہ ہوا ہو۔"

اس نے کورس کی کتاب صوفے پر پھینک دی۔ کسی کام میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا، باہر ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی اور موسم کے تیور بتا رہے تھے کہ ابھی بادلوں کو اور برسنا ہے۔ اس نے کار

کی چابی لی اور لانگ ڈرائیو کا پروگرام بنا کر سڑک پر نکل آیا۔

ظہور الٰہی روڈ سے وہ کینال روڈ پر آ گیا۔ بارش کی وجہ سے نہر اور اس کے کنارے لگے ہوئے درخت ہمیشہ سے زیادہ خوبصورت منظر پیش کر رہے تھے۔ نیو کیمپس سے نکل کر اسے ایک براؤن اکارڈ سڑک کے بیچوں بیچ کھڑی نظر آئی۔ کار کی ہیزرڈ لائٹس آن تھیں، بارش بھی تیز ہو چکی تھی۔ ایرج نے اپنی کار ایک طرف لگا دی اور یہ سوچ کر آگے بڑھا کہ شاید کار والے کو کسی مدد کی ضرورت ہو۔

کار کا بونٹ کھولے وہی دشمن جاں زینی اندر لگی تاروں سے الجھی ہوئی تھی۔

''کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟'' ایرج نے اپنے جذبات چھپاتے ہوئے انتہائی شائستگی کے ساتھ پوچھا۔

زینی نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس وقت اس کی بولتی ہوئی آنکھوں میں اجنبیت نہیں پریشانی تھی۔

''پتا نہیں کیا فالٹ ہے گاڑی میں؟'' اس نے پریشانی سے کہا۔ ''ڈرائیور بھی میرے ساتھ نہیں ہے۔''

''اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں آپ کو گھر تک چھوڑ آتا ہوں۔''

زینی نے ایک لمحے کو سوچا اور پھر اقرار میں سر ہلا دیا۔ موسلا دھار بارش میں اتنی دیر رہنے کی وجہ سے دونوں بری طرح بھیگ چکے تھے۔

''آپ کو میری وجہ سے تکلیف ہوئی۔'' کار میں بیٹھ کر ٹشو پیپرز سے اپنا منہ اور ہاتھ پونچھتے ہوئے زینی نے کہا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے، مجھے یقین ہے کہ میرے ساتھ ایسا مسئلہ ہوا ہوتا تو آپ بھی میری مدد کرتیں۔'' ایرج نے کہا۔ ''اب بتائیں کس طرف چلنا ہے؟''

''کینٹ میں کیولری گراؤنڈ اسٹریٹ نو۔''

تھوڑی دیر کار میں خاموشی چھائی رہی۔ پھر ایرج نے زینی سے بات بڑھانے کی غرض سے کہا۔ ''میں اتفاق سے یہاں آ نکلا تھا، موسم اچھا ہو رہا تھا اس لئے لانگ ڈرائیو کا پروگرام بنا لیا۔'' پھر قدرے توقف سے بولا۔ ''آپ کی کار کا کیا ہو گا؟''

''وہ ڈرائیور لے جائے گا، ویسے آج آپ کے ساتھ آپ کے دوست نہیں ہیں۔''

''آپ پہچانتی ہیں انہیں؟'' ایرج نے مسکرا کر کہا۔

''کچھ ایسا زیادہ نہیں۔'' اس نے اب کے اعتنائی سے کہا۔

''چلیں شکر ہے آج آپ نے پہچاننے سے انکار نہیں کیا اور پہلے کی نسبت یہ ملاقات خوشگوار انداز میں شروع ہوئی۔''

''پہلے کی نسبت؟'' اس کی آواز میں تعجب تھا۔

''اب پلیز یہ نہ کہنا کہ یہ ہماری پہلی ملاقات ہے۔''

''کیا آپ اتنے لمحوں کے ملنے کو ملاقات کہتے ہیں؟''

''آپ کے لئے وہ لمحات کم سہی لیکن میرے لئے ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔''

''گارڈن ٹاؤن کی طرف موڑ لیں۔'' اس نے بات پلٹتے ہوئے کہا۔ ''یہاں سے قریب پڑے گا۔''

''یعنی آپ اس ملاقات کو بھی مختصر بنانا چاہتی ہیں۔''

''لگتا ہے آپ کو بہت شکوہ ہے مجھ سے۔''

''شکوہ تو ہے، اتنی زیادہ دعاؤں کے بعد تو آپ سے ملاقات ہوئی ہے اور اب۔'' اس نے جان کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

وہ ہولے سے ہنس دی۔

''آپ نے سچ مچ دعائیں مانگی تھیں؟''

''جی ہاں اور انتہائی خضوع و خشوع سے۔'' وہ بولا۔ ''ویسے اب تک ہمارا تفصیلی تعارف نہیں ہوا۔''

''آپ جانتے تو ہیں میرے بارے میں اور میں بھی آپ کے بارے میں جانتی ہوں۔''

''یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟''

''جس دن آپ شائستہ سے میرے بارے میں پوچھ رہے تھے اس دن میں آپ کے پیچھے والی میز پر بیٹھی ہوئی تھی۔''

''اچھا تو یہ بات ہے۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''لیکن شائستہ نے تو بہت کم بتایا تھا۔''

''جب کہ میرا خیال ہے کہ اس نے بہت تفصیل سے سب کچھ بتا دیا تھا۔''

''ایک بات کا جواب اس نے مجھے نہیں دیا تھا اور میں اسی جواب کو کھوج رہا ہوں۔''

''حسن کے سمجھنے کو عمر چاہئے جاناں

دو گھڑی کی چاہت میں لڑکیاں نہیں کھلتیں۔"

"میں تمام عمر بتانے کو تیار ہوں۔"

"بہت بڑا دعویٰ کر رہے ہو ایرج۔"

"یہ محض دعویٰ نہیں میں حقیقتاً ایسا کر سکتا ہوں۔"

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد ایرج نے زینی سے پوچھا۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ تم میرے متعلق کیا جانتی ہو؟"

"تمہارا نام ایرج ہے۔ وہ مسکرائی۔ "ایم بی اے کے فائنل میں پڑھ رہے ہو۔ تمہارا ارادہ اپنے پاپا کے بزنس کو سنبھالنے کا ہے۔ تم دو بہن بھائی ہو۔ بہن ابھی کے ای کے فائنل ایئر کی طالبہ ہے، کچھ عرصے میں ڈاکٹر بن جائے گی۔"

"بس اتنا ہی پتا ہے؟"

"نہیں ایک بات اور بھی معلوم ہے۔" وہ شرارت سے مسکرائی۔ "وہ یہ کہ سڈنی شیلڈن تمہارا پسندیدہ مصنف ہے اور میڈونا پسندیدہ گلوکارہ ہے۔"

وہ دونوں ہی ہنس پڑے۔

"میرا خیال تھا کہ تم نے اس دن مجھے دیکھا ہی نہیں اتفاق سے وہی کتاب اور کیسٹ میرے ہاتھ لگی تھی۔"

"کہتے ہیں۔

"He alone is an acute observer who can observe minutely without being observed"

"اس حساب سے تمہارا مشاہدہ بہت اچھا ہے۔" اس نے گاڑی اسٹریٹ نو میں موڑ لی۔

"بس اس سے اگلا گھر ہے سیاہ گیٹ والا۔" زینی نے بتایا۔

چوکیدار نے کار کا ہارن سن کر گیٹ کھول دیا۔ روش کے دونوں اطراف میں بے حد خوشنما لان تھے جن میں موسمی پھول اپنے جوبن پر تھے۔ مکان قدیم انگلستان کی یاد دلاتا تھا۔

"چائے پیو گے ناں؟"

"اگر پلا دی تو پی لوں گا۔"

"اب میں اتنی بری میزبان بھی نہیں ہوں۔" زینی نے اُترتے ہوئے کہا۔ "میری مما

سے بھی ملاقات ہو جائے گی تمہاری۔ وہ بہت سویٹ ہیں پاپا البتہ پاکستان میں نہیں ہیں چند دن بعد آئیں گے۔"

گھر بے حد خوبصورتی سے وکٹورین طرز پر سجایا گیا تھا۔ دبیز قالین میں پاؤں دھنسے جاتے تھے۔

"ممی کیا کر رہی ہیں؟" اس نے ملازمہ کو مخاطب کیا۔

"اپنے کمرے میں ہیں۔"

"اگر کوئی خاص کام نہ کر رہی ہوں تو انہیں بلانا، مجھے انہیں مہمان سے ملانا ہے۔"

"جی بہتر۔" کہہ کر ملازمہ چلی گئی۔

"بہت اچھی ڈیکوریشن ہے۔" ایرج نے تعریفی نگاہوں سے اطراف میں دیکھا۔

"ممی Interior Decorator ہیں۔" زینی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کہیں جاب نہیں کرتیں لیکن ان کا فیلڈ یہی ہے۔"

"پھر تو ان کے ذوق کی داد دینی چاہئے۔ کتنی اچھی پینٹنگز منتخب کی ہیں انہوں نے۔"

وہ ہنس پڑی۔ "تخلیق عظیم ہے کہ خالق، انسان جواب چاہتا ہے۔"

ایرج نے ایک نظر تصویروں کو دیکھا۔ "یہ تم نے بنائی ہیں؟"

"جی جناب۔"

اتنے میں دروازے سے ایک انتہائی گریس فل خاتون داخل ہوئیں۔ نیلی ساڑھی میں وہ بے حد پُروقار لگ رہی تھیں۔ زینی کے متعلق شروع میں ایرج کا خیال تھا کہ وہ کوئی غیر ملکی ہے کیونکہ اس کے نقوش یورپین تھے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ وہ غیر ملکی نہیں بلکہ پاکستانی ہے تو ایرج نے خیال ظاہر کیا کہ اس کی ممی شاید غیر ملکی ہوں جن کے نقوش کی جھلک زینی کے چہرے میں دکھائی دیتی ہے لیکن آج انہیں دیکھ کر ایرج کا یہ خیال بھی غلط ثابت ہوا کیونکہ وہ سو فیصد پاکستانی تھیں۔

"ممی یہ ایرج ہے۔" اس نے اپنی ممی سے اس کا تعارف کروایا۔ "میری کار خراب ہو گئی تھی انہوں نے میری مدد کی۔"

اس کی ممی واقعی سویٹ تھیں۔ وہ ایرج سے فوراً ہی گھل مل گئیں اور پہلی ملاقات میں ہی اس کے اور اس کے گھر والوں کا حال احوال، پسند ناپسند اور مزاج کے متعلق سب کچھ معلوم کر لیا۔ جب ایرج اُٹھ کر جانے لگا تو انہوں نے اسے دوبارہ آنے کا وعدہ لے کر ہی جانے

کی اجازت دی۔

''تو وہ برف آخرکار پگھلنے ہی لگی۔'' تائی وا میں ڈنر کے دوران جب ایرج نے اپنی اور زینی کی ملاقات کے بارے میں سب کو بتایا تو عامر نے تبصرہ کیا۔

''کوئی اور موقع ہوتا تو بات شاید مختلف ہوتی۔ اصل میں، میں نے اس کی ایسے وقت میں مدد کی جب اس کو واقعی اس کی ضرورت تھی۔ پھر یہ بھی تو ممکن نہیں تھا ناں کہ وہ مجھے گیٹ سے ہی چلتا کر دے۔''

''بہرحال تم اس کی ممی کو تو اپنا گرویدہ کر آئے ہو۔ یہاں تک کہ انہوں نے تمہیں دوبارہ آنے کا وعدہ لے کر واپس جانے دیا۔'' عدنان بولا۔

''کیا پتا انہوں نے رسماً ہی کہا ہو اور جب یہ وقت بے وقت وعدہ وفا کرنے کے لئے پہنچنے لگے تو ایک دن بالآخر انہیں اپنے چوکیدار کے ہاتھوں اسے باہر پھنکوانا پڑے۔'' اویس بولا۔ ''ویسے ایرج یہ تو بتانا کہ ان کے چوکیدار کی جان کیسی ہے؟''

☆======☆======☆

''ہیلو'' قائداعظم لائبریری میں بک شیلف سے کتاب نکالتے ہوئے ایرج کو پیچھے سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ یہ آواز تو وہ لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔

''پھر میری دعائیں بہت دن بعد قبول ہوئیں۔'' اس نے پلٹتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔

''اتنا ہی ملنے کا شوق تھا تو گھر آ جاتے، کسی نے منع تو نہیں کیا۔'' زینی بولی۔

''پورے ایک مہینے کے بعد میں گھر اور یونیورسٹی کے علاوہ کہیں اور آیا ہوں۔ امتحانوں کی وجہ سے امی نے زبردستی کتابوں کا ڈھیر میرے اردگرد لگا رکھا تھا۔ آج بھی کتاب لینے ہی یہاں آیا ہوں۔''

''کیسے ہوئے پیپرز؟''

''اچھے ہوگئے ہیں۔'' وہ بولا۔ ''کیوں ناں باہر گارڈن میں نکلیں، لائبریری میں تو ٹھیک سے بات بھی نہیں ہو سکتی۔''

دونوں باہر لارنس گارڈن کی روش پر نکل آئے۔

''ممی انتظار کرتی رہیں تمہارا۔''

''اور تم؟''

''مجھے اتنا وقت ہی کہاں تھا۔'' پتا نہیں اس کے لہجے میں اتنی بے اعتنائی کہاں سے آ جاتی تھی۔ ''میرا تو تمام وقت ہی کالج کے کام میں گزر جاتا تھا۔ اس وقت بھی کتاب لینے آئی تھی۔''

''پھر کتاب کی تلاش کے بعد مجھ سے ملنے کا وقت مل ہی گیا؟'' اس کے لہجے میں ہلکا سا شکوہ تھا۔

''کتاب نہیں ملی اس لئے کچھ وقت بچ گیا۔'' وہ مسکرائی۔ ''ویسے جب میں ممی کو بتاؤں گی کہ تم سے ملاقات ہوئی ہے تو وہ ضرور پوچھیں گی کہ تم اب کب آؤ گے؟''

''کل میرا آخری پیپر ہے شام کو، اس لئے میں پرسوں آؤں گا تمہاری ممی سے ملنے۔''

ایرج نے یوں بے اعتنائی سے کہا جیسے اسے زینی سے ملنا ہی نہ ہو۔ اسے اس بات پر بہت غصہ آ رہا تھا کہ زینی اپنی ممی کے حوالے سے بات کر رہی تھی حالانکہ اسے معلوم تھا کہ ممی سے ملنا تو محض ایک بہانا ہے۔

''میرے پاپا بھی پاکستان آ گئے ہیں۔'' وہ بولی۔

دونوں چلتے چلتے دوبارہ لائبریری کی طرف واپس آ گئے تھے۔

''اب مجھے چلنا چاہئے، میں ممی کو بتا دوں گی کہ تم ان سے ملنے پرسوں آ رہے ہو۔'' وہ مسکرائی۔

ایرج دیر تک کھڑا اس کی کار کو مال روڈ پر دوسری گاڑیوں کے ساتھ بھاگتے ہوئے دیکھتا رہا اور پھر بالآخر جب اس کی کار نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تو وہ بھی اپنی بائیک پر بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

پھر مقررہ دن پر ایرج زینی کی طرف گیا۔ چوکیدار نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے ممی اور پاپا بھی آ گئے۔ زینی کے پاپا بھی بہت پُر وقار شخصیت کے مالک تھے، وہ بہت گرم جوشی سے ایرج سے ملے۔ ان کے درمیان بزنس سے لے کر حالات حاضرہ اور ادب ہر قسم کے موضوع پر گفتگو ہوئی۔ اس تمام عرصے میں وہ زینی کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ کہیں بھی دکھائی نہیں دی۔ بالآخر اس نے آنٹی سے اس بارے میں استفسار کر ہی لیا۔

''اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی سوئی ہے۔'' انہوں نے بتایا۔

''میں اب چلتا ہوں، آپ لوگوں کی کمپنی کو بہت انجوائے کیا میں نے۔'' وہ جانے کے

لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

پھر ایرج اور زینی میں کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ کبھی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اسے پسند کرتی ہے اور کبھی یوں لگتا کہ برف کی یہ مورتی کبھی نہیں پگھلے گی۔

''اب کیا ارادہ ہے تمہارا؟'' ایک دن پاپا نے رات کے کھانے پر ایرج سے پوچھا۔

''ارادہ؟ ارادہ کیا ہونا چاہئے۔ بزنس میں نے سنبھال لیا ہے اب آپ کو آرام کرنا چاہئے۔'' اس نے جواب دیا۔

''مجھے تو آرام مل جائے گا کچھ اپنی امی کی کمپنی کا بھی سوچا ہے تم نے؟''

''میں سمجھا نہیں۔'' وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔

''اب اتنے بھولے بھی نہ بنیں ایرج بھائی!'' اس کی بہن نوین نے کہا۔ ''یہ تو سب کو علم ہے کہ آپ بزنس سنبھال چکے ہیں، اصل بات تو یہ ہے کہ شہنائیاں کب بجوانے کا ارادہ ہے۔''

''ہاں بیٹا! میں چاہتی ہوں کہ اب جلدی سے گھر میں بہو آ جائے۔'' امی بولیں۔

''تمہارے پاپا کا خیال ہے کہ ڈاکٹر احسن کی دوسری بیٹی نادیہ اچھی رہے گی۔''

''ابھی تو مجھے نیند آ رہی ہے، بعد میں بات کریں گے۔'' اس نے نیپکن سے ہاتھ پونچھے اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کے بعد محنت طلب مسئلہ درپیش تھا۔ امی اور پاپا دونوں نادیہ کو پسند کرتے تھے۔ اس کے باوجود پاپا کو کوئی منا سکتا تھا تو وہ امی ہی تھیں۔ شادی کا تقاضا روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ دوسری طرف زینی نے اب تک کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جس سے اس کی رضامندی کا اظہار ہوتا۔

''بیٹا اب تو شادی کے لئے اقرار کر لو۔'' امی نے ایرج سے کہا۔

''یہی وقت ہے امی کو منانے کا۔'' ایرج نے دل میں سوچا۔

''کیا کوئی اور لڑکی پسند آ گئی ہے؟'' امی نے اپنی بات کا کوئی جواب نہ پا کر پھر سوال کیا۔

''جی امی۔'' وہ بولا۔

''کون ہے وہ لڑکی؟ والدین کون ہیں؟ خاندان کیسا ہے؟'' امی نے پے در پے سوال کئے۔

''زینب نام ہے اس کا۔ شائستہ کے ساتھ کالج میں پڑھ رہی ہے۔'' اور پھر کچھ بیشی کے ساتھ ایرج نے تفصیل سے زینی کے متعلق امی کو بتا دیا۔

''مجھے تو نادیہ بہت پسند ہے۔ خوبصورت، تعلیم یافتہ سگھڑ۔''

''امی مجھے اس سے بحث نہیں کرنا کہ نادیہ کیسی ہے۔'' وہ امی کی بات کاٹ کر بولا۔

''یقیناً وہ بہت اچھی لڑکی ہے، اس کی طرح کی اور بھی بہت سی اچھی لڑکیاں ہیں لیکن ظاہر ہے میں سب سے تو شادی نہیں کر سکتا ناں۔ میں تو اسی سے شادی کروں گا جو نہ صرف اچھی ہو بلکہ مجھے پسند بھی ہو اور اس کنڈیشن پر صرف زینی ہی پورا اُترتی ہے۔''

''ٹھیک ہے زندگی تم نے بسر کرنی ہے۔ میں تمہارے پاپا سے بات کروں گی۔'' امی اٹھتے ہوئے بولیں۔

''کب بات کریں گی آپ پاپا سے؟''

''آج ہی شام کی چائے پر۔''

اور پھر وہ امی اور پاپا کے درمیان ہونے والی گفتگو کے خاتمے کا منتظر رہا جو چائے ختم ہونے کے باوجود بھی ختم ہوتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ نوین بھی ہاسپٹل گئی ہوئی تھی ورنہ اسی سے پتا چل جاتا کہ امی پاپا کیا باتیں کر رہے ہیں۔ آخر کار پاپا نے اسے اپنے حضور طلب کیا۔

''وہاں بیٹھو۔'' انہوں نے ساتھ والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ایرج انتہائی فرمانبردار بچے کی طرح بیٹھ گیا۔

''اب بتاؤ نادیہ کیوں ناپسند ہے تمہیں؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''مجھے نادیہ ناپسند نہیں ہے۔'' وہ بولا۔

''پھر شادی سے انکار کی وجہ؟''

''صرف اور صرف یہ ہے کہ میں کسی اور لڑکی کو بہت زیادہ، میرا مطلب ہے کسی اور سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''تمہارا مطلب ہے زینی۔'' وہ ایک لمحے کے توقف کے بعد بولے۔ ''شائستہ کے مطابق وہ اچھی لڑکی ہے۔''

''جی بہت اچھی۔'' ایرج یک دم کھل اٹھا۔

''لیکن تمہاری اس سے ملاقات کو اتنا زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ تم اس کے متعلق کوئی بھی رائے قائم کر سکو، یعنی یہ کہ وہ مزاجاً اور ویسے بھی کیسی لڑکی ہے۔''

"یہ درست سہی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اچھی ہے بہت اچھی۔"

"دیکھو بیٹا! زندگی تمہیں گزارنی ہے۔ اس لئے ہم تمہیں صرف مشورہ دے سکتے ہیں کسی قسم کا فیصلہ تم پر مسلط نہیں کر سکتے۔ ہماری نظرِ انتخاب اس لئے نادیہ پر ٹھہری تھی کہ دونوں گھرانے ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں اور اس لئے بھی کہ وہ کسی بھی اچھے گھرانے کی بہو بننے کے لائق ہے۔ زینی کے لئے ہچکچاہٹ کی وجہ صرف یہ تھی کہ ہمارے ان کے گھرانے سے مراسم نہیں ہیں جبکہ نادیہ کی بڑی بہن عائشہ بھی ہمارے خاندان میں آ رہی ہے لیکن ظاہر ہے یہ انکار کی کوئی وجہ نہیں۔ ہم بیٹی کے والدین سے ملنا چاہیں گے۔ تم ان کی سہولت سے کوئی بھی ٹائم سیٹ کر دو۔"

"تھینک یو پاپا۔" وہ فرطِ مسرت میں صرف اسی قدر کہہ سکا۔ سب کچھ اتنی آسانی سے ہو گیا تھا اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے فوراً زینی کا نمبر ملایا، فون اس کی ممی نے ریسیو کیا۔

"ہیلو آنٹی! میں ایرج بول رہا ہوں۔"

"آج فون پر کیسے یاد کر لیا۔"

"دراصل میں اپنی امی اور پاپا کو آپ لوگوں سے ملوانا چاہتا تھا۔" وہ بولا۔ "سوچا ٹائم سیٹ کر لوں۔"

"یو آر موسٹ ویلکم۔" وہ خوش دلی سے بولیں۔ "ایسا کرو کہ کل شام کی چائے ہمارے ساتھ ہی پی لو۔ زینی کے پاپا بھی اس وقت گھر پر ہوں گے۔"

"زینی ہے گھر میں؟"

"ڈرائیو پر نکلی ہوئی ہے، آئے گی تو تمہارے فون کے متعلق بتا دوں گی اسے۔"

"اوکے آنٹی۔" یہ کہہ کر ایرج نے فون رکھ دیا۔

وہ رات اس سے کاٹے نہیں کٹ رہی تھی۔ باہر چودھویں کے چاند کی چٹکی ہوئی چاندنی کھڑکی کے راستے اندر آ کر کمرے میں اجالا پھیلا رہی تھی۔ رات کی بھینی بھینی مہک چاروں اور پھیلی ہوئی تھی۔ زینی کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات اس کی نگاہوں کے سامنے کسی فلم کی مانند چل رہے تھے۔ وقت نے جیسے نہ گزرنے کی قسم کھائی تھی، رات کے سوا دو بج رہے تھے۔ اس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑا فون اٹھایا اور عامر کا نمبر ڈائل کیا۔

"ہیلو!" بہت سی گھنٹیاں بجنے کے بعد بالآخر عامر نے فون اٹھا کر نیند کے عالم میں کہا۔

"سو رہے تھے؟" ایرج نے تعجب سے پوچھا۔

"رات کے سوا دو بجے تک ہر شریف انسان نہ صرف سو چکا ہوتا ہے بلکہ ڈھائی عدد انتہائی سہانے خواب بھی دیکھ چکا ہوتا ہے۔" اس نے جھنجھلا کر کہا۔

"یار ابھی تک صرف سوا دو بجے ہیں؟" ایرج انتہائی بے چارگی سے بولا۔

"یار! خیریت تو ہے؟" عامر نے حیرت سے پوچھا۔

"خیریت ہی تو نہیں ہے۔ بندہ دماغ کے خلل یعنی مرضِ عشق میں مبتلا ہو تو خیریت جاتی رہتی ہے اور دن آہیں بھرنے اور رات اختر شماری کرنے کے علاوہ کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہتا۔"

"اس مرض میں تو یہ بندہ حقیر و پُرتقصیر پچھلے ایک سال سے مبتلا ہے اور پرانا مریض ہونے کے ناطے تمہیں یہ مشورہ دیتا ہے کہ اس وقت بجائے اُلو کی طرح جاگنے اور اختر شماری کرنے کے اپنے سامنے پڑے فون پر معشوق کا نمبر جل تُو جلال تُو آئی بلا ٹال تُو پڑھ کے ڈائل کرو۔ فون اٹھانے والی جتنی گالیاں دے بالکل بے مزہ نہ ہو اور بقول غالب یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں کے فارمولے پر عمل کرو۔"

"فارمولا تو اچھا ہے لیکن آئی بلا کو ٹال تُو والی بات کچھ گڑبڑ ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"اس سے بڑی بلا کون ہو گی اور فی الحال میں اس بلا کو سر سے ٹالنا نہیں چاہتا، کوئی اور فارمولا بتاؤ۔"

"ایک فارمولا اور بھی ہے۔" عامر بولا۔ "نیشنل کالج آف آرٹس کے گیٹ کے دائیں طرف جو درخت ہے ناں اس کے نیچے خدا کا ایک بندہ ایسے مسائل حل کرنے کے لئے بیٹھا رہتا ہے۔ وہ سنگدل سے سنگدل محبوب کو بھی شرطیہ دو یوم میں آپ کا گرویدہ بنا سکتا ہے۔ آزمائش شرط ہے، یہ میں نہیں وہ کہتا ہے۔"

"میرے پاس دو یوم کا وقت نہیں ہے، کل شام تک سب ٹھیک ہو جانا چاہئے۔"

"کیوں کیا تمہیں کل شام کو زمین میں ڈبکی لگانی ہے یا اوپر کا ون وے ٹکٹ لینا ہے۔"

"اتنا سا کام ہوتا تو پریشانی کیا تھی۔" ایرج نے مصنوعی ٹھنڈی آہ بھری۔

"ایسا کون سا کام پڑ گیا ہے تمہیں؟"

"کل امی اور پاپا زینی کے ممی ڈیڈی سے ملنے جا رہے ہیں۔"

"سچ کہہ رہے ہو؟"

"سچ نہ ہوتا تو رات کے اس سمے تک میں بھی ڈھائی عدد خواب نہ دیکھ چکا ہوتا۔"

"تم نے ہم میں سے کسی کو بتایا ہی نہیں۔" عامر نے شکوہ کیا۔

"یہ بتانا نہیں تو اور کیا کرنا ہے۔"

"اسے بتانا کہتے ہیں۔" عامر پھاڑ کھا جانے والے لہجے میں بولا۔ "اس وقت اور اس انداز میں۔"

"اگر تم مرضِ عشق کے مجرب نسخے بتانے میں اتنا وقت ضائع نہ کرتے تو یقیناً یہ کام اب سے آدھ گھنٹہ پہلے ہو چکا ہوتا۔ ویسے ایک بات بتانا۔ یہ این سی اے کے ساتھ بیٹھے ہوئے بابے سے تم نے کتنے تعویذ لئے تھے؟"

"یہ کہانی تو میں ایک سو ایک مرتبہ سنا چکا ہوں۔ ارے جناب ہم تو اس کے پرانے گاہک ہیں۔ ایف ایس سی سے لے کر آج تک مختلف اوقات میں، میں اس سے اتنے تعویذ لے چکا ہوں کہ اگر وہ چاہتا تو گلبرگ میں ایک انتہائی شاندار کوٹھی بنوا سکتا تھا۔"

"کل اگر گلبرگ تھری سے گزر ہو تو دیکھنا اس کی واقعی ایک کوٹھی وہاں موجود ہے۔"

ایرج ہنسا۔

"اچھا یار! اب باقی کی تمام رات میں سوتے میں تمہارے لئے دعا کرتے ہوئے گزارنا چاہتا ہوں۔ اگر تم نے اتنی زبردست خبر نہ سنائی ہوتی تو میں تم سے اپنے اس سہانے خواب کا حساب ضرور مانگتا۔ جو تمہارے فون کی وجہ سے درمیان سے ٹوٹ گیا تھا۔" عامر کی آنکھیں واقعی نیند سے بند ہو رہی تھیں۔ اس لئے ایرج نے بھی اسے مزید تنگ نہیں کیا۔

اگلے دن صبح نو بجے اویس، عدنان اور عامر ایرج کے پاس آ دھمکے۔ پہلے تو اس کی خوب خبر لی کہ اس نے اتنی بڑی بات انہیں بتائی کیوں نہیں اور بعد میں سب نے اس کے وارڈ روب پر ہلہ بول دیا۔

"اب اس کے گھر جاتے جاتے یہ جینز ضرور بدل لینا جو پچھلے دو سال سے تم نے اپنے سے الگ کرنے کی زحمت نہیں کی۔" عدنان اس کے وارڈ روب میں موجود کپڑوں کا جائزہ لے رہا تھا۔

"یہ پیکٹ کتنے عرصے سے بند پڑے ہیں؟" اویس نے کپڑوں کے پیکٹ اٹھائے جو خریداری کے بعد سے اب تک ویسے ہی بند پڑے تھے۔

"جب سے میں نے یہ جینز پہنی ہے تب سے کپڑوں کے باقی پیکٹ بند ہیں۔" ایرج گرم گرم پکوڑوں پر ٹماٹو ساس ڈالتے ہوئے بولا۔

"واہ کیا زبردست ٹراؤزر ہے، شام کو یہ پہن کے جانا۔" عامر نے نیلے رنگ کی ایک پتلون اٹھائی۔

"پھر نیلے رنگ کی پتلون۔" نوین جو ایرج کے کمرے میں ہی تھی بولی۔ "پچھلے دو سال سے نیلا رنگ ہی تو پہنے پھر رہے ہیں ایرج بھائی۔ اب کوئی دوسرا رنگ پہنیں۔"

"پرویز سینٹ لارینٹ کی براؤن پتلون کیسی رہے گی؟" عدنان نے ایک پیکٹ سے پتلون نکالی۔

"میرے خیال میں۔"

"اپنا خیال چھوڑو، تمہیں اس معاملے میں بولنے کا کوئی حق نہیں ہے۔" اویس نے ایرج کی بات کاٹ دی۔

"ہاں تم چپ چاپ منہ کے آگے رومال رکھ کر بیٹھو، ہم خود تمہارے کپڑے منتخب کر لیں گے۔" عامر تیزی سے بولا۔

"بھئی، یہ پتلون تو ڈرائی کلین والی ہے۔ پتا نہیں کب سے یونہی بند پڑی تھی۔" نوین نے پتلون کا تنقیدی جائزہ لیا۔

"یہ بلیک سوٹ کیسا رہے گا؟" اویس نے ایک اور پیکٹ پھاڑا۔

"بلیک اچھا شگون نہیں ہوتا۔" نوین نے پھر تنقید کی۔

"کوئی ہے جو اس نقار خانے میں مجھ طوطے کی آواز سنے۔" ایرج فریادی لہجے میں بولا۔

"آپ تھوڑی دیر چپ نہیں کر سکتے۔" نوین اس کی طرف مڑی۔ "کہہ جو رہے ہیں ہم کہ آپ کو شام کو کپڑے مل جائیں گے اور اویس بھائی بلیک سوٹ کو تو دوسری طرف ہی رکھ دیں، کوئی اور سوٹ دیکھیں۔"

"تمہیں اتنی جلدی کیا ہے؟" عدنان بولا۔ "لگتا ہے ٹرین پکڑنی ہے تمہیں۔"

"مجھے ہاسپٹل جانا ہے اس لئے جلدی کر رہی ہوں۔"

"میں کہہ رہا تھا۔" ایرج نے ایک بار پھر کچھ کہنے کی ناکام کوشش کی۔

"تو یہ ہے ایرج بھائی۔ آپ کے بس میں ہوتا تو پر لگا کر زینی کے پاس پہنچ جاتے،

کہیں کیا کہنا ہے آپ نے۔''

''میں کہنا چاہتا تھا کہ میں بھی کپڑوں کے انتخاب میں تم لوگوں کی مدد کر سکتا ہوں۔''

''کریں،شوق سے کریں۔''

''یہ کیسا رہے گا؟''اس نے ایک پیکٹ کی پنیں کھولیں۔اندر سے کلف لگا سفید کرتا اور شلوار نکلی۔

''ونڈر فل!''اویس نے دیکھتے ہی کہا۔

''اس وقت سے جو ہم جھک مار رہے تھے،تب کیوں نہیں بتایا تھا۔''عدنان نے اسے کھا جانے والے انداز میں گھورا۔

''تم میں سے کوئی سنتا بھی۔''

''خیر خیر۔''نوین بولی۔''اب یہی پہننا میں ابھی استری کر دیتی ہوں۔''

اس نے پاس پڑے کپڑوں پر بڑے قرینے سے استری کی۔

''جوتے کون سے پہنو گے؟''

''کھسے ہیں۔الماری کے آخری خانے میں پڑے ہیں۔''

''گڈ!یہ ہوئی ناں بات!''اویس کھسوں کا جائزہ لے کر بولا۔

''یہ کپڑے میں الماری میں لٹکا کر جا رہی ہوں،اگر لیٹ گھر آئی تو مجھے فون کر دینا۔''

''جو حکم میری آقا۔''

دوستوں اور نوین کی وجہ سے اتنی رونق تھی کہ ایرج کو جو وقت گزارنا مشکل لگ رہا تھا وہ بڑے اطمینان سے گزر گیا اور بالآخر وہ وقت آ ہی گیا جس کا اسے اتنی شدت سے انتظار تھا۔ جینز کے بجائے کرتا شلوار انتہائی خوشگوار تبدیلی تھی۔

''چچی جان تمہیں جینز کے بغیر دیکھ کر بہت خوش ہوں گی۔''عدنان بولا۔

''ہاں انہیں بھی اتنے عرصے تک اسے واشنگ مشین میں ڈالنے کی حسرت ہی رہی۔''

''شکر ہے آج کچھ شکل نکلی ہے۔''امی جو نہ جانے کب وہاں آئی تھیں،نے تعریفی نگاہوں سے اسے دیکھا۔''چلو اب جلدی کرو لیٹ ہو رہے ہیں ہم۔''

☆======☆======☆

زینی کے ممی ڈیڈی نے بڑی گرمجوشی سے ان کی پذیرائی کی۔ایرج کے امی اور پاپا بہت متاثر ہوئے۔زینی بھی انہیں بہت اچھی لگی۔تھوڑی دیر بعد زینی اور ایرج اٹھ کر لاؤنج میں

آ گئے۔ایرج چاہتا تھا کہ اس کے امی اور پاپا زینی کے ممی ڈیڈی سے اطمینان کے ساتھ بات کر سکیں۔اس لئے وہ زینی کے ساتھ اٹھ آیا تھا۔گرین پرنٹڈ شلوار قمیص میں وہ بے حد خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔

''آج تم میں بہت خوشگوار تبدیلی دکھائی دے رہی ہے۔''زینی صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''تھینک یو۔''وہ خوش دلی سے بولا۔''کیٹس نے کہا تھا کہ خوبصورتی دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتی ہے۔''

''سو فیصد درست کہا تھا اور میری نگاہ تو ویسے بھی آرٹسٹ کی نگاہ ہے۔''وہ ہنسی اور سب کریڈٹ اپنے اوپر لے گئی۔

پھر دیر تک دونوں مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔ایرج بے چینی سے امی پاپا کی باتوں کے رزلٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ڈرائنگ روم [illegible] ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں جس سے اسے کسی قدر تسلی ہو رہی تھی۔بالآخر جب وہ گھر جانے کے لئے اٹھے تو کار میں بیٹھتے ہی ایرج نے بے چینی سے پوچھا۔''کیا کہا اس کے ممی ڈیڈی نے؟''

''اتنی جلدی یہ باتیں طے ہوتی ہیں کیا؟''امی بولیں۔''ایک ہفتے بعد جواب دیں گے، ویسے گھرانہ بہت اچھا ہے اور مجھے زینی بہت پسند آئی ہے۔''

''تھینک گاڈ۔''ایرج نے دل میں کہا۔

یہ ایک ہفتہ کاٹنا ایرج کے لئے بے حد مشکل تھا۔ستم یہ کہ اس مرتبہ امی پاپا اسے اپنے ساتھ بھی نہیں لے جا رہے تھے۔ان کے خیال میں اس کی ضرورت نہیں تھی۔

''اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔یہ ہفتہ دو ہفتہ انتظار کروانا محض رسمی کارروائی ہوتی ہے۔''نوین نے تسلی دی۔

امی اور پاپا کے جانے کے بعد ایک لمحہ کاٹنا اس کے لئے مشکل ہو گیا۔اس کے دوست اس کے پاس بیٹھے اس کا وقت اچھا گزارنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''ہم پر بھی یہ وقت گزر چکا ہے۔''عامر نے مصنوعی آہ بھری۔''ایسے وقت میں اچھے بھلے بندے کی شکل پر بارہ بجنے لگتے ہیں اور ذرا سی آواز پر کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔''

''اس کا کوئی علاج بھی ہے یا نہیں؟ کیونکہ میں ابھی تک اس بیماری سے محفوظ ہوں۔''اویس نے کہا۔

''علاج تو ہے لیکن فوری نہیں۔ اگر آنٹی انکل نے گھر میں داخل ہوتے ہی ''ہاں'' کہہ دیا تو بیماری یوں اُڑن چھو ہو جائے گی۔'' عامر نے چٹکی بجائی۔

''اس میں تو بہت وقت لگے گا۔'' اویس نے کہا۔

''پھر اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔'' عدنان صوفے کے سامنے رکھی ہوئی میز پر ٹانگیں رکھتا ہوا بولا۔

''آئیڈیا!'' اویس ایک دم چہک اٹھا۔ ''ہم میں سے کوئی نہ کوئی زینی کے گھر فون کر کے پتا کر لیتا ہے۔''

''نہ بھائی نہ۔'' عدنان نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ''وہ تو یہ مانتی ہی نہیں کہ ہمیں جانتی بھی ہے۔''

''اب تو خیر ہماری بھابی بننے لگی ہے، اس لئے اب تو پہچانے گی۔ اور پھر ظاہر ہے فون پر وہ ہمارا کچھ بگاڑ تو سکتی نہیں۔''

''شرم کرو اویس! بھابی کے متعلق تمیز سے بات کی جاتی ہے۔''

''آئی ایم سوری۔'' اویس شرمندہ ہو گیا۔

''خیر اب زیادہ شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' عامر نے کہا۔ ''فون ادھر کرو میں بات کرتا ہوں ان سے۔''

''تم کس خوشی میں بات کرو گے؟ پہلے بھی ایک مرتبہ ڈانٹ کھا چکے ہو۔'' اویس نے فون اپنی جانب کھسکا لیا۔

''وہ اور وقت تھا اب اور بات ہے۔'' عامر نے فون اپنی طرف کرنے کی کوشش کی۔

''چلو یار ٹاس کر لیتے ہیں۔'' عدنان نے جیب سے سکہ نکالا۔ ''اگر چاند تارا یا زنجیر آئی تو فون میں کروں گا اور اگر سکہ بالکل سیدھا کھڑا ہو گیا تو فون عامر کرے گا۔ اگر سکہ ایسے کھڑا ہو کہ چاند تارا اور زنجیر دونوں الٹ جائیں تو فون اویس کرے گا۔ یہ لو میں سکہ اچھال رہا ہوں۔''

یہ کہہ کر اس نے سکہ اچھالا جو اویس نے درمیان میں ہی کیچ کر لیا۔

''ہم تیسری دنیا کے ممالک نہیں ہیں جن کے سامنے تم سپر پاور جیسی شرائط پیش کر رہے ہو۔ ہم تمہاری وہ کٹائی کریں گے کہ یاد رکھو گے۔ کوئی اقوام متحدہ بھی امداد کے لئے نہیں آئے گی۔'' اویس نے دھمکی دی۔

اویس اور عدنان کی اس لڑائی کے دوران عامر فون ملا چکا تھا۔ گھنٹی جا رہی تھی۔ اویس اور عدنان اس کی ''ہیلو'' پر چونکے لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی۔

دوسری طرف سے فون ایک ملازم نے اٹھایا۔

''زینی بی بی سے بات کرنی تھی۔''

''وہ تو آرام کر رہی ہیں ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ ویسے آپ اپنا نام بتا دیں اور اگر مناسب سمجھیں تو پیغام دے دیں میں ان تک پہنچا دوں گا۔''

''نہیں شکریہ، اس کی ضرورت نہیں، میں ٹھہر کر فون کر لوں گا۔'' یہ کہہ کر عامر نے فون رکھ دیا۔

''کیوں بات نہیں ہوئی؟'' ایرج نے پوچھا۔

''نہیں ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لئے آرام کر رہی ہیں۔''

''اوہو!'' عدنان اور ایرج اکٹھے بولے۔

''چلو خیر اتنی دیر میں ہم پکوڑوں اور سینڈوچز پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔'' عامر نے ٹرالی اپنی جانب گھسیٹی۔

ابھی وہ پکوڑوں سے انصاف کر ہی رہے تھے کہ باہر سے کار کا ہارن سنائی دیا۔

''آنٹی انکل آ گئے ہیں۔'' اویس نے فرنچ ونڈو سے باہر کی طرف جھانکتے ہوئے کہا۔

''چلو پھر لیونگ روم میں، ہم نتائج کے بے چینی سے منتظر ہیں۔'' عامر میز کے اوپر سے چھلانگ لگا کر سب سے پہلے دروازے سے نکلا۔ باقی سب ہی اس کے پیچھے پیچھے لیونگ روم میں پہنچے۔

خلاف توقع امی اور پاپا کے چہرے پر خوشگوار تاثرات موجود نہیں تھے۔

''خیریت؟'' ایرج اسی قدر پوچھ سکا۔

''ہاں خیریت ہے۔'' پاپا نے سرسری لہجے میں کہا۔

''کیا بنا انکل؟'' اویس کی بے چینی عروج پر تھی۔

''بھئی کھڑے کیوں ہیں آپ لوگ، آرام سے بیٹھیں پھر بات بھی ہو جائے گی۔'' پاپا نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

پاپا کے اس غیر معمولی رویے کے پیچھے ایرج اپنی زندگی کے اس اہم فیصلے کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا جو آج زینی کے گھر کے ڈرائینگ روم میں کیا گیا تھا۔ اگر بات طے ہو گئی ہوتی

تو پاپا کا رویہ بالکل مختلف ہوتا لیکن وہ یہ یقین کرنے پر بھی تیار نہیں تھا کہ وہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی بازی ہار چکا ہے۔ پاپا تفصیل بتانے لگے تھے لیکن وہ ''نہیں'' کا لفظ نہیں سننا چاہتا تھا۔ امید کی ایک چھوٹی سی ڈور ابھی اس کے لئے بہت تھی۔ وہ ایک دم کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے سے کمرے کی فضا اور بھی افسردہ ہوگئی۔

''زینی کے والدین تو چاہتے تھے لیکن ان کے مطابق خود زینی نہیں چاہتی تھی۔'' پاپا نے کہا۔

''لیکن کیوں چچا جان، آخر کوئی وجہ تو ہو؟'' عدنان کا موڈ سخت آف ہو چکا تھا۔

''انکار تو بہرحال انکار ہی ہوتا ہے، وجہ بتانا یا نہ بتانا برابر ہے۔'' پاپا بولے۔

''ویسے اس انکار سے وہ لوگ بھی خوش نہیں تھے، ظاہر ہے اتنا اچھا رشتہ تھا۔'' امی نے کہا۔

''خیر انکار یا اقرار کرنا تو زینی کا حق تھا جو اس نے استعمال کیا۔'' پاپا نے سگار سلگایا۔

''اب کوئی ایسا گیا گزرا تو ہے نہیں میرا بیٹا۔ ایک سے ایک اچھا رشتہ ہے اس کے لئے اور وہ اپنی نادیہ کم ہے کسی سے؟'' امی بولیں۔

نوین اسی وقت کمرے میں داخل ہوئی، وہ ابھی ہی ہسپتال سے لوٹی تھی۔

''کیا ہوا یہ سب کے منہ کیوں لٹکے ہوئے ہیں اور ایرج بھائی کہاں ہیں؟'' اس نے اپنا بیگ صوفے پر پھینکا۔ ''رحیم بابا ایک کپ گرم گرم چائے اور ساتھ میں کچھ کھانے کو بھی، بڑی بھوک لگی ہے۔''

اب بھی کوئی کچھ نہ بولا تو اس نے ایک ایک کی صورت غور سے دیکھی۔

''خیریت تو ہے؟'' اس نے تشویش سے پوچھا۔

''ہاں خیریت ہے، بالکل خیریت ہے۔'' پاپا بولے۔

''آپ لوگ آج زینی کی طرف گئے تھے؟'' نوین نے تشویش سے پوچھا۔ خطرے کی گھنٹی اس کے ذہن میں بھی بج چکی تھی۔

''اچھا انکل! اب ہم چلتے ہیں۔'' اویس جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا اور نوین کو بتائے بغیر اپنے سوال کا جواب مل گیا۔

''پاپا! انہوں نے کہیں۔'' اس سے آگے وہ اپنے خدشات کا بھی اظہار نہ کرسکی۔ عدنان وغیرہ جا چکے تھے۔

''ہاں بیٹا!''

''اور اب ایرج بھائی؟''

''اپنے کمرے میں ہوگا۔''

نوین سیدھی ایرج کے کمرے کی طرف بڑھی۔ دروازہ اندر سے بند تھا اور انگریزی کے گانے فل والیوم کے ساتھ ڈیک پر لگے ہوئے تھے۔ ان کی اونچی آواز بند دروازے سے بھی باہر آرہی تھی۔ ایک لمحے کو نوین نے واپسی کے لئے قدم بڑھائے کیونکہ بند دروازہ اور اونچی آواز میں گانے۔ ایسا تبھی ہوتا جب ایرج شدید ڈیپریشن کا شکار ہوتا تھا لیکن نوین کچھ سوچ کر واپس پلٹ آئی اور دروازہ بجایا۔ گانوں کی آواز اتنی بلند تھی کہ اس کی دستک ان آوازوں میں ہی دب گئی۔

☆======☆======☆

کافی دن تک ایرج کے دوست فون پر زینی سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن بے سود۔ کالج بھی گئے لیکن زینی وہاں بھی نہیں آئی تھی اس لئے شائستہ بھی اس کے متعلق کچھ نہ بتا سکی۔ ایرج نے اپنے معمولات میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ وہ اپنے رویئے سے امی، پاپا اور نوین کو کوئی دکھ نہیں دینا چاہتا تھا لیکن جو کچھ اس کے دل پر گزر رہی تھی اسے وہی جانتا تھا۔ دوسری جانب وہ تینوں بھی جانتے تھے کہ ایرج کا وہ رویہ جو عمومی ہوتا تھا اب اوپرا اوپرا سا لگتا تھا جیسے وہ یہ رویہ بنانے کی کوشش کررہا ہو۔ اس نے اس موضوع پر اب تک کسی سے بات نہیں کی تھی۔ امی اس کے لئے بہت فکرمند تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ بہو آجائے تو بیٹی کو بھی رخصت کریں۔ نوین کا میڈیکل کا آخری سال تھا اور امی کا خیال امتحانوں کے فوراً [illegible]س کے ہاتھ پیلے کردینے کا تھا۔

''آپ ایرج سے نادیہ کے متعلق بات کرکے تو دیکھیں۔'' امی ایرج کے ناشتے کی میز سے اٹھنے کے بعد پاپا سے دبے دبے لہجے میں بولیں۔

''کچھ دن اسے اس شاک سے سنبھلنے میں لگیں گے اس کے بعد بات کریں گے۔''

''دیکھ لیں، احسن بھائی اتنے دن تک انتظار نہیں کرسکیں گے۔ کب تک جوان بیٹی کو گھر پر بٹھائے رکھیں گے۔''

''میں فوری طور پر ایرج سے بات کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ آپ اگر موقع دیکھتی ہیں تو کرلیں لیکن احتیاط سے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ تھوڑا عرصہ یہ بات نہ ہی کریں۔''

"یہ بھی بڑی پریشانی ہے۔ مجھے نوین کا بھی سوچنا ہے۔ بہو آ جاتی ہے تو یہ ذمہ داری اسے سونپ دیتی۔ دن ہی کتنے رہ گئے ہیں اس کے امتحانوں میں۔"

"کون سی نوین کی عمر نکلی جا رہی ہے، آرام سے سب کام ہو گا۔"

"ایک تو ہمارے بچے بغیر کسی کامے فل سٹاپ کے پڑھتے ہیں۔ لوگ سوچتے ہیں کہ ڈاکٹر بن گئی ہے تو پتا نہیں کتنی عمر ہو گئی ہے۔ حالانکہ ابھی تو اکیس میں لگی ہے۔"

"اچھا دیکھتے ہیں ابھی تو مجھے آفس سے دیر ہو رہی ہے۔" پاپا کرسی پیچھے کرتے ہوئے اٹھے۔

پھر امی نے ایرج سے بات کرنے کی بہت کوشش کی لیکن اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر وہ ہر بار چپ ہو جاتیں۔ اکلوتے بیٹے کو مزید کوئی صدمہ دینا نہیں چاہتی تھیں۔ اور بیٹا بھی ایسا جس نے ان سے کوئی شکوہ تک نہیں کیا تھا۔ ان کی خاطر اب بھی ویسے ہی ہنستا بولتا تھا۔

"تم ایک مرتبہ زینی سے ملو تو۔ اس سے پوچھو کہ انکار کی وجہ کیا تھی؟" ایک دن اویس نے ایرج سے کہا۔

"فائدہ؟"

"اپنے حق کے لئے تھوڑا سا تو لڑو ایرج۔" عامر بولا۔

"کس حق کے لئے لڑوں؟ اگر انکار میرے یا اس کے والدین کی طرف سے ہوتا تو میں لڑتا بھی۔ انکار تو زینی نے کیا ہے پھر بتاؤ، میں کس طرح حق جتاؤں؟ کیسے حق جتا سکتا ہوں اس پر؟"

"وجہ تو پوچھ سکتے ہو نا اس سے۔"

"وجہ پوچھنے سے کیا انکار اقرار میں بدل جائے گا؟ نہیں اب یہ باب ہی ختم ہو گیا ہے۔"

"یہ باب تو تب ختم ہو گا جب تم اسے بھول جاؤ گے، کیا بھلا سکتے ہو اسے؟"

"کیا فضول ٹاپک ڈسکس کرنے لگے ہو تم لوگ۔" اس نے بات ختم کرنے کے لئے کہا۔ "آؤ کہیں باہر چلتے ہیں۔" سب نے اپنے اپنے موٹر بائیک کی چابیاں اٹھائیں اور لارنس گارڈن کی طرف چل دیئے۔ موٹر بائیک پارک کر کے وہ باغ کی روشوں پر ٹہلنے لگے۔ اسی جگہ کچھ عرصہ پہلے زینی اور ایرج بھی دیر تک ٹہلتے رہے تھے۔ باغ کی فضا میں پہلے کی

طرح پھولوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔ رنگ برنگے پھولوں سے ہواؤں کی اٹھکیلیاں جاری تھیں۔ جب باغ میں واقع قائداعظم لائبریری کی عمارت سے وہی دشمنِ جاں نکلی۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ آسمان پر چھائے سیاہ بادلوں کے نیچے سرمئی سوٹ میں وہ قیامت ڈھا رہی تھی۔ اس کے گہرے سرخ بال ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اس کے چہرے کو چھو رہے تھے۔

"یہ زینی ہے ناں؟" اویس نے پوچھا۔

"ہاں وہی ہے۔" ایرج کو خاموش پا کر عامر نے کہا۔

"ٹھہرو میں اس سے بات کرتا ہوں۔" اویس نے کہا۔ "میں اس سے وجہ تو پوچھوں انکار کی۔"

یہ کہہ کر وہ پارکنگ کی طرف بڑھا۔

"ٹھہرو اویس!" ایرج نے کہا لیکن اس نے سنی اَن سنی کر دی۔

"واہ واہ آپ تو آج بھی پہلے کی طرح ہی دکھائی دے رہی ہیں۔ میرا مطلب ہے پہلے کی طرح خوش۔" اویس اس کے قریب پہنچ کر بولا۔

"کیا؟" زینی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیرت سے کہا۔

"پلیز، اب یہ نہ کہنا کہ آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ یہ بات اور آپ کا رویہ دونوں پرانے ہو گئے ہیں۔" اویس نے کہا۔ "ویسے آپ کی بھولنے کی عادت کافی پختہ ہو گئی ہے اور آپ نے ایسے شخص کو بھلا دیا ہے جو شاید تمام عمر آپ کو نہ بھلا سکے۔"

اب اویس کے پاس عامر، عدنان اور ایرج بھی پہنچ چکے تھے۔

"کیا چاہتے ہیں آپ لوگ؟" اس نے قدرے تیز لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" ایرج بولا۔ "آپ سے کچھ لینا ہوتا تب بھی یوں سرِ راہ آپ کو نہ روکتا، آؤ اویس۔"

یہ کہہ کر وہ مڑ گیا۔

"تم جانا چاہتے ہو تو جاؤ، میں وجہ جانے بغیر نہیں جانے دوں گا۔ محترمہ میں آپ کے انکار کی وجہ جاننا چاہتا ہوں۔"

"وجہ؟ تم وجہ پوچھنے والے کون ہوتے ہو؟ انکار یا اقرار میرا حق ہے خواہ وجہ کے ساتھ ہو یا بلا وجہ۔ اور مجھے یہ بھی پسند نہیں ہے کہ کوئی میرا راستہ روکے، سمجھے۔" اس نے کہا

اور کار میں بیٹھ کر تیزی سے کار سٹارٹ کر کے گیٹ سے باہر نکل گئی۔

زینی کی وجہ سے سب کا موڈ آف ہو چکا تھا اس لئے یہ سب بھی گھر کی طرف چل دیئے۔

رات کے کھانے پر امی نے دوبارہ ایرج سے شادی کا تذکرہ کیا۔ ''بیٹا کب تک یونہی اکیلے رہو گے۔ تم اسی لئے پریشان رہتے ہو کہ تم تنہا ہو۔ اس تنہائی کو بانٹنے والی آ جائے گی تو خود بخود سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''امی! میں اس ٹاپک پر بات نہیں کرنا چاہتا۔''

''کب تک بیٹا؟ کیا کبھی بھی شادی نہیں کرو گے؟'' امی نے کہا۔ ''یہ سب وقتی باتیں ہوتی ہیں۔ زینی کے بعد دنیا لڑکیوں سے خالی تو نہیں ہو گئی۔ ایک سے ایک خوبصورت لڑکی موجود ہے تم نام تو لو کسی کا۔''

''مجھے شادی نہیں کرنی۔'' وہ کھانا ادھورا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''کھانا تو کھاتے جاؤ بیٹا۔''

''بھوک نہیں ہے۔''

''میں نے کہا تھا ناں کہ ابھی اس سے بات کرنا ٹھیک نہیں ہے۔'' پاپا نے اس کے جانے کے بعد کہا۔

''کب تک خاموش رہیں گے؟ کیا شادی نہیں کرنی اس کی؟''

''کرنی ہے لیکن سب کچھ تحمل سے کرنا ہو گا۔''

جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے ایرج بھی جیسے بناوٹ کے اس خول سے تنگ آتا جا رہا تھا جو اس نے امی اور پاپا کی خوشی کی خاطر اپنے اوپر چڑھا رکھا تھا۔ اور ایسا تب ہی ہوتا تھا جب امی ارادی یا غیر ارادی طور پر اس کی شادی کا تذکرہ کرتی تھیں۔ امی کا خیال تھا کہ اب نادیہ کے لئے پروپوزل لے جانے میں دیر کرنا مناسب نہیں۔ دوسری طرف ایرج یہ بات سننا ہی نہیں چاہتا تھا۔ انہی باتوں کی وجہ سے وہ اپنے آفس اور گھر آ کر اپنے کمرے تک محدود ہو گیا تھا۔

''عامر بیٹا! تم ہی ایرج کو اپنے ساتھ کہیں باہر لے جایا کرو۔'' ایک دن جب عامر ایرج سے ملنے اس کے گھر آیا تو امی نے اس سے کہا۔ ''میں تو بہت پریشان ہوں اس کے لئے، کوشش کرو اس کا دل لگا رہے۔''

''آنٹی! ہم تو پوری کوشش کر رہے ہیں۔'' وہ بولا۔ ''آپ اس سے شادی کا ذکر نہ کیا کریں، اس سے وہ چڑ جاتا ہے۔''

''میں اس کی فکر نہیں کروں گی تو اور کون کرے گا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس لڑکی نے کیا جادو کر دیا ہے۔''

''جادو تو خیر اس نے کوئی نہیں کیا۔ بہر حال میرا یہی مشورہ ہے کہ کم از کم کچھ دن تک اس سے یہ بات نہ کریں۔''

عامر، عدنان اور اویس اس کے کمرے میں پہنچے تو وہ ہلکی ہلکی موسیقی سن رہا تھا۔

''ہیلو، کیا ہو رہا ہے؟'' انہوں نے ہمیشہ کی طرح کمرے کی فضا کو یکدم تبدیل کر دیا۔

''ہونا کیا ہے عاشقی ہو رہی ہے۔ باہر شام کا جھٹپٹا اور سر پر چھت نہ ہوتی تو اختر شماری سے لطف اٹھایا جا رہا ہوتا۔'' اویس اس کے بستر پر دراز ہوتا ہوا بولا۔

''تم رہو گے جاہل کے جاہل۔'' عامر نے صوفے پر بیٹھ کر سامنے پڑی میز کے اوپر ٹانگیں جما لیں۔ ''کیلکولیٹر اور کمپیوٹر کے زمانے میں اختر شماری نہیں کی جاتی۔ اس زمانے میں تو بہت آہستہ یا پھر بہت تیز موسیقی کی لے پر ایش ٹرے کو سگریٹ کے بچے کھچے ٹکڑوں سے بھر کر بے وفا محبوب کو یاد کیا جاتا ہے۔''

''دے چکے تم لوگ اپنے کومنٹس؟'' ایرج نے پوچھا۔

''ویسے تو ابھی ہم نے تمام کومنٹس نہیں دیئے لیکن ہم اس کے باوجود حاتم طائی کی قبر پر لات مار کے تمہیں بولنے کی اجازت دیتے ہیں۔'' عدنان نے گویا سچ مچ ہی حاتم طائی کی قبر پر لات ماری۔

''میں عاشقی نہیں کر رہا، ایک بزنس ڈیل کے متعلق سوچ رہا ہوں۔''

''یعنی زینی کی زلف کی سرخ زنجیر سے نکل کر سبز اور نیلے نوٹوں کے عشق میں مبتلا ہو گئے ہو۔''

''ایک بزنس مین کا یہی حال ہوتا ہے۔ سبز اور نیلے نوٹوں کے متعلق سوچنا اور انہیں اپنی تجوری میں بھرتے جانا۔'' عامر نے ایک مصنوعی آہ بھری۔ ''کبھی کسی بزنس مین نے یہ نہیں سوچا کہ اس کے بے روزگار دوست کو بھوک بھی لگ سکتی ہے۔''

''یہ کھانے کا کون سا وقت ہے؟'' عدنان نے کہا۔

''ابھی تو نہیں ہے ایک گھنٹے بعد ہو جائے گا، پھر بھوک تو لگ ہی جائے گی ناں۔''

عامر نے کہا۔

''کہاں کرنا ہے ڈنر؟'' ایرج نے پوچھا۔

''ہانگ کانگ، تائی وا یا کسی بھی چائنیز میں۔''

''تو پھر ایک گھنٹہ انتظار کرو۔''

عامر انتہائی کامیابی سے ایرج کو گھر سے باہر لے جا رہا تھا۔ اسے باہر نکلتا دیکھ کر امی خوش تو ہوئیں لیکن بولیں کچھ نہیں۔

☆======☆======☆

ابھی انہوں نے ہاٹ اینڈ ساار اور چکن کارن سوپ کا آرڈر ہی دیا تھا کہ عدنان کی نظر کونے کی میز پر پڑی جہاں زینی دو لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی سوپ پی رہی تھی۔

''او ہو گڑ بڑ ہو گئی''۔ وہ زیر لب بڑبڑایا۔

''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ بولا اور دعا کرنے لگا کہ ایرج کی نظر اس پر نہ پڑے۔ باہر نکلنے یا کاؤنٹر پر جانے کی صورت میں بھی انہیں یوں گزرنا پڑتا کہ زینی ایرج کی نگاہوں سے بچ نہیں سکتی تھی۔

''سوپ ہم یہاں پئیں گے اور کھانا کسی اور چائنیز میں کھائیں گے''۔ اس نے کہا۔ وہ جلد یہاں سے جانا چاہتا تھا۔

''خیریت تو ہے؟'' اویس نے پوچھا۔ ''ہم سب کو ہی یہاں کا کھانا پسند ہے''۔

''ہمیں تو لکشمی چوک کا کھانا بھی بہت پسند ہے۔'' عامر نے کہا۔ وہ بھی زینی کو دیکھ چکا تھا۔ ''یہ ڈنر چونکہ میرے اعزاز میں دیا جا رہا ہے۔ اس لیے میری مرضی چلے گی۔ ابھی سوپ پی کر ہم بقیہ ڈنر تناول فرمانے کے لیے لکشمی چوک جائیں گے۔ یہی ہمارا فیصلہ ہے جس پر کسی کو اعتراض کی گنجائش نہیں''۔

قسمت کی خرابی کہ ویٹر نے دونوں میزوں پر تقریباً اکٹھے ہی بل دیئے اور دونوں اکٹھے ہی باہر نکلے۔ دونوں کاریں ساتھ ہی ساتھ پارک تھیں۔ زینی کو دیکھ کر ایرج ایک لمحے کو رکا۔ اس نے بھی ایک نظر ایرج پر ڈالی اور پھر کار تیزی سے آگے بڑھا لی۔ ایک مرتبہ پھر سب کا موڈ آف ہو گیا اور لکشمی چوک کے لذیذ اور مزے دار کھانے بھی ان کے موڈ درست نہ کر سکے۔

ایرج نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کچھ عرصہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے بیرون ملک چلا جائے گا۔ وہ اپنے یا نادیہ کے والدین اور خود نادیہ کو کوئی جھوٹی امید نہیں دلا سکتا تھا۔ اسے زینی پسند تھی صرف اور صرف زینی۔ اگر وہ اس کی نہیں ہو سکتی تو پھر کوئی بھی اس کی نہیں ہوگی، یہی اس کا فیصلہ تھا۔

''بیٹا ایک کام تو کرتے جاؤ۔'' وہ تیار ہو کر کمرے سے نکلا تو امی نے اسے آواز دی۔

''جی کہیے۔''

''شائستہ کی امی نے اس کے لئے کچھ چیزیں بھیجی ہیں۔ شام کو ان کا فون بھی آئے گا۔ ذرا اسے کالج جا کر بتا دینا کہ ہاسٹل جانے کے بجائے فارغ ہو کر یہیں آ جائے۔''

ایک لمحے کو ایرج کی نگاہوں میں ماضی کے کچھ سائے لہرائے لیکن پھر وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''جی کہہ دوں گا۔'' اور کمرے سے نکل گیا۔

کار پارک کر کے ایرج کالج کے اندر پہنچا۔ سامنے اس کے دوست راشد کے اردگرد کھڑے سٹوڈنٹ اس کے بنائے ہوئے زوئیس کے لائف سائز مجسمے کی سمسٹری اور روم ڈسکس کر رہے تھے۔ ایرج بھی ان کے پاس چلا آیا۔ تھوڑی سی رسمی بات چیت کے بعد اس نے ان سے شائستہ کے متعلق پوچھا۔

''وہ ملی کری آپا کے پاس بیٹھی مزے سے کوک اور چپس اُڑا رہی ہے۔'' راشد نے بتایا۔

ایرج وہاں پہنچا۔ شائستہ اور اس کی دو سہیلیوں کے علاوہ وہاں وہ دشمنِ جاں بھی کاندھے پر کیمرہ لٹکائے اور ہاتھ میں اپنی تھیسس کی رپورٹس اور چند پوسٹرز اٹھائے باتوں میں مصروف تھی۔ زینی کی ایرج کی جانب پشت تھی۔ شائستہ نے اسے آتا دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔

''اے ایرج! کیسے آنا ہوا؟''

شائستہ کی اس بات کے ساتھ ہی زینی کی زبان کو بریک لگ گیا۔

''میں چلتی ہوں اب۔''

''رکو تو ذرا۔'' شائستہ نے کہا۔ ''یہ تو بتاتی جاؤ کہ ایگزیبیشن کہاں ہوگی؟''

''ابھی تھوڑی دیر میں آ کر سب بتاتی ہوں۔ ذرا انار کلی سے پوسٹر کلرز لے آؤں۔''

''اچھا جاتے جاتے میرا بورڈ اپنے لاکر میں رکھ دینا۔'' شائستہ کی ایک سہیلی نے کہا۔

بورڈ لے کر زینی اٹھی، بائے کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔

''آج ادھر کیسے آنا ہوا؟'' شائستہ نے چپس کا پیکٹ اور کوک اس کی طرف بڑھایا۔

'' آنٹی نے کوئٹہ سے تمہارے لئے کچھ چیزیں بھیجی ہیں۔ شام کو ان کا فون بھی آئے گا اس لئے ہاسٹل کی بجائے گھر ہی آ جانا۔'' اس نے پیکٹ سے چپس نکالتے ہوئے کہا۔

'' ہاں امی کا خط آیا تھا کہ کچھ چیزیں بھیجیں گی۔''

'' پھر میں تمہیں لے جاؤں یا خود ہی آ جاؤ گی۔''

'' خود آ جاؤں گی۔ کالج بس بالکل سامنے سے تو گزرتی ہے۔''

'' اچھا میں اب چلتا ہوں شام کو تفصیلی بات چیت ہو گی۔''

وہ اسے خدا حافظ کہہ کر گیٹ کی طرف بڑھا۔ پارکنگ سے زینی بھی اپنی کار نکال رہی تھی۔ ایرج نے بھی اس کے پیچھے پیچھے اپنی کار نکالی۔ اولڈ کیمپس سے آگے نکل کر زینی نے بائیں جانب اشارہ دیا۔

'' انارکلی سے پوسٹر کلرز لے آؤں۔'' ایرج کو زینی کے الفاظ یاد آئے۔

ابھی زینی نے کار کو بائیں جانب موڑا ہی تھا کہ اچانک ایک تیز رفتار جیپ ٹریفک سگنل توڑتی ہوئی آئی اور زینی کی کار سے بری طرح ٹکرا گئی۔ زینی کی طرف والا دروازہ بالکل پچک گیا۔ کار کے شیشے بھی سڑک پر دور دور تک بکھر گئے تھے۔ یہ منظر دیکھتے ہی ایرج تیزی سے کار کو اسی جانب لے گیا۔ چند ہی لمحوں میں کار اور جیپ کے اردگرد لوگوں کا ایک بڑا مجمع جمع ہو چکا تھا۔ ایرج بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ زینی کا سر اسٹیئرنگ سے لگا ہوا تھا اور وہ بے ہوش معلوم ہوتی تھی۔ جیپ میں بیٹھے ہوئے لڑکوں کو بھی چوٹیں آئی تھیں اور اب وہ کچھ پشیمان بھی دکھائی دے رہے تھے۔ یہ وقت انہیں کچھ کہنے کا نہیں بلکہ زینی کی مدد کرنے کا تھا۔ اس لئے وہ انہیں نظرانداز کر کے دوسری جانب والے دروازے سے کار کے اندر پہنچا اور زینی کو نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔

'' آپ کون ہیں جی؟'' مجمع میں سے کسی نے پوچھا۔ '' ان بی بی سے کوئی رشتہ ہے آپ کا یا یونہی ہمدردی کے مارے انہیں نکال رہے ہیں۔''

کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس '' جذبہ ہمدردی'' کا اچھا سا جواب دیتا لیکن اس وقت وہ سچویشن کو مزید خراب نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے بولا۔ '' یہ بی بی میری منگیتر ہیں۔ وہاں نیشنل کالج آف آرٹس میں پڑھتی ہیں۔''

'' اوئے کیا مجمع لگایا ہوا ہے، تماشا ہو رہا ہے کوئی۔'' کانسٹیبل لوگوں کو پیچھے ہٹا کر ایرج کی مدد کو آگے بڑھا۔ ایرج زینی کو اپنی کار میں انکل احسن کے کلینک لے گیا۔ زینی نیم بے

ہوشی کے عالم میں تھی۔ غالباً یہ اسٹیئرنگ سے سر ٹکرانے کا نتیجہ تھا۔

'' یہ سب ہوا کیسے؟'' عدنان نے زینی کی مرہم پٹی کرنے اور چند دوائیں دینے کے بعد پوچھا۔

'' یہ تو میں بتاتا ہوں ابھی، پہلے یہ بتاؤ کہ کوئی خطرے والی بات تو نہیں؟'' ایرج نے اس سے پوچھا۔

'' خطرے والی کوئی بات نہیں۔ ابھی گھنٹہ دو گھنٹہ سونے کے بعد بالکل فریش ہو کر اٹھ کھڑی ہو گی، لیکن یہ بتاؤ کہ یہ تم سے کیسے ٹکرائی؟''

'' مجھ سے نہیں جیپ سے ٹکرائی تھی۔'' پھر ایرج نے اسے تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔

'' ہوں، پھر اب؟''

'' اب اس کے ممی اور ڈیڈی کو فون کر دو۔ میرا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بھی اب چلتا ہوں۔'' ایرج باہر نکلتے وقت پھر مڑ کر بولا۔ '' مجھے فون پر اس کی امپرومنٹ و کیفیت ضرور بتانا۔''

'' او کے۔''

ایرج گھر پہنچ کر عدنان کے فون کا انتظار کرنے لگا لیکن اس کے علاوہ باقی ہر دوست کا فون آ گیا۔ انہیں عدنان نے زینی کے ایکسیڈنٹ کی خبر دی تھی اس لئے انہوں نے ایرج سے احوال پوچھنا ضروری خیال کیا۔ تمام دن انتظار کے بعد جب شام کو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو ایرج نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔

'' ہیلو!'' اس نے بے تابی سے کہا۔

'' ایرج؟'' جواب میں عدنان کے بجائے اسے زینی کی آواز سنائی دی۔ انداز سوالیہ تھا۔

'' جی بول رہا ہوں۔'' اس نے اپنے لہجے کو ہر ممکن حد تک سپاٹ رکھا۔

'' میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔''

'' کوئی خاص وجہ؟''

'' کیا اب تم سے ملنے کے لئے مجھے ایک اور ایکسیڈنٹ کروانا پڑے گا؟''

'' نہ مزید کسی ایکسیڈنٹ کی ضرورت ہے اور نہ ملاقات کی۔''

'' میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔''

'' زینی! جیسے تم نے ایک فیصلہ کیا تھا، اسی طرح میں نے بھی ایک فیصلہ کیا ہے۔ آج کی

ملاقات محض اتفاق تھی۔ ورنہ میں تو اپنی زندگی کا وہ باب ہی بند کر چکا ہوں جہاں تمہارا جیتا جاگتا پیکر میرے ہمراہ تھا۔''

''صرف ایک دفعہ بھی نہیں ملو گے؟''

''فائدہ؟''

''تم بزنس مین ہو نا ہر چیز میں فائدہ دیکھنے والے۔'' وہ تلخی سے بولی۔

''تم جو بھی سمجھو، میں بات کو طول دینا بے فائدہ سمجھتا ہوں۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو، بات کو طول دینے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' وہ گہری سانس لے کر بولی اور رابطہ منقطع ہو گیا۔

ایرج کافی دیر تک ٹیلی فون سٹینڈ کے قریب کھڑا رہا پھر سر جھٹک کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ رات کے کھانے پر عدنان ایرج کے گھر ہی چلا آیا۔

''تم نے زینی کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔'' عدنان نے کہا۔ کھانے کے بعد وہ دونوں خواب گاہ میں بیٹھے قہوہ پی رہے تھے۔

''ایک مرتبہ مل لینے میں کیا حرج تھا۔''

''میں یادوں کی اس ڈور کو طویل نہیں کرنا چاہتا جس میں مَیں اور زینی کبھی بندھے تھے۔''

''تم نہیں جانتے وہ کتنی اپ سیٹ تھی، ایز اے فرینڈ ہی بات کر لیتے۔''

''عدنان! فرینڈ شپ محبت میں بدل سکتی ہے، لیکن محبت فرینڈ شپ میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔ میں دوست کی حیثیت سے اس سے بات کر ہی نہیں سکتا تھا۔''

''وہ تمہارے لئے یہ خط دے گئی تھی۔'' عدنان نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر ایرج کی طرف بڑھایا۔

''خط؟'' ایرج نے لفافہ الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ''اب گھر چلی گئی ہے وہ؟''

''ہاں۔''

نہ چاہتے ہوئے بھی ایرج نے وہ لفافہ چاک کر لیا۔ اندر ایک قدرے طویل خط تھا۔

''ایرج! میں جانتی ہوں کہ تمہیں میرے انکار سے صدمہ پہنچا ہے۔ اس قدر شدید کہ اب تمہیں مجھ سے ملنا بھی گوارا نہیں یا پھر یہ شاید صدمہ نہیں بلکہ نفرت ہے۔ سب سے پہلے تو میں اپنی جان بچانے پر تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔

اس قدر نفرت کے باوجود بھی تم نے انسانی ہمدردی کے تحت میری جان بچائی۔ اس کے لئے مجھے شکر گزار تو ہونا چاہئے ناں۔

آج پہلی مرتبہ تم نے میری مدد نہیں کی۔ اس سے پہلے بھی تم ایسا کر چکے ہو، لیکن میں نے ہمیشہ اپنا رویہ خراب رکھا۔ اس کی وجہ تم سے نفرت یا بیزاری کا اظہار نہیں بلکہ تمہارے بڑھتے قدموں کو روکنا تھا کیونکہ میں جانتی تھی کہ حقیقت جاننے کے بعد تمہارے دل میں میرے لئے کوئی گنجائش نہیں رہے گی۔ سو میں نے انکار کر دیا، لیکن اس انکار کے بعد میرے دل میں جو بے کلی تھی وہ بڑھنے لگی۔

میں تمہیں آج اپنی زندگی کی کہانی سنانا چاہتی ہوں تا کہ میری یہ بے کلی دور ہو سکے اور تم میرے رویوں کا مطلب بھی سمجھ جاؤ' لیکن تم نے میرے جذبات کا بھاؤ تاؤ کر کے یہ فیصلہ صادر کیا کہ ملاقات کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ میں نے تمہیں افسردہ کیا، تکلیف دی۔ اس کا بوجھ اس وقت تک میرے دل پر رہے گا جب تک میں اپنی پوزیشن کلیئر نہیں کر دیتی۔

ایرج! تم حیران ہوتے تھے ناں کہ میرے چہرے میں ممی یا ڈیڈی کی مشابہت نہیں بلکہ میں شکل وصورت اور بول چال سے یورپی لگتی ہوں۔ یہ درست ہے۔ دراصل ممی ڈیڈی میرے سگے والدین نہیں ہیں۔ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے بچپن میں مجھے ایک یتیم خانے سے گود لیا تھا۔ میرے والدین کون ہیں یہ میں نہیں جانتی، ممی ڈیڈی بھی نہیں جانتے۔ میں کچھ اور جاننا بھی نہیں چاہتی، میرے لئے سب کچھ ممی ڈیڈی ہی ہیں۔ انہوں نے گود لیتے ہی میرا نام تبدیل کر دیا اور مذہب بھی۔ میں ان کے اس فیصلے پر بہت مطمئن ہوں اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ مجھے قسمت سے ایک مسلمان گھرانہ میسر آیا۔

لیکن ایرج مجھے ممی ڈیڈی کے خاندان میں کسی نے بھی قبول نہیں کیا۔ ہر جگہ مجھے صرف یہ کہہ کر ریجکٹ کر دیا جاتا رہا کہ میرے والدین کا کسی کو علم نہیں۔ ان کے مطابق یورپ میں تو ویسے بھی مائیں بچوں سے پیچھا چھڑاتی ہیں۔

تم جان نہیں سکتے کہ اس بات میں کتنا طنز اور حقارت چھپی ہوتی ہے۔ کوئی یہ نہیں سمجھتا کہ میں تو بالکل بے قصور ہوں۔ مجھ سے زندگی کی خوشیاں اس لئے چھینی جاتی رہی ہیں کہ میں یہ بھی نہیں جانتی کہ میری ماں اور میرا باپ کون ہے۔ مجھے ڈر

تھا ایرج کہ یہ سب جاننے کے بعد تم بھی مجھے اپنانے سے انکار کردو گے۔ مجھ میں سب کچھ برداشت کرنے کا حوصلہ ہے لیکن میں تمہارا انکار برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ اس لئے میں نے تمہارے اندر داخل ہونے کے سب دروازے بند کردیئے، لیکن تم نہ جانے کیسے میرے دل میں گھستے چلے گئے۔ تمہارے پاس تو جیسے اس قفل کی کنجی تھی کہ مزے سے اندر آگئے۔ تم چاہے مجھ سے نفرت کرو لیکن میں آج خود سے اور تم سے یہ اقرار کرتی ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ بے حد۔
زینی۔''

''او مائی گاڈ!'' ایرج نے خط پڑھ کر کہا۔ ''بیوقوف پاگل لڑکی۔''

''کیا ہوا؟'' عدنان نے پوچھا۔

''بلا وجہ ہی خود کو اور مجھے سزا دیتی رہی۔'' اس نے میز پر پڑی کار کی چابی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''میں تھوڑی دیر تک آجاؤں گا۔''

''جا کہاں رہے ہو؟''

''اس پاگل لڑکی کو بتانے کہ مجھے اب بھی اس سے محبت ہے، شدید نہیں شدید ترین۔''

''وِش یو آل دا بیسٹ۔''

لیکن ایرج نے عدنان کی وِش سنی ہی نہیں۔ وہ تو خیالوں میں زینی کے پاس تھا، جہاں زندگی کی طویل شاہراہ پر انہیں قدم سے قدم ملا کر چلنا تھا۔

☆======☆======☆

فریبِ آسمان

ہر روز اخباروں میں حادثات اور بم دھماکوں کی خبریں آتی رہتی ہیں۔ بے شمار لوگ زخمی ہوتے ہیں اور مر بھی جاتے ہیں۔ لوگ اس خبر کو پڑھ کر تھوڑی دیر کے لیے متاثر ہوتے ہیں اور پھر بھول جاتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ ایک خبر کے پس پردہ کتنی کہانیاں چھپی ہوئی ہیں۔

"چوہدری غلام محمد جنت مقام کی پوتیاں اور یہ حرکات۔" دادی جی اپنے پوپلے منہ سے بولیں۔ "کچھ تو اپنے دادا کا لحاظ کرلیا کرو، ہر وقت کچھ نہ کچھ آفت آئی پڑی رہتی ہے۔"

"دلیں دادی جی بھلا ہم نے ایسا کیا گناہ کرڈالا۔" زریں نے منہ بنایا۔

"یہ کم گناہ ہے کہ ہم چوہدری غلام محمد مربعے والی کی پوتیاں ہیں۔" دادی جی بولیں اور بھلا فرحین خاموش بیٹھے یہ کیسے ممکن تھا۔ "پتا ہے زریں دادا جی وصیت لکھ گئے تھے کہ پوتیوں کو ہنسنا بولنا بالکل منع ہے۔"

"اے لو، ہنسنے کا بھی کوئی طریقہ ہوتا ہے۔ یہ کیا اونٹ کی اونٹ ہوئی جاتی ہو، نہ کوئی بات چیت۔ بس منہ اٹھا کر جو ہنسنا شروع کیا تو سات محلوں کو خبر ہوگئی۔ بھلا کبھی کسی نے سوچا تھا کہ غلام محمد جنت مقام کی حویلی سے چوں کی آواز بھی نکلے گی۔"

دادی جی کی بات سن کر تو گویا زریں اور فرحین پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔

"اے کیا باؤلی ہوگئی ہو، میں نے کون سا ایسا لطیفہ کہہ دیا ہے کہ دانت اندر ہی نہیں جا رہے۔"

"حویلی۔" زریں نے کہا اور دونوں پھر کھی کھی کرنے لگیں۔

"کیوں کیا ہوا حویلی کو؟" انہوں نے آنکھیں دکھائیں۔

"حویلی ہو تو اسے کچھ ہو بھی۔" فرحین کو تو یوں بھی بقول دادی جی کے ان سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ ذرا وہ کچھ بول تو جائیں اس پر تو گویا اللہ میاں نے فرض عائد کردیا تھا کہ ان کی بات کی ٹانگ ضرور پکڑے۔ "کبھی سنتے تھے ہماری حویلی تھی، اب تو دس مرلے کا ایک مکان ہے اس کی بھی سب چولیں ڈھیلی۔ برسات میں برتن بھانڈے ہر طرف بکھرے ہوئے، ڈبکی لگانے کے کام تو آسکتے ہیں لیکن کھانا کھانے کے کام نہیں آسکتے۔"

دونوں ایک بار پھر کھی کھی کرنے لگیں اور ان کی یہ ہنسی دادی جی کو جو آگ لگا گئی۔

"کچھ تو بندہ خدا کا خوف کرے، ایک دو چھتیں ہی ٹپکی کوئی آسمان تو نہیں ٹوٹ پڑا۔ اتنی ناشکری لڑکیاں ہیں کہ بس اللہ اب انہیں سمجھائے۔"

"آپ کے لئے ایک دو ٹپکتی ہوں گی، وہ بھول گئیں جو میرے بستر کے عین اوپر چار سوراخ ہیں۔ بھلا نہانے کے لئے باتھ روم بنانے کی کیا ضرورت تھی، وہیں بستر پر اتنا اچھا غسل ہوجاتا ہے۔" زریں جل کر بولی۔

"کتنوں کو یہ بھی میسر نہیں، اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔" دادی جی نے سمجھایا۔

"جی ہاں، مجھے یہ چار سوراخ میسر نہیں، میرے بستر پر صرف دو ہیں۔" فرحین ہنسی۔

"چل زریں اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر۔"

"تم لڑکیوں کو ہر بات میں مذاق سوجھتا ہے۔" وہ جھلا کر بولیں۔ "جان عذاب میں کرڈالی ہے۔" وہ پیر میں چپل گھسیٹ، تسبیح گھما جاءنماز کی طرف بڑھ گئیں۔

کوئی ایک بار نہیں دن میں کچھ نہیں کچھ تو صبح سے شام دس بیس مرتبہ اسی قسم کا ڈرامہ لگتا تھا۔ کبھی کسی اور کبھی کسی بات پر، لیکن پھر وہی دادی جو ناراض ہوکر جاءنماز پر جا بیٹھتی تھیں، تھوڑی دیر بعد اٹھ کے پوتیوں کے لئے پراٹھے انڈے تلنے لگتیں۔ وہ ناز اٹھاتیں کہ کیا کبھی کسی دادی نے پوتے کے بھی اٹھائے ہوں گے۔ ہاں جو کوئی پوتا ہوتا تو پتا چلتا کہ پوتیوں کی کتنی عاشق ہیں، لیکن اب تو صرف دو پوتیاں ہی تھیں جن کے ناز نخرے اٹھاتے نہیں تھکتی تھیں۔ اس بھری پُری دنیا میں اور تھا ہی کون ایسا جس کے لاڈ کرتیں۔ ایک ہی ایک بیٹا تھا سو اسے دیکھے گویا صدیاں بیت گئی تھیں۔

ہاں یہ بیس برس بیس صدیوں سے زیادہ بھاری تھے، جب تک چوہدری غلام محمد کا ساتھ تھا تب تک کچھ ہلکی پھلکی تھیں۔ جیسے ہی وہ رخصت ہوئے گویا ساری ذمہ داری ان پر آن پڑی، ایک اکیلی بوڑھی عورت اور دو جوان پوتیاں' لیکن دادی جی بھی بہت ہمت والی تھیں، پوتیوں کو زمانے سے ایسے بچایا جیسے مرغی اپنے چوزوں کو چیل سے بچانے کے لئے پروں تلے چھپا لیتی ہے۔ اب تو بس ایک امید پر زندہ تھیں کہ شاید کبھی بیٹے کی شکل دیکھنی نصیب ہوجائے۔ پھر پوتیوں کو اس کے حوالے کرکے اپنا رختِ سفر باندھیں۔

"دادی جی آج کچھ کھانے کو نہیں ملے گا۔" زریں نے جب دیکھا کہ آج دادی جی کا غصہ کچھ زیادہ ہی طویل ہوگیا ہے کہ دس منٹ گزر گئے مڑ کے بات تک نہ کی۔ تو اس نے ان

کی دُکھتی رگ کو چھیڑا۔ ''یوں لگتا ہے جیسے پیٹ میں آگ لگی ہو۔''

''وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔'' وہ بولیں۔ ''ایک دفعہ بچپن میں فرحین نے تجھے ڈونگے کا چمچہ مارا تھا، تب سے ہی میں دہلتی آ رہی ہوں۔''

''کیوں دادی جی! چمچ نے کیا کہہ دیا مجھے؟''

''اے لو اسی لئے تو اتنی بھوک لگتی ہے تمہیں۔ کسی کو چمچ مار دو تو چاہے وہ کچھ بھی کھاتا پھرے اس کا پیٹ خالی ہی رہتا ہے۔''

اور ایک بار پھر ان کی کھی کھی شروع ہوگئی۔ اب بھلا اس بات پر بندہ ہنسے ناں تو کیا کرے لیکن چوہدری غلام محمد جنت مقام کی دس مرلہ حویلی سے نکلنے والی ہنسی کی آواز کی تو دادی جی بیری تھیں۔

''اب کیا پھر میں نے ایسا کچھ کہہ دیا جو تم نے اپنے کالج میں نہیں پڑھا۔''

''ارے نہیں دادی جی بالکل پڑھا تھا۔'' فرحین نے اپنی ہنسی چھپائی۔ ''یہی لکھا تھا میری Calculas کی کتاب میں کہ جسے ڈونگے کا چمچ مارا جائے وہ ندیدہ ہو جاتا ہے۔''

''اے پرے ہٹ ندیدی کیوں ہونے لگی میری زریں۔'' انہوں نے اسے کلیجے سے لگایا۔ ''بس بھوک ہی کچھ زیادہ لگتی ہے تو پھر کیا ہوا۔ اپنا کھاتی ہے کسی اور کا حصہ تو نہیں کھاتی، بس اپنا حصہ کھایا پیا اور الگ ہوگئی۔ ندیدے ایسے ہوتے ہیں کیا؟''

''اب مجھے کیا پتا کیسے ہوتے ہیں، میری کتاب میں تو یہی لکھا تھا۔'' فرحین نے بے پروائی سے کہا۔

''دادی جی یہ نہیں مانے گی آپ خواہ مخواہ ہی الجھ رہی ہیں۔'' زریں نے کہا۔ ''اور میں بھوک سے بالکل نڈھال ہو رہی ہوں۔ آخر ڈونگے کے چمچ کی مار برداشت کرنا کوئی آسان کام تو نہیں ہے ناں۔''

اور پھر دادی اماں خالص دیسی گھی میں تر تراتے گرم پراٹھے لے آئیں۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ رسی جل گئی پر بل نہیں گیا یہاں بھی یہی حساب تھا کہ ''کلاہِ خسروی بوئے سلطانی نہیں جاتی۔''

ڈالڈا دیکھ لینے سے ہی دادی جی کا گلا خراب ہو جاتا تھا، اس لئے چھت ٹھیک ہو یا نہ ہو انہوں نے خالص دیسی گھی ہی کھانا ہے۔ ٹی وی کی اتنی شوقین کہ بسم اللہ پر بیٹھ کر جھنڈے پر ہی اٹھتی تھیں۔ چاہے بیچ میں حالاتِ حاضرہ ہی لگ جائے مجال ہے جو اپنی جگہ سے اٹھیں۔

پورا ایک بڑا کمرہ کچن کے لئے مخصوص تھا، وہیں ٹی وی بھی دھرا تھا۔ اس ساتھ روٹیاں توے پر ڈالیں گی اور ساتھ سٹوڈیو ٹو کے دلچسپ مسائل خوب توجہ سے سنیں گی۔ پوچھو کہ پروگرام میں کیا دیکھا تھا تو خاک پتا نہیں۔ بس اتنا یاد ہے کہ منگائی کو برا کہنا ہے، خواہ ڈرامہ لگے یا کوئز پروگرام یہی کہتی اٹھیں گی۔

''دیکھا مہنگائی نے سب کے منہ کی رونق چھین لی ہے۔ یہ لڑکیاں تو سرخی پاؤڈر لگائے دیکھنے لائق نظر آنے لگتی ہیں لیکن بیچارے مرد آہ۔ ایک ہمارا وقت تھا، یہ تگڑے تگڑے جوان ہوتے تھے مکھن ملائی پر پلے ہوئے۔ آج کل کے لڑکے ہیں، نہ چوڑے کندھے نہ گھنی مونچھیں۔ چلنے میں بھی مجھ بڈھی کی طرح کمر جھکا جھکا کر۔''

''واہ دادو! آپ کے وقت کی لڑکیوں کی تو عیش ہوگی پھر؟''

''کیا مطلب؟'' دادی نے فرحین کی طرف مشکوک انداز میں دیکھا۔

''میرا مطلب ہے کہ گاؤں کی مٹیاریں کنویں پر پانی بھرنے بھی تو جاتی ہوں گی۔'' فرحین نے شرارت سے کہا۔

''اے ہاں جاتی کیوں نہیں تھیں، سب کام اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں۔ آج کل کی لڑکیوں کی طرح نخریلی تو نہیں تھیں کہ کتاب سے لگ کر بیٹھ گئیں اور ساری دنیا کا کام اپنے اوپر حرام کر لیا۔''

''اچھا دادی جی! آپ بھی تو جاتی ہوں گی کنویں پر پانی بھرنے؟'' زریں تخت پر ان کے قریب ہو کر بیٹھ گئی۔

''جاتی کیوں نہیں تھی، کیا نوکروں پر کام چھوڑ کر بیٹھ جاتی؟ یہی تو میری صحت کا راز تھا۔'' وہ اترائیں۔

''اس وقت دادا جی بھی تو بہت گبھرو جوان ہوں گے۔'' اس نے اپنی ہنسی دبائی۔

''ارے ہاں کوئی ایسے ویسے۔'' وہ ماضی میں کھو گئیں۔ ''لڑکیاں تو خیر ان پر مرتی ہی تھیں لیکن گاؤں کے لڑکے تک ان کی خوبصورتی پر رشک کرتے تھے۔ جب وہ سبز اور سرخ چارخانوں کا تہبند باندھے، سفید کرتا پہنے مونچھوں کو تاؤ دیتے گلیوں سے گزرتے تھے تو سب دیکھتے ہی رہ جاتے تھے۔ واہ کیا اونچا لمبا قد تھا ان کا اور کیا صحت تھی۔ یہ تو بعد میں بیٹے کے غم نے بالکل ہی گھلا ڈالا تھا ورنہ وہ ایسے کب تھے۔'' وہ دکھی ہو گئیں۔

''اچھا تو دادو آپ جیسی الہڑ مٹیار پر ان کا جی کیسے آیا؟'' فرحین نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ارے ہٹو بھی۔" ان کے پوپلے منہ پر مسکراہٹ پھیل گئی اور اس لمحے وہ آدھی صدی سے بھی زیادہ پیچھے چلی گئیں۔ ان کی یہ مسکراہٹ واقعی کسی الہڑ مٹیار کی طرح تھی۔

"پھر بھی دادو!" فرحین نے منت کی۔ اسے جب بھی دادی جی سے لاڈ کرنا ہوتا وہ انہیں دادو ہی کہتی تھی۔

"جلدی بتائیں ورنہ میں آپ کو گدگدی کروں گی۔" زرین نے دھمکی دی۔

"ہٹ پرے میں کوئی تیری ہم عمر ہوں۔"

"ویں کس کتاب میں لکھا ہے کہ گدگدانے کے لئے ہم عمر ہونا ضروری ہے۔ جلدی بتائیں ورنہ دونوں طرف سے حملہ ہو جائے گا۔"

"تم دونوں باز آنے والی نہیں ہو۔" اندر سے بتانے کا ان کا بھی دل چاہ رہا تھا، آخر کس سے اپنے دکھ سکھ بانٹتیں۔ "سنو پھر۔"

"سنائیں۔" دونوں ان کے پہلو سے جا لگیں۔

"ایک دن میں پانی بھرنے کنویں پر گئی، ساتھ کچھ سکھیاں بھی تھیں وہیں چوہدری صاحب نے دیکھا تھا۔"

"یعنی

وہ نگاہوں کا تصادم وہ لبوں کی کپکپی
اور وہ کانسی کی گاگر کا چھلکنا پے بہ پے"

فرحین ہنسی۔ "کیوں دادی جی ایسا ہی ہوا تھا ناں؟"

"لو بھلا تمہیں کیسے پتا چل گیا؟" انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

"دیکھ لیں ہم ولی ہیں۔"

"ولی کی بچی، بات سننے دو بار بار ٹانگ اڑاتی ہو۔" زرین نے اسے گھورا۔ "دادو بتائیں پھر کیا ہوا تھا؟"

"پھر انہوں نے مجھے دیکھا تو بس دیکھتے ہی رہ گئے۔" وہ شرمائیں۔ "مجھے سکھیوں نے ٹہوکا دیا تو میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ چوہدری صاحب ایک ٹک دیکھے جا رہے تھے، میرے تو سمجھو ہاتھ ہی کانپ گئے۔"

"اور گاگر چھلک گئی۔" فرحین نے فاتحانہ انداز سے انہیں دیکھا۔

"ہاں یہی ہوا تھا، پھر مجھے اپنی اوڑھنی کا خیال آیا تو جلدی سے میں نے منہ چھپا لیا۔

ہنسی تو بس پھوٹی پڑتی تھی۔"

"ویں اور ہمیں آپ ہنسنے سے منع کرتی ہیں۔" فرحین نے منہ بنایا۔

"تم بھی کمال کرتی ہو۔ اس وقت دادو کوئی چوہدری غلام محمد جنت مقام کی حویلی میں تو نہیں تھیں، کنویں پر تھیں۔" زرین نے مداخلت کی۔ "آپ سنائیں دادو۔"

"بس میں تو قلانچیں بھر کے اپنے گھر آ گئی۔"

"سچ دادی جی؟" زرین نے کہا۔

"تو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں۔" وہ بولیں۔ "اور جب میں اگلے دن پانی بھرنے کنویں پر گئی تو وہ پہلے ہی وہاں موجود تھے۔ میں نے کہا کہ آخر کھا تو نہیں جائیں گے، بس اوڑھنی سے منہ چھپائے پانی بھرنے لگی۔ سب سکھی سہیلیوں نے اتنا چھیڑا کہ کیا بتاؤں۔ اس کے بعد تو یہ روز کا معمول بن گیا۔"

"یہ کیا بات ہوئی دادی جی!" فرحین نے انہیں درمیان میں ہی ٹوک دیا۔ "کبھی ایسے ہوتے ہیں گبھرو جوان۔"

"اے تو پھر کیسے ہوتے ہیں؟"

"یوں کبھی کھڑے منہ دیکھا کرتے ہیں؟" وہ بولی۔ "بات تو جب تھی جب ایک اونچے سے گھوڑے پر تیزی سے آتے اور آپ کو اٹھا کر لے جاتے۔"

"اُف بے حیا!" دادی جی اس بات کے تصور سے ہی کانپ اٹھیں۔ "کوئی یونہی کے چوہدری نہیں تھے خاندانی تھے، شریفوں کی طرح رشتہ بھیجا تھا۔"

"تو پھر خاندانی چوہدری ہی ہوئے، گبھرو جوان تو نہ ہوئے ناں۔" اس نے تو دادی جی سے ٹاکرا لگانا ہی تھا۔

"کبھی دیکھا ہوتا اس وقت تو پوچھتی۔"

"اگر میں نے انہیں اور انہوں نے مجھے دیکھ لیا ہوتا تو آپ کا پتا کٹ چکا ہوتا۔"

"بے شرم اپنے دادے کے متعلق ایسے کہتی ہے۔"

"اب دیکھیں یہ حقیقت ہے تو اسے قبول کر لیں، کیا حرج ہے اس میں۔"

زریں، فرحین اور دادو کی اس نوک جھونک پر ہنسے جا رہی تھی۔

"یہ اونچے جوان تھے۔" دادی جی نے فرحین کی طرف سے توجہ ہٹائی۔ وہ تو بقول ان کے بولتی جا رہی تھی تو رکنے کا نام نہ لیتی تھی۔ اس لئے اس سے بحث فضول سمجھ کر دادی جی

پرانے موضوع کی طرف لوٹ گئیں۔

''اوردادی جی؟'' زریں نے شوق سے پوچھا۔

''مونچھوں کوتاؤ دیتے تھے توسب ڈر کے اِدھراُدھرہٹ جاتے تھے۔''

''ہوہوہو۔'' فرحین نے ناک سے آواز نکالی۔''بس دادو، دادا جی آپ کے سپرد ہمیں ایسی مونچھیں بالکل پسند نہیں۔''

''اٹھ بے شرم۔'' دادی جی نے چپل اٹھائی۔''بہت سن لی تیری بکواس۔''

''خواہ مخواہ ہی آپ نے چپل اٹھانے کی زحمت کی، پتا بھی ہے کہ آپ کا نشانہ کتنا کچا ہے؟''

فرحین کی بات سنی تھی کہ دادی جی نے اسے چپل کھینچ مارا۔ وہ بھی لگتا تھا کہ کسی چھلاوے کی اولاد ہے، خودتو سامنے سے ہٹ گئی اور چپل سیدھی گندھے ہوئے آٹے کی پرات میں جاکر سجدہ ریز ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دادی جی تسبیح گھماتی جاءنماز پر جابیٹھیں۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ پوتیوں سے ناراض ہوگئی ہیں۔

''زریں تم نے کبھی مرزا صاحباں کی داستان سنی ہے؟'' فرحین تو دادی کو ستانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھی۔

''ہاں سنی ہے۔''

''واہ کیا زبردست چیز تھا یہ مرزا بھی کیا گبھرو جوان تھا۔'' وہ شرارت سے ایک آنکھ دبا کر ہنسی۔''یونہی کنویں پر کھڑے کھڑے صاحبان کو تاکتا نہیں رہتا تھا۔ عین اس کی شادی کے دن صاحباں کوگھوڑے پر بٹھا کر لے اُڑا، ایسے ہوتے ہیں گبھرو جوان۔''

لیکن اس کی بات سن کر بھی دادی جی ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ لگتا ہے کہ ناراضگی شدید ہے۔

''اب کیا کیا جائے انہیں منانے کے لئے؟'' دونوں سر جوڑ کر بیٹھ گئیں۔

''نہ موقع دیکھتی ہو نہ محل، تم نے دادی جی کی بات میں اپنی ناک ضرور گھسیڑنی ہوتی ہے۔'' زریں نے اسے ملامت کی۔

''آخر میری دادو ہیں کوئی غیر تو نہیں۔'' اس نے منہ بنایا۔''ان کے ساتھ ایسا نہیں کروں گی تو کیا دیواروں سے کروں گی۔''

''اچھا اب تم ہی مناؤ انہیں تم نے ہی ناراض کیا ہے۔''

''لو یہ بھی کوئی مشکل ہے، دیکھنا تھوڑی دیر میں میرے آگے پیچھے پھر رہی ہوں گی۔''

فرحین کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

زریں اٹھ کر دوبارہ آٹا گوندھنے لگی اور فرحین تخت پر لیٹے لیٹے صورتِ حال کا جائزہ لینے لگی۔ تھوڑی دیر وہ چپکی پڑی رہی اور پھر ایسی دلدوز چیخ ماری کہ سات محلوں کو بیماری کی اطلاع مل جائے۔

''کیا ہوا فرو؟'' زریں چلائی۔

دادی جی جاءنماز چھوڑ چھاڑ کر بھاگی آئیں۔

''اے کیا ہوگیا میری بچی کو، ہائے اس کے پھول سے گال مرجھائے جارہے ہیں۔''

فرحین پیٹ کے درد سے کراہے جارہی تھی اور دادی جی کے ہاتھ پاؤں پھول چکے تھے۔

''ارے او زریں کھڑی میرا منہ کیا تک رہی ہے، بھاگ کر حکیم صاحب کو لے آ۔''

حکیم فخرالدین پر دادو کو بلا کا اعتماد تھا اور لڑکیوں کو ان سے ازلی بیر تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو حکیم صاحب کے بلاوے پر دونوں نے اودھم مچا دینا تھا لیکن اس وقت تو ان کے ہاتھ پاؤں پھولے جارہے تھے۔

''جی اچھا!'' اس نے دادی جی کی چپلوں میں پیر ٹھونسے۔ نیلے سوٹ کے اوپر کاسنی بد رنگ سا دوپٹہ اوڑھا اور باہر کی طرف دوڑی۔ گھر کے قریب واقع حکیم صاحب کا مطب بند پڑا تھا۔

''اب کیا کروں۔'' وہ ایک دم پریشان ہوگئی۔''ہاں یاد آیا زبیدہ خالہ نے بتایا تھا کہ ان کا ڈاکٹر بھانجا آج کل لاہور میں آیا ہوا ہے۔''

وہ زبیدہ خالہ کے گھر کی طرف بھاگی اور زور زور سے ان کا دروازہ دھڑ دھڑانے لگی۔

''کون ہے؟'' اندر سے خالہ کی آواز آئی۔

''خالہ! میں ہوں۔'' اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔

''خیر تو ہے۔'' انہوں نے دروازہ کھولا تو ان کی پہلی نظر زریں کے ہوائیاں اُڑاتے چہرے پر پڑی۔

''خالہ پتا نہیں فرحین کو کیا ہوگیا ہے اچانک، شاید پیٹ میں درد ہے۔'' وہ آنکھوں میں آنسو بھر کے بولی۔''قسم سے مچھلی کی طرح تڑپ رہی ہے۔''

''اوہو، ٹھہرو میں عمر کو بھیجتی ہوں۔'' عمر غالباً ان کا ڈاکٹر بھانجا تھا۔

وہ تیزی سے اندر کی جانب لپکیں، تھوڑی دیر میں عمر اپنا ڈاکٹری بیگ اٹھائے ان کے ہمراہ برآمد ہوا۔

"بیٹا اس کے ساتھ چلے جاؤ، اس کی بہن کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

وہ عمر کو لے کر گھر پہنچی، وہاں کا حال اس کی توقع کے عین مطابق تھا۔ فرحین کراہ کراہ کر نڈھال ہو چکی تھی اور دادی جی اس کے غم میں بے حال ہو چکی تھیں۔ دوسری طرف فرحین کی شرارت عروج پر تھی۔

"اب دیکھنا کیسے نخرے اٹھواتی ہوں۔" اس نے دل میں سوچا۔

آوازوں سے اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ حکیم فخر الدین تشریف لا چکے ہیں، اس لئے اس نے زیادہ زور و شور سے ایکٹنگ جاری رکھی۔ اتنے میں اسے محسوس ہوا کہ زریں اس پر جھکی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے وہ زریں ہی ہو سکتی تھی کیونکہ حکیم صاحب اپنی توند سنبھالتے کرسی پر دوسری جانب منہ کر کے بیٹھ جاتے تھے اور ایک لمبا سا دھاگا مریضہ کی کلائی سے لپیٹ کر مرض کا پتا چلاتے تھے۔ وہ اتنے پھونس تھے کہ انہیں ٹھیک سے دکھتا بھی نہیں تھا۔ فرحین نے سوچا کہ زریں کلائی پر دھاگا باندھنے کے لئے اس پر جھکی ہے۔ اس نے ہونٹوں پر مسکراہٹ لا کر اپنی دانست میں زریں کو آنکھ ماری۔ ادھ کھلی آنکھ سے جب اس نے ایک اجنبی کو خود پر جھکے پایا تو پٹ سے اس کی دوسری آنکھ بھی کھل گئی۔ یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ حکیم صاحب کی جگہ کوئی ڈاکٹر آیا ہے اور اس وقت زریں نہیں وہ ڈاکٹر اس پر جھکا ہوا ہے۔ دادی جی بے حال تھیں اور زریں آنکھیں موندے انتہائی خضوع و خشوع سے اللہ تعالیٰ کے حضور دعائیں مانگنے میں مصروف تھی۔

اس کی شرارت نے کافی گڑبڑ کر دی تھی، اس کا خیال تھا کہ وہ تھوڑی دیر دادی جی سے نخرے اٹھوانے کے بعد ہنس کر اٹھ کھڑی ہو گی، لیکن زریں خدا جانے کہاں سے اسے اٹھا لائی تھی۔ اسے آنکھ مارتے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے تو عمر حیران ہی رہ گیا۔ وہ کسی صورت یہ توقع نہیں کر سکتا تھا کہ اسے کوئی ایسی مریضہ بھی ٹکر سکتی ہے جو بغیر جانے بوجھے اسے آنکھ مار دے۔
پھر جب مریضہ کی دونوں آنکھیں پٹ سے کھلیں اور ان حیران حیران آنکھوں کو دیکھ کر اسے اندازہ ہوا کہ مریضہ نے کسی اور کی غلط فہمی میں یہ حرکت کی ہے۔ ابھی وہ ان دو حیران حیران آنکھوں کو دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ ایک بار پھر بند ہو گئیں لیکن یوں بھینچی، گویا آنکھیں نہ ہوں کوئی لکیر ہو۔

"یہ تو خاصی بیمار لگتی ہیں۔" اس نے سیدھا ہوتے ہوئے کہا۔

"ہیں کیا ہو گیا میری بچی کو۔" دادی جی کے پیروں تلے سے زمین نکل چکی تھی۔ "بیٹھے بیٹھے ہی پٹ سے گری اور یہ حال ہو گیا۔ میں کہتی ہوں تم سے نہ علاج ہو گا اس کا میری بچی کو نظر لگ گئی ہے۔ منع بھی کیا تھا کہ شام کو سرخ رنگ نہ پہنا کرو پریاں عاشق ہو جاتی ہیں۔ پر مجھے تو یہ دونوں بیوقوف سمجھتی ہیں۔"

"آپ بالکل فکر نہ کریں، ان پر کوئی پری نہیں جن عاشق ہو گیا ہے۔" عمر نے اطمینان سے کہا۔

"کیا جن؟" دادی جی کو غش آنے لگے۔

"کیا فضول باتیں کر رہے ہیں آپ، بھلا کبھی جن بھی عاشق ہوا کرتا ہے؟" زریں نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ "یہ پڑھا ہے آپ نے ایم بی بی ایس میں؟"

فرحین نے بے چارگی کے ساتھ ایک آنکھ کے کونے سے صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ اب دادی کو یہ سمجھانا ناممکن تھا کہ اس پر جن عاشق نہیں ہوا۔ اب وہ بالکل بے بس تھی کیونکہ حالات اس کے ہاتھ سے نکل چکے تھے، دادی جی بے حال تھیں۔ زریں غصے سے کھول رہی تھی اور یہ کم بخت ڈاکٹر تھا کہ مسکرائے جا رہا تھا۔ اس نے آنکھ بند کر لی، یہ تو الٹی آنتیں گلے پڑنے والا معاملہ ہو گیا تھا۔

"میں کہتی ہوں کہیں سے کوئی پیر فقیر لاؤ، بیٹھے بیٹھے اس کی ننھی سی جان کو کیا ہو گیا ہے۔ ہائے میں کیا جواب دوں گی ان کے جنت مقام دادا کو، جو بیٹا لوٹ آیا اور اس نے اپنی امانتیں مانگیں تو میں کیا کروں گی۔"

"دادی جی! ایک منٹ کو آپ تو چپ ہوں۔" زریں بھی بوکھلائی ہوئی تھی۔ "بیٹھے بٹھائے کیا الٹی پٹی پڑھا دی آپ نے انہیں اور اب شہد لگا کر مزے سے دیکھے جائیں تماشا۔"

"دادی جی اس جن کا علاج کسی پیر فقیر کے پاس نہیں ہے، دیکھیں میں کیا کرتا ہوں اس کے ساتھ، ایک منٹ میں اڑنچھو ہو جائے گا۔"

"ہائے بیٹا کچھ کر تیرا بڑا احسان ہو گا۔" انہوں نے منت کی۔

ڈاکٹر عمر نے اپنے بیگ سے انجکشن لگانے کا سامان نکالا۔ زریں حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اے بیٹا کیا سوئی لگاؤ گے میری پھول سی بچی کو؟" دادی جی دہشت زدہ انداز میں

بولیں۔

''سوئی۔'' فرحین کا دماغ ٹھکانے آ گیا۔ انجکشن سے تو وہ سو کوس دور بھاگتی تھی۔

''دادی جی مجبوری ہے، اس کے بغیر یہ جن نہیں اُترے گا۔'' وہ فرحین پر جھکا۔

اور فرحین جو پچھلے چند منٹوں سے بالکل دم سادھے پڑی تھی، ایک چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔

''چلا گیا جن۔'' وہ چلائی۔ ''دیکھیں بالکل بھلی چنگی ہو گئی ہوں میں، واہ کیا زبردست ڈاکٹر ہیں آپ۔ لگتا ہے، جن آپ سے ڈرتا ہے، سرنج نکالتے ہی غائب ہو گیا واہ واہ۔''

''میری بچی۔'' دادی جی نے اسے لپٹا لیا۔ ''ٹھیک ہے ناں؟ گھڑی بھر میں ہی دیکھو کیا حال ہو گیا ہے اس کا۔''

وہ چپ چپ اس کی بلائیں لے رہی تھیں اور زریں شعلے برساتی نگاہوں سے اسے تک رہی تھی۔

''ماشاء اللہ محترمہ سرنج نکلتے ہی ٹھیک ہو گئیں۔'' اس نے دانت پیسے۔ ''بہت ماٹھا جن تھا۔''

''جی نہیں اصل میں ہم ڈاکٹر ہی بہت اچھے ہیں۔'' عمر نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

دادی جی اس کی طرف مڑیں۔

''میرا بیٹا!'' انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''بیٹا تیرا بڑا احسان ہے مجھ پر۔''

عمر نے کن انکھیوں سے فرحین کی جانب دیکھا جو نچلا ہونٹ دبائے ہنسی روکنے کی کوشش میں مصروف تھی۔

''چل زریں چائے بنا حکیم صاحب کے لئے۔''

دادی جی کے ''حکیم صاحب'' کہنے پر دونوں پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ ''حکیم صاحب'' کہتے ساتھ ہی ان کا تصور بڑی سی توند نکالے، ناک کی پھننگ پر عینک جمائے پھونس سے حکیم فخر الدین کی طرف چلا جاتا تھا۔ دوسری طرف عمر تھا چھ فٹ کا خوبرو جوان، سیاہ جینز اور گرے قمیص میں ملبوس۔

''اے بیٹا حکیم ان پر ہنسنے کا بھی شاید جن آتا ہے۔ ہنستی ہیں تو دنیا کا ہوش ہی نہیں رہتا، بیٹا یہ جن بھی اتار لے۔''

''دادی جی ہنسی کا جن خوش حالی لاتا ہے اور مرادیں پوری کرتا ہے۔'' عمر نے اپنی ہنسی

دبا کے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''ٹھیک کہہ رہا ہے کیا؟'' انہوں نے بے اعتباری سے پوچھا۔

''بالکل ٹھیک آپ چاہیں تو آزما لیں۔''

''نہیں رہنے دو، ٹھیک ہی کہتے ہو گے۔ میں اَن پڑھ بھلا کب پہچان کر سکتی ہوں جنوں میں۔''

اور دادی جی کی یہ بات سن کر ان کی ہنسی کو لگنے والی بریکیں بالکل ہی فیل ہو گئیں۔ اب دادی جی بھی انہیں چپ نہیں کرا سکتی تھیں، اس لئے وہ بے فکری سے ہنس رہی تھیں۔

''اٹھ زریں اب کھی کھی نہ کرتی پھر، چائے بنا اور فرحین کے لئے ایک پراٹھا بھی ڈال دینا۔ کیا مرجھا گئی ہے میری بچی۔''

''پراٹھا تو اسے خوب کھلاؤں گی میں۔'' اس نے آنکھوں آنکھوں میں اسے کتنے ہی کوسنے دے ڈالے۔

دادی جی فرحین کا سر اپنی گود میں رکھ کر بیٹھ گئیں اور وہی کہانی دہرانے لگیں جو وہ ہر آئے گئے کو سناتے نہیں تھکتی تھیں۔

''یہ امانتیں ہیں میرے چوہدری غلام رسول کی۔ کب سے اس کی راہ تک رہی ہوں کہ آئے اور اپنی امانتیں لے جائے تاکہ میں چوہدری غلام محمد جنت مقام کے پاس چلی جاؤں۔ پوری حیاتی ہم کبھی الگ نہیں رہے تھے، لیکن مجھ نصیبوں جلی پر یہ وقت بھی آنا تھا کہ آج وہ میری راہ تکا کرتے ہوں گے کہ نذیراں بی بی اب بہت ہو گیا۔ بس آ جا لیکن میرے پاؤں کی یہ دو زنجیریں کہیں جانے دیتی ہیں بھلا۔

اب تو صبح شام بیٹے کی راہ تکتی ہوں، وہ خوش ہوگا کہ اس کی بچیاں محفوظ ہیں۔ سوچو آج جو کچھ ہو جاتا میری فرحین کو تو بیس سال کی ریاضت پل بھر میں خاک نہ ہو جاتی۔ کس نے یقین کرنا تھا کہ میں نے اپنی پوتیوں کو شہزادیوں کی طرح پالا ہے۔''

''جی بالکل۔'' عمر نے ہاں میں ہاں ملائی۔ ''لیکن دادی جی آپ کے بیٹے ہیں کہاں؟''

''ہائے بیٹے کچھ نہ پوچھ۔'' انہوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ ''کبھی ہمارے بھی مربعے کے مربعے تھے۔ چوہدری غلام محمد جنت مقام کی اپنے پنڈ کے علاوہ بھی بہت شہرت تھی۔ ایک تو خوبصورتی اور پھر پیسہ بھی اتنا کہ ریل پیل تھی۔ ہر طرف دھوم تھی کہ دودھ، مکھن اور گھی اگر کہیں دیکھا ہے تو چوہدری صاحب کی حویلی میں دیکھا ہے۔ میرا قدم گھر میں پڑا تھا کہ ترقی

کی اور راہیں بھی کھلیں، زمینیں سونا اگلنے لگیں۔ بہت سکھ کا وقت بھی دیکھا ہے میں نے حکومت کرتی تھی میں اپنی حویلی میں۔

پھر ہماری بہت سی اولاد ہوئی لیکن ایک ہی بیٹا زندہ بچا، وہ بھی ہو بہو باپ جیسا تھا۔ وہی رنگت، وہی ناک نقشہ، وہی چوڑی پیشانی۔ چوہدری صاحب کو اسے پڑھانے کا ایسا شوق تھا کہ پہلے پانچ جماعتیں پنڈ میں ہی پڑھائیں اور پھر شہر بھیج دیا اسے۔ پوری بارہ جماعتیں پڑھ کر آیا وہاں سے۔ پر شہر میں ایسا جی ٹکا کہ اپنی زمینوں سے ہی بیزار ہوگیا۔ میں نے چوہدری صاحب سے کہا کہ اس کی شادی کردیں اس کی بیوی آئے گی تو اس کی سیلانی طبیعت ٹھہر جائے گی۔ بس فٹافٹ لڑکی ڈھونڈی اور بیاہ کردیا۔''

''پھر تو بہت خوش ہوئے ہوں گے وہ؟'' عمر نے کہا۔

''کچھ دن تو بہت خوش رہا۔ پاؤں ہی زمین پر نہیں ٹکتے تھے اس کے لیکن پھر وہی بیزاری۔ کہتا تھا بیوی کو شہر لے جائے گا۔ بھلا پہلے یہ کبھی کسی نے کیا تھا کہ چوہدری صاحب اجازت دیتے۔ یہ جھگڑا بہت عرصے تک چلتا رہا۔ زمین تو محنت مانگتی ہے۔ جب تک اس پر خون پسینہ نہ گرایا جائے تب تک سونا نہیں اگلتی۔ چوہدری صاحب کا خیال تھا کہ بیٹا ان کا ہاتھ بٹائے گا لیکن وہ تو بالکل ہی منہ موڑے بیٹھا تھا۔ آخر کب تک چوہدری صاحب دیکھ بھال کرسکتے تھے۔

اس دوران سال بھر کے وقفے سے پہلے فرحین اور پھر زریں پیدا ہوئیں۔ پر بیٹیوں کو دیکھ کر بھی اس کا جی پنڈ میں نہیں لگتا تھا۔ وہ تو یوں بھی اُڑنے کے لئے پر تولے بیٹھا تھا۔ بارش تو بس بہانہ ہوگئی۔ ایسا مینہ برسا کہ ہر طرف سیلاب آگیا۔ سب فصلیں تباہ ہوگئیں۔ اب تو وہ باپ کے پیچھے پڑ گیا کہ بھلا زمینوں کا بھی کچھ اعتبار ہے، کبھی دیا تو کھالیا اور نہ دیا تو فاقے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ میری بہو کو سانپ نے ڈس لیا۔ پتا نہیں اوپر والے کی کیا حکمت تھی کہ کوئی دوا دارُو بھی اسے نہ بچا سکی۔ بس اتنی ہی زندگی لکھی تھی قسمت میں۔ کہتے ہیں سیلاب کے ساتھ ہی کہیں سے سانپ آگیا تھا، آگیا ہوگا پر میری بہو کا تو بلاوا آگیا ناں۔

چوہدری غلام رسول کو اپنی بیوی سے بہت محبت تھی۔ اب تو اس کا جی بالکل ہی اچاٹ ہوگیا تھا پنڈ سے۔ اب جو کوئی آپ کے ساتھ رہنا نہ چاہے تو بندہ اسے کیا سمجھائے۔ پھر مصیبت آتی ہے تو اکیلی نہیں آتی۔ ایک رات وہ چوہدری صاحب کے پاس آیا۔''

''مجھے کچھ پیسے چاہئیں ابا جی۔''

''کیا کرنا ہے پیسوں کا؟'' انہوں نے کبھی پیسے دیتے ہوئے وجہ دریافت نہیں کی تھی لیکن اب بیٹے کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ ہر حال میں پنڈ سے نکلنا چاہتا ہے، اس لئے انہوں نے وجہ پوچھی۔

''میں اب مزید یہاں نہیں رہ سکتا۔ ادھر ہے ہی کیا؟ سیلاب کے پانی میں بچ بچ کرتی زمینیں؟ ان سے میں نے کیا لینا ہے۔''

''تُو چاہتا کیا ہے آخر؟'' انہوں نے پوچھا۔

''میں یہاں نہیں رہنا چاہتا میں نے لاہور شہر جا کر کاروبار کرنا ہے۔ آپ کو کیا پتا کتنا منافع ہے کاروبار میں۔''

''بیٹا یہ زمینیں کم ہیں پیسے کے لئے۔ کس چیز کی کمی ہے یہاں۔ گھر کے مال مویشی، آٹا دالیں، دودھ دہی اور کیا چاہئے۔'' میں نے اسے سمجھایا۔

''اماں آپ نہیں سمجھتیں۔ شہر میں گاڑیاں ہوتی ہیں، بڑی بڑی کوٹھیاں ہوتی ہیں۔''

''یہ بڑی کوٹھی نہیں ہے۔'' میں نے حویلی کے کشادہ کمروں کی طرف اشارہ کیا۔ ''رہ گئیں گاڑیاں تو میں تمہارے باپ کو راضی کرلوں گی وہ تمہیں ٹریکٹر خرید دے گا۔''

''اماں، یہ آپ کے ٹریکٹر بھلا شہر کی گاڑیوں کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔'' وہ بیزار ہوگیا۔ ''میں آپ لوگوں کو اپنی بات سمجھا بھی نہیں سکتا۔ بس آپ مجھے پیسے دے دیں۔''

''تُو چلا جائے گا تو یہ اتنی بڑی زمینیں بھلا کون سنبھالے گا؟'' چوہدری صاحب نے بے چارگی سے کہا۔

''انہیں سنبھالنے کی کیا ضرورت ہے، پھینکیں انہیں یا بیچ ڈالیں مجھے ان زمینوں پر کام نہیں کرنا۔''

اس کی یہ بات سنی تھی کہ چوہدری صاحب آپے سے باہر ہوگئے۔ ''باپ دادا کی زمینیں تیرے شوق کے پیچھے بیچ ڈالیں۔ ایک پیسہ بھی نہیں ملے گا تجھے، اپنی زمینوں پر کام کرنا ہوگا کان کھول کر سن لے یہ سب۔''

اُس رات دونوں میں بہت جھگڑا ہوا۔ چوہدری غلام رسول بکتا جھکتا کمرے سے نکل گیا۔ اگلے چند دن خاموشی سے گزرے لیکن جب ایک دن صبح ہم لوگ اٹھے تو پتا چلا کہ وہ حویلی چھوڑ کر جا چکا ہے۔ تب ہمیں پتا چلا کہ چند دن کی اس خاموشی کا مطلب کیا تھا۔ ابھی یہی صدمہ کم نہیں تھا کہ معلوم ہوا کہ اس نے ایک اور زمیندار سے سارے مربعوں اور حویلی کا

یہ بات یاد رکھنا کہ فرحین کو بھی عمر بھائی اچھے لگتے ہیں۔ میں کسی صورت یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اب کوئی ایسا شخص آ کر ہم پر رعب جمائے یا حق جتانے لگے۔ آج تک جس کے لمس سے بھی محروم رہے ہیں جس کے پیار کو ترستے رہے ہیں۔''

دادی جی نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ پہلے رات گئے تک ٹی وی لگا رہتا تھا، آج وہ بھی دیکھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا اس لئے بند پڑا تھا۔ صبح ناشتے پر انہوں نے پوتیوں کے سامنے اس رشتے کی منظوری کا اعلان کر دیا۔ فرحین اور زریں کی تو خوشی کے مارے بُری حالت تھی۔ دادی جی فرحین کے جگمگاتے چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ خوش تھیں کیونکہ ان کی پوتیاں خوش تھیں اور اب تو وہ زندہ ہی اس لئے تھیں کہ ان کی خوشیاں دیکھیں۔ ان کے روشن جگمگاتے چہرے دیکھیں، پھر بھی پتا نہیں کہ اس خوشی کے پردے میں غم کیسا تھا جو انہیں کاٹے ڈال رہا تھا۔ بیٹا بری طرح یاد آ رہا تھا، وہ ہوتا تو یہ فرض وہی ادا کرتا۔ ان کی بوڑھی ہڈیوں میں اب ان کاموں کے لئے جان کہاں تھی لیکن انہیں اپنی زندگی کا بھروسا بھی نہیں تھا۔ جن پوتیوں کو شہزادیوں کی طرح پالا تھا انہیں ایسے کیسے بے یارومددگار چھوڑ جائیں۔ یہ کسے معلوم تھا کہ کب ان کا بلاوا آ جائے۔

سرخ زرتار دوپٹہ اوڑھے فرحین اس دن بہت اچھی لگ رہی تھی۔ یوں بھی کھلتی ہوئی رنگت تھی، بڑی بڑی معصوم آنکھیں اور لانبے لانبے سنہری بال۔ آخر کو چوہدری غلام محمد جنت مقام کی پوتی اور چوہدری غلام رسول کی بیٹی تھی۔ یہ رنگ روپ تو آنا ہی تھا۔ پھر سونے کی ایک نازک اور خوبصورت سی انگوٹھی نے اسے عمر کے ساتھ باندھ دیا، اس بندھن پر سبھی خوش تھے۔ خوب مٹھائیاں بٹیں، زریں نے گانے گائے اور خوب اچھل کود کی۔

''بس اب پردہ ہو گیا تمہارا عمر سے۔'' دادی نے رات کو سونے سے پہلے کہا۔

''کیوں دادو؟'' زریں نے اس کا دفاع کیا۔ ''بھلا پردہ کیا معنی؟ آج کل ایسے کب ہوتا ہے؟''

''کیا آج کل نرالی لڑکیاں پیدا ہونے لگی ہیں۔'' انہوں نے اسے گھورا۔ ''لڑکے لڑکی میں پردہ نہ ہو تو لڑکے کا دل بھر جاتا ہے۔ دوسری تیسری کی تلاش شروع کر دیتا ہے مرد۔ اور وہ بے چارہ بھی کیوں نہ کرے لڑکی کا رنگ روپ جو کھو جاتا ہے بار بار دیکھنے سے۔''

''دادی جی آپ کی فلاسفی دنیا سے الگ ہے، دیکھنے اور بات کرنے میں کیا ہے بھلا۔''

زریں اب بھی اس کے غم میں دبلی ہوئی چلی جا رہی تھی۔

''چپ کر، خبردار جو اب بات منہ سے نکالی۔ اسی لئے میں تم لوگوں کے کالج پڑھنے کی مخالف تھی۔ وہ تو چوہدری غلام محمد جنت مقام نے مجھ سے وعدہ لیا تھا اس لئے چپ تھی۔''

''پر دادو۔''

''چپ!'' انہوں نے زریں کو آنکھیں دکھائیں۔

''زریں! اس میں لڑنے کی کیا بات ہے۔'' فرحین نے شرارت سے کہا۔ ''اب بھلا دادو کو کیا پتا کہ میرے کمرے کی کھڑکی سے زبیدہ خالہ کا گھر صاف دکھائی دیتا ہے۔ وہیں سے ہاتھ ہلا کر بلا لیا کروں گی اور پھر مل کر گپیں ماریں گے۔''

''کیا؟'' دادی جی بے ہوش ہوتے ہوتے بچیں۔ ''اب جو اس کمرے کی طرف گئی تو ٹانگیں توڑ کر ہاتھوں میں پکڑا دوں گی۔ ٹھہر جا کل ہی مستری بلا کر میخیں ٹھکواتی ہوں۔'' ان کی بات پر زریں اور فرحین ہنس ہنس کر بے حال ہو گئیں۔

''اب پھر چڑھ گیا ہنسی کا جن۔'' وہ بڑبڑائیں۔

''دادی جی! اس کے کمرے میں تو کھڑکی ہی نہیں ہے۔'' زریں نے اپنے دانتوں کی نمائش کی۔

''اے میری عقل۔'' انہوں نے سر پہ ہاتھ مارا۔ ''ایک تو تم دونوں کو مخول کی بڑی عادت ہے۔''

''دادو جاءنماز لا دوں؟'' زریں نے شرارت سے کہا۔

''ہٹو بھی، میں کوئی ناراض تھوڑی ہوں۔''

دن یونہی خوبصورتی سے گزر رہے تھے۔ دادو جہیز کے کپڑے لتے جمع کرنے میں مصروف تھیں۔ ان کی صبح اسی فکر کے ساتھ ہوتی تھی، ایسے ہی ایک دن زریں ناشتے کے برتن دھونے میں مصروف تھی اور فرحین گھر کی صفائی کر رہی تھی کہ باہر کا دروازہ بجا۔

''کون ہے؟''

''جی میں ہوں شیدا، آپ کے لئے سیٹھ جی آر چوہدری کا پیغام لایا ہوں۔''

''جی آر چوہدری۔'' دل ہی دل میں یہ بات یاد کرتے ہوئے کہ جی آر چوہدری کون ہے، فرحین نے دروازہ کھولا۔

''ہم کسی جی آر چوہدری کو نہیں جانتے۔'' اس نے سر سے پیر تک اجنبی کا جائزہ لیا جو خاکی بدرنگ پتلون اور پیلی نما سفید قمیص میں ملبوس یتیم سی شکل بنائے کھڑا تھا۔

لیکن تب تو وہ بھی دنگ رہ گئی جب وہ بولا۔

''جوان جہان لڑکے کو آنکھ مارنا بہت بری بات ہے۔''

''کیا؟'' زریں اچھل پڑی۔

''قسم سے زریں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ تم کھڑی ہو کلائی میں دھاگا باندھنے کو دور کر کے حکیم فخرالدین بیٹھے ہوئے ہیں۔ اب میں کیا کروں کہ سب کچھ الٹا ہوگیا۔ میرے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے جو کرتی ہوں ہمیشہ اس کے الٹ ہو جاتا ہے۔ میں نے تو تمہیں یہ کہنے کے لئے آنکھ ماری تھی کہ باقی معاملہ سنبھال لو لیکن اصل قصور تم دونوں کا ہے۔ دونوں ہی غلط جگہ کھڑے تھے تو میں کیا کر سکتی تھی؟ بھلا بند آنکھوں سے مجھے دِکھتا ہے؟''

''اب تمہاری اس بات پر کون یقین کرے گا؟'' عمر نے سنجیدگی سے کہا۔ ''سوچو اگر دادی جی کو پتا چل جائے تو وہ بے ہوش نہ ہو جائیں۔''

''خدا کے واسطے انہیں کچھ نہ بتانا۔'' وہ منت پر اتر آئی۔

''اچھا سوچیں گے بتائیں یا نہ بتائیں۔'' وہ بے نیازی سے بولا۔ ''ویسے زریں اس واقعے سے مجھے وہ نجومی یاد آ گیا ہے۔''

''کون سا؟''

''ایک نجومی نے پیش گوئی کی تھی کہ میری زندگی کی ہمسفر آنکھ مار کر میرا استقبال کرے گی۔''

فرحین نے اس کی بات سنی اور تخت سے چھلانگ لگا کر اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔

''قسم سے عمر بھائی؟'' زریں نے پوچھا۔

''سو فیصد۔'' وہ بولا۔ ''اور میں ذرا جلد باز واقع ہوا ہوں۔ ہر لحاظ سے اکلوتا ہوں یعنی ماں باپ، بہن بھائی کوئی نہیں ہیں۔ بس یہی ایک زبیدہ خالہ ہیں، یہاں سروسز ہسپتال میں ڈاکٹر ہوں۔ زبیدہ خالہ جلد از جلد میری شادی کرنا چاہتی ہیں اور میں ان سے بھی زیادہ جلدی میں ہوں۔ اب تم چونکہ میری بہت اچھی بہن ہو اس لئے جلدی سے جا کر فرحین سے پوچھو کہ میں خالہ زبیدہ کو کب بھیجوں؟''

''ایک منٹ میں ابھی آئی۔'' زریں اندر کمرے کی طرف بھاگی۔ اسے بالکل یہ امید نہیں تھی کہ عمر ایک ہی ملاقات میں یہ بات کہہ سکتا ہے۔

''لو اب گبھرو جوان جب سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا تو تم نے صاحباں والی بہادری

نہیں دکھائی۔'' زریں اس کے کمرے میں پہنچی۔ ''اب بتاؤ زبیدہ خالہ کب آئیں؟''

''وہ تو روز ہی پہنچی ہوتی ہیں اپنی مرضی کی مالک ہیں۔ بھلا میرے کہنے سے آئیں گی۔'' فرحین نے یوں پوز کیا جیسے اسے کچھ پرواہ ہی نہیں۔

''تو پھر کہہ دوں کہ نہ آئیں؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

''اب دفع ہو۔'' اس نے میز پر پڑی کتاب اسے کھینچ ماری۔

اور پھر اگلے ہی دن زبیدہ خالہ آموجود ہوئیں۔ دادی جی نے مدعا سننے کے بعد ان کی خوب آؤ بھگت کی۔ عمر انہیں بھی پسند آیا تھا، کل انہوں نے یہی تبصرہ کیا تھا۔

''کتنے زمانے بعد کوئی گبھرو جوان دیکھا ہے، آج کل کے لڑکوں کی طرح صحت کی طرف سے کورا نہیں ہے۔ دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ کسی پنڈ کا چوہدری آ رہا ہوا سے دیکھ کر تمہارے جنت مقام دادا کا خیال آ رہا ہے۔''

''ہاں ویسا ہی ہے بس مونچھوں سے مار کھا گیا ہے۔'' فرحین نے شرارت سے کہا تو دادی جی اسے گھور کر رہ گئیں۔

اور اب جب فرحین کے لئے اس کا رشتہ آیا تھا تو بھلا دادی جی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ انہوں نے زبیدہ خالہ کو سوچ کر جواب دینے کو کہا۔ بس ایک پھانس تھی ان کے من میں۔

''اب بتاؤ میں فیصلہ کرنے والی کون۔'' رات کو دادی جی نے کہا۔ ''تم دونوں کا باپ حیات ہے وہی کوئی فیصلہ کر سکتا ہے ناں۔''

''ساری زندگی انہوں نے ہمیں پوچھا نہیں۔ اب اگر یہ فیصلہ وہ کرنا بھی چاہیں تو ہم انہیں نہیں کرنے دیں گے۔'' زریں بولی۔ ''اور پہلے یہ تو پتا چلے کہ اگر وہ ہیں تو کہاں ہیں؟ زندگی میں ہم سے کبھی ملیں گے بھی یا نہیں؟''

''اللہ سے امید رکھو۔'' انہوں نے اپنے آنسو پیئے۔

''دادو، اس امید کے سہارے آپ اسے گھر تو بٹھائے نہیں رکھ سکتیں ناں۔ جواب تک نہیں ملے تو کوئی کیا کہہ سکتا ہے کہ بعد میں بھی کبھی ہمیں ان کی شکل دیکھنی نصیب ہوگی یا نہیں۔''

دادی جی تڑپ اٹھیں لیکن کیا کہتیں۔ یہ خدشہ تو ان کے ذہن میں بھی تھا لیکن زبان پر لانا نہیں چاہتی تھیں۔ ایک آس تھی، امید کی ایک ڈور تھی جسے وہ توڑنا نہیں چاہتی تھیں۔

''چند دن انتظار کر لیں؟'' انہوں نے انتہائی بے چارگی سے پوتی سے پوچھا۔

''جہاں آپ نے انتظار کے اتنے برس کاٹ لئے ہیں، وہاں چند دن اور سہی لیکن دادو

سودا کرلیا تھا۔ سب کاغذ بھی غائب تھے۔ پھر بھی بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے لیکن کچھ نہ ہوسکا، بیٹا بھی ہاتھ سے گیا اور ساری جائیداد بھی۔

چوہدری صاحب یہاں لاہور شہر چلے آئے کہ شاید بیٹے کا کچھ سراغ ملے لیکن کہاں؟ کچھ بھی اس کا پتا نہ چلا۔ جو تھوڑی بہت رقم تھی اس سے یہاں کرشن نگر میں چار دکانیں لے ڈالیں تو کچھ گزر بسر کا سامان ہوا۔ چوہدری صاحب بیٹے کی راہ تکتے تکتے اللہ کو پیارے ہوگئے۔'' اب دادی جی کی آنکھوں سے باقاعدہ آنسو رواں ہو چکے تھے۔

''دادو!'' فرحین نے پیار سے ان کے ہاتھ پکڑے۔ ''ہم نہیں ہیں آپ کے ساتھ جو آپ روتی ہیں۔ آپ بالکل بے فکر رہیں ہم کبھی آپ سے جدا نہیں ہوں گے۔''

''تم دونوں کو دیکھ کر ہی تو جیتی ہوں میں۔'' انہوں نے اُسے پیار کیا۔ ''پر بیٹیاں بھی تو پرایا دھن ہوتی ہیں۔ تم لوگوں کے ہاتھ نہیں پیلے کرنے کیا؟''

فرحین کی پلکیں خود بخود اٹھ گئیں۔ عمر مسکرا کر اسے ہی دیکھ رہا تھا، اس نے فوراً نگاہیں چرالیں۔

''دادی جی بیٹے ساتھ چھوڑ دیتے ہوں گے لیکن بیٹیاں ساتھ نہیں چھوڑتیں۔''

''اے جیتی رہ۔'' انہوں نے اس کی بلائیں لیں۔ ''بس اب ایک ہی فرض رہ گیا ہے چاہتی ہوں وہ بھی نمٹ جائے۔''

''آپ بالکل فکر ہی نہ کریں دادی جی۔'' عمر نے فرحین کی طرف دیکھا۔ ''اب ایک ایسا جن عاشق ہوگیا ہے جو کبھی نہیں اُترے گا۔'' آخری بات اس نے دھیمے سے کہی تھی جو فرحین نے تو سن لی لیکن دادی جی کو سنائی نہیں دی۔ وہ ان کی گود میں منہ رکھ کر ہنسنے لگی۔

''یہ لیں حکیم صاحب!'' زریں نے چائے کی پیالی عمر کو پکڑائی، ساتھ اور بھی بہت کچھ الا بلا تھا۔ دادی جی دنیا جہاں کو بھول کر فرحین کو مختلف چیزیں ٹھنسوانے میں منہمک تھیں۔

''لگتا تو نہیں ہے کہ آپ اتنا زیادہ کھالیتی ہیں۔'' عمر نے براہِ راست اس سے کہا۔

''میں تو بہتیرا کھلاتی ہوں لیکن اسے لگتا بالکل نہیں ہے۔'' اس کے بجائے دادی جی بولیں۔ ''اصل میں بچپن میں ایک مرتبہ اسے زریں نے جھاڑو ماردی تھی۔''

''جھاڑو ماردی تھی؟'' عمر کچھ نہ سمجھا۔

''اب بس بھی کریں دادو!'' فرحین شرمندگی سے بولی، اسے زریں پر غصہ آرہا تھا جو مسلسل ہنسے جارہی تھی۔

''جی میں نے اسے جھاڑو ماری تھی تب سے اب تک بالکل ہی تنک منک ہے۔'' وہ ہنسی۔ ''اصل میں اگر کسی کو جھاڑو ماردی جائے تو وہ تنکوں کی طرح دبلا ہو جاتا ہے، بس تب سے یہ ایسی ہے۔''

عمر نے اپنی ہنسی دبائی۔ دادی جی تائید میں سر ہلا رہی تھیں۔

''اے نماز کا وقت ہوگیا ہے اور میں ادھر مزے سے بیٹھی ہوئی ہوں۔'' وہ اٹھیں۔

''بہت بری بات ہے۔'' اُن کے جانے کے بعد عمر نے فرحین سے کہا۔

''کیا بری بات ہے؟'' وہ بے پروائی سے بولی۔

''اب پوچھتی ہو کیا بری بات ہے۔'' زریں پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گئی۔ ''دہلا کر رکھ دیا تھا تم نے کتنی منتیں مان لی تھیں میں نے، مجھے کیا پتا تھا کہ صاحبزادی کو مذاق سوجھ رہا ہے حد ہوتی ہے کسی بات کی۔ دادو کو منانے کے اور طریقے نہیں تھے کیا؟''

''باقی طریقے تمہیں آتے ہیں۔'' اس نے بے نیازی سے کہا۔ ''اور میں نے انہیں منانا نہیں تھا بس تھوڑے سے ناز اٹھوانے تھے۔ ہر طرف تمہاری ہی خاطریں ہوتی ہیں کیونکہ ڈونگے کا چمچ تمہیں پڑا تھا بھوکی ندیدی۔''

''چپ کرو میں بھوکی ندیدی نہیں ہوں۔'' اس نے منہ بنایا۔ ''اب دیکھنا کیسی گت بنواتی ہوں دادو سے۔''

''وہ کبھی نہیں مانیں گی کہ مجھ پر جن نہیں تھا۔''

''یہ کون کہے گا اُن سے؟ میں تو اور طریقے سے ٹھیک کرواؤں گی تمہیں۔ بھلا ناز نخرے اٹھوانے تھے تو اٹھواتیں دادو سے۔ ان سے کرواتیں اپنی خدمتیں یہ کیا کہ مجھے چولہے میں جھونک دیا۔ اب گن گن کے ان چیزوں کے بدلے لوں گی جو ابھی تم نے ٹھونسی ہیں۔''

''بس یہ تھی بری بات تو ہوا کرے۔'' فرحین نے کہا۔

''جی نہیں بری بات کچھ اور تھی۔'' عمر بولا۔

فرحین کے لال پڑتے گال دیکھ کر زریں کو دال میں کچھ کیا بہت کچھ کالا نظر آیا۔

''کیا تھی بری بات عمر بھائی مجھے بھی بتائیں۔''

''ان سے پوچھ لیں۔'' اس نے بے نیازی سے کہا۔

''مجھے نہیں پتا آپ کیا کہہ رہے ہیں۔'' فرحین تیزی سے بولی۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے اور اگر ہے تو خود بتا دیں۔'' وہ جانتی تھی کہ عمر زریں کے سامنے ایسی بات نہیں کرسکے گا

"جی یہ چوہدری غلام محمد سیٹھ کا گھر نہیں ہے؟" اس نے مایوسی سے کہا۔

"جی تقریباً انہی کا ہے۔" سیٹھ کے لفظ نے اسے اچنبھے میں مبتلا کر دیا تھا۔ دوسری طرف سے شیدا تقریباً کے لفظ پر گڑبڑا گیا تھا۔

"جی پورا ان کا نہیں ہے؟"

"اصل میں یہ گھر چوہدری غلام محمد کا ہے کسی سیٹھ کا نہیں ہے۔"

"لگتا تو ایسا ہی تھا مجھے۔" اس نے در و دیوار کا جائزہ لیا۔ "لیکن سیٹھ صاحب کے والد صاحب تو خود بخود سیٹھ ہو گئے ناں۔"

"کیا بات کر رہے ہو تم؟ اس وقت سے نہ جانے کیا اول فول۔" وہ آگے بات کرتے کرتے رہ گئی۔ آخر وہ ان کے دروازے پر کھڑا تھا۔

"آپ کو نہیں معلوم سیٹھ جی آر چوہدری ان کے اکلوتے صاحبزادے ہیں۔"

"ابا جی؟" فرحین حیرت سے چیخی۔

"یہ جی ان کا پیغام ہے۔" اس نے ایک لفافہ اس کی جانب بڑھایا۔ "میں جاؤں جی؟"

"اس میں ان کا پتا ہے؟" اس نے بے صبری سے لفافہ چاک کیا۔

"کیا خبر مجھے تو یہ لفافہ دینے کو کہا تھا، ویسے مجھے ان کا پتا معلوم ہے۔"

"آپ اندر آ جائیں۔" وہ اسے برآمدے میں لے آئی۔

"کیا ہوا؟ یہ کون ہے؟ اور فق تمہارا چہرہ۔" زریں اس کے جذبات کی شدت سے سرخ پڑتے چہرے اور آنکھوں میں آنے والے موٹے موٹے آنسو دیکھ کر گھبرا گئی۔

"زریں ابا جی۔" وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

"ابا جی؟ کہاں؟" اس نے ارد گرد دیکھا۔ "تم پاگل تو نہیں ہو گئیں؟"

"ابا جی کا خط ہے یہ۔" اس نے اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

"کہاں سے آیا ہے؟"

"وہ، وہ لایا ہے۔ اسے اندر بٹھایا ہے میں نے۔" گھبراہٹ اور خوشی کے مارے فرحین سے بات کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

دونوں تخت پر بیٹھ گئیں۔ دادی جی اس وقت سٹور روم میں فرحین کے لئے جمع کی ہوئی چیزوں کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔

"ذرا نکال کر پڑھنا، میں تو اس وقت یہ پڑھنے کے قابل نہیں ہوں۔" فرحین نے خط

زریں کو تھمایا۔

زریں نے لفافے سے خط نکالا۔ اندر سے خط کے علاوہ چار ہوائی ٹکٹ بھی نکلے۔ اس نے بے تابی سے پڑھنا شروع کیا۔

"پیارے ابا جان!

آداب! نہ جانے آپ کو اپنا بیٹا یاد بھی ہوگا یا نہیں۔ اس وقت آپ کو خط لکھتے ہوئے اس قدر جذباتی ہو رہا ہوں کہ بیان سے باہر ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرف سے بات شروع کروں۔ آپ سے جدا ہو کر میں نے بہت سے کرب سہے ہیں۔ پیسے کی طرف سے مجھے کبھی تنگی نہیں ہوئی لیکن یہ احساس کہ میں نے آپ سب کی پروا کئے بغیر زمین اور حویلی تک بیچ کھائی مجھے مارے ڈالتا ہے۔ یہ یقیناً ایک ناقابلِ معافی اور ناقابلِ تلافی جرم تھا۔ میں آپ کو اور اماں کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہا تھا اس لئے چپکا بیٹھا رہا۔ کبھی آپ کی اور اماں کی یاد آتی تھی تو چپکے سے رو لیا کرتا تھا اور خدا تعالیٰ کے حضور اپنے گناہوں کی معافی مانگا کرتا تھا۔

اب کچھ عرصہ سے نہ جانے کیا حال ہو گیا تھا، اولاد کو دیکھنے کے لئے آنکھیں ترس رہی تھیں۔ بہت تلاش کروایا آپ لوگوں کو، پچھلے چھ سال سے میرے بندے آپ لوگوں کو ڈھونڈ رہے تھے لیکن تب تک اللہ تعالیٰ کی رضا نہیں تھی۔ اب بہت مشکلوں سے پتا چلا ہے کہ آپ لوگ کرشن نگر میں مقیم ہیں۔ اللہ کرے میرا یہ خط آپ لوگوں تک پہنچ جائے۔

اس وقت اللہ تعالیٰ کے فضل اور آپ کی دعاؤں سے میرا کراچی میں بہت بڑا بزنس ہے۔ کلفٹن میں ایک شاندار کوٹھی ہے، اگر اپنے اس بیٹے کو معاف کر سکیں تو یہاں چلے آئیں۔ چار ہوائی ٹکٹ بھجوا رہا ہوں، شاید آپ کی خدمت کر کے آپ کا یہ گناہ گار بیٹا آخرت میں اپنا کوئی مقام بنا لے اور اللہ تعالیٰ کے حضور سرخرو ہو سکے۔

مجھے خود معلوم نہیں کہ میں نے کیا لکھا ہے۔ خط یقیناً بے ربط ہوگا لیکن اسے میری جذباتیت سمجھ کر نظر انداز کر دیں۔ میری آنکھوں کی ٹھنڈک میری بیٹیاں مجھ سے بہت ناراض ہوں گی لیکن ایک مرتبہ وہ میرے پاس آ جائیں، پھر سب ناراضگیاں دور کر دوں گا۔ انہیں دیکھنے کو ترس رہا ہوں۔ کیا فرحین اب تک اسی طرح سرخ و سپید روئی کے گولے کی طرح ہے؟ زریں کتنا ہمک ہمک کر میرے پاس آتی تھی۔ میری

''جی میں نے انعام کے لئے تو کچھ نہیں کیا، آپ اپنے والد صاحب سے مل جائیں یہی میرا انعام ہے۔''

''تمہاری یہ باتیں ہمیں بہت اچھی لگی ہیں۔'' زریں بولی۔ ''ہم اپنے ابا جی سے کہہ کر تمہارے بھائی کی تعلیم کا بندوبست کرائیں گے سب خرچہ ہمارے ذمے۔ تمہاری دونوں بہنوں کا جہیز تیار کرائیں گے، تمہارے ابا جی کا علاج کروائیں گے۔''

''اور تمہاری تنخواہ بھی بڑھائیں گے۔'' فرحین نے کہا۔

''اللہ آپ کا بھلا کرے آپ کو سدا خوش رکھے۔'' وہ ممنونیت سے بولا۔

سفر لمبا تھا اور تمام سفر کے دوران شیدا دوڑ دوڑ کر ان کے کام کرتا رہا۔ وہ دونوں مسلسل آپس میں باتوں میں مصروف تھیں۔

''سنو فرحین ہم وہاں خوب سیر کریں گے۔'' زریں کتنی ہی مرتبہ فرحین سے یہ بات کہہ چکی تھی۔ ''میں تو آج تک لاہور سے باہر گئی ہی نہیں اور سمندر دیکھنے کا مجھے اتنا شوق ہے کہ بس کیا بتاؤں۔''

''ہم وہاں سیپیاں اکٹھی کریں گے۔''

''ہاں اور خوب شاپنگ بھی کریں گے، تمہارے جہیز کی شاپنگ۔'' زریں چہکی اور دونوں ہنس پڑیں۔

پتا نہیں کیا بات تھی کہ دونوں بات بے بات ہنس رہی تھیں۔ شاید خوشی کا اظہار یونہی بے معنی باتوں پر ہنس کر کیا جاتا ہے۔

''اچھا یہ بتاؤ کیا پھر بارات کراچی آئے گی؟''

''یہ میں نے سوچنا ہے کیا؟'' فرحین ہنسی۔ ''جیسے دادی جی اور ابا جی کہیں گے ویسا ہی ہوگا۔''

''دیکھو دادو اپنی جوانی کے قصے سنا رہی ہیں۔'' زریں نے اسے ڈبے کے پچھلے حصے کی طرف متوجہ کیا جہاں بہت سی بوڑھیاں اپنے پھیلے منہ پر شرمیلی مسکراہٹیں سجائے بیٹھی تھیں۔ دونوں ہی انہیں دیکھ کر ہنس پڑیں۔

''پہلے میں ابا جی کے گلے لگوں گی۔'' فرحین نے کہا۔

''نہیں میں۔''

''جی میں۔ میں نے پہلے کہا تھا اور پھر میں بڑی بھی ہوں۔''

''اب اس میں میرا کیا قصور کہ میں تم سے چھوٹی ہوں۔ ویسے چھوٹے زیادہ لاڈلے ہوتے ہیں، اس لئے ابا جی خود ہی پہلے میری طرف آئیں گے۔''

''جی نہیں میری طرف آئیں گے۔''

''اچھا جی یہ لیں سکہ اور ٹاس کر لیں۔'' شیدے نے مداخلت کی اور جیب میں سکے کی تلاش میں ہاتھ ڈالا۔ اور پھر ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ چیخیں، سسکیاں آہیں، گوشت اور خون کے لوتھڑے چار سو پھیل گئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ قیامت کے دن اپنے پرائے کی پہچان نہ ہوگی تو پھر قیامت کیا ہے؟ جو اس ڈبے میں تھے اس دن ان سب پر قیامت ٹوٹی تھی۔ ہر طرف افراتفری تھی، اپنے اور غیر کی پہچان نہ تھی۔ جس کا جہاں منہ اٹھا وہ بھاگ کھڑا ہوا، مزید دھماکے ہونے کے خوف سے ہر کوئی جائے حادثہ سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ ایسے میں پتا چلتا ہے کہ سب سے قیمتی خود اپنی جان ہوتی ہے۔

☆======☆======☆

امدادی سامان پہنچ چکا تھا، کراچی سے بہت سے ڈاکٹر اور ایمبولینسیں منگوائی گئی تھیں۔ امدادی کارروائیاں تیزی سے جاری تھیں ہر کوئی اپنے کام میں منہمک تھا۔ ایسے میں کہیں سے خاک اور دھول میں اٹی خون میں نہائی ایک بڑھیا اکٹھی کی ہوئی لاشیں دیکھ رہی تھی۔ وہ لاشیں بھی کہاں تھیں، اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے اعضاء ایک جگہ جمع کر دیئے گئے تھے۔

''یہ میری فرو، دیکھو دیکھو اس کے ہاتھ میں انگوٹھی۔ ابھی تو اس کی منگنی ہوئی تھی بالکل یہی انگوٹھی پہنائی تھی اسے۔'' اس نے اعضاء کے انبار سے ایک کٹا ہوا ہاتھ اٹھا لیا۔ ''اور یہ دیکھو یہ زریں ہے میری، دیکھو اس کی کانچ کی چوڑیاں ابھی تک ویسی کی ویسی ہیں۔ انہیں اٹھاؤ، ان سے کہو کہ دادو پراٹھا پکا کر دے گی۔ ہمیشہ تو دادو ناراض ہوتی تھی آج یہ کیوں ناراض ہو گئیں۔''

اس نے دو کٹے ہوئے خون میں لتھڑے ہوئے بازو سینے سے لگا رکھے تھے۔

''واقعی جس دھماکے میں انسانوں کے چیتھڑے اُڑ گئے، وہاں کانچ کی چوڑیاں محفوظ ہیں۔ معجزہ اسے کہتے ہیں صاحب۔'' ایک باریش ادھیڑ عمر شخص نے کہا۔ ''خدا تعالیٰ کا پیغام ہے اس میں۔''

''کتنی چوڑیاں بچی ہیں ذرا گن لینے دو۔'' ایک رپورٹر اچک کر سامنے آیا۔

''ہاں ہاں ضرور، اللہ تعالیٰ کا پیغام سب تک پہنچنا چاہیے۔'' باریش شخص نے کہا۔

''آپ لوگ ذرا دور ہٹیں۔'' ایک سیکورٹی والے نے انہیں پیچھے دھکیلا۔

ساتھ۔''

''چل بے حیا کچھ تو اپنے دادے کا لحاظ کیا کر، میری تو تجھے ویسے ہی پروا نہیں۔'' وہ ہنسیں۔

''دادو پرسوں چلنا ہوگا۔'' زریں نے ٹکٹوں کا جائزہ لیا۔ ''بڑا مزہ آئے گا ہوائی جہاز میں۔''

''چپ کر۔ ہوائی جہاز میں تو میں کبھی بھی نہیں جاؤں گی۔'' اس بات پر دادو کی سوئی ایسی اٹکی کہ پھر ہلنے کا نام نہ لیا۔

''جہاز پر نہیں جائیں گے تو پھر کیسے جائیں گے؟'' زریں نے تنگ آ کر کہا۔

''میں تو ریل گاڑی کی چھک چھک سنتے ہوئے جاؤں گی۔'' انہوں نے بچوں والی ضد پکڑی۔

''اور یہ جو ابا جی نے ٹکٹ بھجوائے ہیں؟''

''تو کیا ہوا ٹکٹوں کا۔'' زبیدہ خالہ نے مداخلت کی۔ ''ماشاء اللہ پیسے والا ہے، اُسے چار ٹکٹوں سے بھلا کیا فرق پڑے گا۔''

''پر ریل کے ٹکٹ لائے گا کون؟''

''اللہ رکھے اپنے عمر کو وہی لائے گا۔''

اور جانے سے پہلے عمر نے زریں کی بہت منتیں کر کے تھوڑی دیر کے لئے فرحین سے ملاقات کی۔

''فرو، تمہارے ابا جی کہیں اور تو رشتہ طے نہیں کر دیں گے تمہارا؟''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔'' وہ گھبرا گئی۔ ''ہمارے ہاں زبان دے کر پھرتے نہیں جب تک کوئی معقول وجہ نہ ہو۔''

''اور اگر وہ اپنے جیسے پیسے والوں میں تمہارا رشتہ کرنا چاہیں تو تم کیا کرو گی؟'' فرحین نے ایک لمحے کو اسے دیکھا۔

''میں نے تمہارا ساتھ قبول کیا ہے تو مر کے بھی اس عہد کو نبھاؤں گی۔''

''تھینک یو فرحین۔ تم نے میرا بہت بوجھ ہلکا کر دیا ہے۔'' وہ ایک دم شانت ہو گیا۔

''اُدھر جا کر فون کرنا۔''

فرحین دھیرے سے ہنس پڑی وہ بہت خوش تھی۔

''پتا ہے مہینے کا آخر تھا اس لئے میں اے سی کے ٹکٹ نہیں لے سکا فرسٹ کلاس کے لایا ہوں۔''

''اتنے تکلفات۔'' فرحین ہنسی۔

''بھئی بڑے باپ کی بیٹی ہو۔''

''آ گئے ناں اپنی آئی پر۔ بہت چڑ آتی ہے ایسی باتوں سے، یہ تو تمہیں پہلے بھی پتا تھا کہ میں چودھری غلام محمد جنت مقام مربعے والے کی پوتی ہوں۔''

وہ دونوں ہنس پڑے۔ پھر اسی خوشگوار ملاقات کی یاد کے ساتھ فرحین باقی سب کے ساتھ اگلی صبح کی ریل سے کراچی روانہ ہو گئی۔ وہ یتیم صورت شیدا بھی ان کے ساتھ تھا۔

''شیدے بیٹے تم نے اپنے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں۔'' دادو نے اس سے پوچھا۔

''جی کوئی ایسی خاص گل بات ہے ہی نہیں میری۔'' وہ شرماتے ہوئے بولا۔ ''میرے والد صاحب قالین باف تھے بس وہیں سے دمے کا مرض لگ گیا انہیں۔ اب تو کوئی کام نہیں کر سکتے، ایک چھوٹا بھائی ہے اسے پڑھا رہا ہوں۔ ایک بہن کی شادی کر دی ہے، دو بہنیں اور ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ان کی شادی بھی جلدی کر دوں گا۔''

''تم نے قالین بافی نہیں کی؟'' زریں نے پوچھا۔

''نہیں جی! میری اماں نے نہیں کرنے دی۔ وہ کہتی تھیں کہ میں بھی مریض ہو جاؤں گا اپنے ابے کی طرح۔''

''بھائی کوئی مدد نہیں کرتا تمہاری؟''

''میں نے خود منع کر رکھا ہے، وہ ہے بہت لائق۔ ایف ایس سی کر رہا ہے بس چند سالوں کی بات ہے۔ میں نے کہہ رکھا ہے اس سے کہ اب ڈاکٹر بننے کے بعد ہی روزگار کے متعلق سوچنا ابھی صرف پڑھو۔'' وہ بتا رہا تھا۔ ''پتا ہے بی بی وہ انگریزی بھی بول لیتا ہے، مجھے تو بالکل سمجھ نہیں آتی کہ کیا کہہ رہا ہے۔ اتنی موٹی موٹی کتابیں پڑھتا ہے سب انگریزی کی۔'' اس کے لفظ لفظ میں بھائی کی محبت بول رہی تھی۔

''تم کتنا پڑھے ہوئے ہو؟''

''جی میں صرف پانچ جماعتیں پڑھا ہوں۔'' وہ افسردہ ہو گیا۔ ''میرے ابا جی بیمار ہو گئے تھے اس لئے نہیں پڑھ سکا۔''

''شیدے تم ہمیں بہت اچھے لگے ہو۔'' فرحین نے کہا۔ ''تم نے ہمیں بہت بڑی خوشخبری سنائی ہے اس کا تمہیں کچھ انعام بھی ملنا چاہیے۔''

پیاری بچیو، اب جلدی سے آ کر اپنے بابا کے سینے سے لگ جاؤ تا کہ اتنے برس کی اس ریگزار کی تپش کم ہو۔ میں سب کا انتظار کروں گا، ابا جی مجھے معاف کر دیں۔ اماں تو یوں بھی بہت مہربان ہیں، باقی باتیں آپ لوگوں کے آنے پر کروں گا۔

خدا حافظ۔

آپ کا گناہ گار بیٹا غلام رسول چوہدری۔''

خط پڑھ کر وہ دنوں ایک دوسرے سے لپٹ کر رو پڑیں۔

''ہم کل ہی ابا جی کے پاس چلے جائیں گے۔'' زریں نے اپنے آنسو پونچھے۔

''ہاں اب اور انتظار نہیں ہوگا۔'' فرحین نے کہا۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ سپنا سچ بھی ہو سکتا ہے، کتنی دعائیں مانگی تھیں اللہ تعالیٰ کے حضور۔''

''میں تو شکرانے کے نفل پڑھنے لگی ہوں۔''

''ایک منٹ زریں۔'' فرحین نے اسے روکا۔ ''یہ سوچو کہ دادی جی کو اس خبر کے متعلق کیسے بتائیں۔ ان کے لئے یہ خوشی بہت زیادہ ہوگی۔''

''ہاں!'' وہ سوچ میں ڈوب گئی۔ ''انہیں بہت احتیاط سے بتانا ہوگا۔''

''چلو اس بندے سے بھی بات کر لیں۔''

وہ دونوں برآمدے میں آ گئیں۔

''آپ کراچی سے آئے ہیں؟'' فرحین نے جرح کا آغاز کیا۔

''جی نہیں بی بی، یہیں لاہور سے آیا ہوں۔''

''پھر آپ کو یہ خط کیسے ملا؟''

''جی یہ لاہور برانچ کے منیجر نے دیا تھا۔ سیٹھ جی آر چوہدری کا کچھ کاروبار لاہور میں بھی ہے۔'' وہ بولا۔ ''منیجر صاحب چھٹی پر جا رہے تھے، جلدی میں تھے۔ کہہ رہے تھے کہ آپ سے معذرت کر لوں۔ وہ خود آنا چاہتے تھے لیکن کچھ مسائل کی وجہ سے نہیں آ سکے، انہیں ضروری چھٹی جانا تھا۔''

اس نے رٹے ہوئے طوطے کی طرح منیجر کا پیغام دہرایا۔

''اچھا!'' فرحین سوچ میں ڈوب گئی۔ ''آپ ابھی یہیں ٹھہریں۔''

وہ دادی جی کے پاس چلی گئی۔

''دادو اگر انسان کو بہت بڑی خوشی اچانک مل جائے تو اسے کیا کرنا چاہیے؟''

''اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔'' وہ جوڑے گن کر پیٹی میں رکھ رہی تھیں۔ ''اب میں کبھی سوچ سکتی تھی کہ تیرا رشتہ اتنی اچھی جگہ طے ہو جائے گا۔''

''دادی جی اگر آپ کو پتا چلے کہ اب کسی وجہ سے بغیر ہاتھ پیر ہلائے مجھے بہت زیادہ جہیز مل جائے گا تو؟''

''باؤلی ہوئی ہے کیا، کبھی کسی کو بغیر ہاتھ پیر ہلائے بھی کچھ ملتا ہے۔''

''فرض کریں ایسا ہو جائے۔ مثلاً کوئی آ کر یہ کہے کہ یہ سامان آپ کے بیٹے نے بھیجا ہے پھر؟''

اب کے دادی جی اس کی طرف مڑیں۔ ''کیوں میرا دل دکھانے کی بات کرتی ہے۔''

''دادو! میں آپ سے پوچھ رہی ہوں اور آپ ہیں کہ میری بات کا جواب ہی نہیں دیتیں۔ آپ کیا کریں گی؟''

''میں یہ سامان لانے والے سے کہوں گی کہ مجھے یا میری پوتیوں کو سامان کا لالچ نہیں ہے۔ ہیرے موتی بھی کبھی ماں یا بیٹیوں کے آنسو پونچھ سکتے ہیں۔ میں کہوں گی کہ اگر بیٹے کو اتنا خیال ہے تو یا خود آ جائے یا پھر ہمیں اپنے پاس بلا لے۔'' انہوں نے رخ پھیر لیا۔

''اور دادو! اگر وہ شخص کہے کہ آپ کے بیٹے نے آپ کو بلایا ہے تو پھر؟''

''آج کیا دیوانوں کی سی باتیں کر رہی ہے۔'' وہ پھر اس کی جانب مڑیں۔

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا؟ اس میں دیوانگی کی کیا بات ہوئی۔''

''اللہ تعالیٰ کی رضا ہو تو پھر کیا نہیں ہو سکتا۔ میں نے کتنی مرتبہ ایسا خواب دیکھا ہے۔''

''اور اگر میں یہ کہوں کہ آپ کی دعائیں قبول ہو گئی ہیں۔''

''کیا کہہ رہی ہے؟'' وہ بے یقینی سے بولیں۔ ''کیا میرا بیٹا آ گیا ہے؟ اتنی دیر سے کیا بک بک کر رہی تھی۔''

فرحین نے بہت آرام، بہت احتیاط سے انہیں تمام بات بتا دی۔ خالہ زبیدہ کو جیسے ہی اطلاع ملی وہ دوڑی چلی آئیں۔ دادو نے پورے محلے میں مٹھائی تقسیم کی۔

''اب تو اماں آپ بھی ہوائی سفر کے مزے لینا۔'' خالہ زبیدہ نے کہا۔ ''پھر مجھے بتانا کہ اوپر بادل کیسے لگتے ہیں۔''

''اے میں کون سا ہوائی جہاز پر جاؤں گی مجھے تو بہت ڈر لگتا ہے۔''

''پتا ہے خالہ ہماری دادو گھوڑے پر کراچی جائیں گی۔'' فرحین ہنسی۔ ''اپنے گھرو کے

''اماں جی آپ کی پوتیاں مل جائیں گی۔'' ایک ڈاکٹر نے انہیں ملامت بھرے انداز میں دیکھ کر بڑھیا کو دلاسا دیا۔ ''لائیں یہ مجھے دے دیں۔'' اس نے دونوں بازو لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔''

''نہیں یہ میں نہیں دوں گی۔'' وہ پیچھے ہٹی۔ ''انہوں نے اپنے باپ سے ملنے جانا ہے، آگے ہی دیر ہوگئی ہے۔ ٹھہرو میں اپنی فروا اور زریں کو تلاش کرلوں، میں ان کے منہ پر پیار کروں گی۔ دونوں یوں ہی مجھ سے مذاق کرتی ہیں، ابھی جب میں پیار کروں گی تو ہنستے ہوئے اٹھ کھڑی ہوں گی۔''

''انہیں آرام سے لے جا کر ایمبولینس میں لٹا دو اور مرہم پٹی کراؤ فی الحال یہ شاک میں ہیں۔'' ایک ڈاکٹر نے دوسرے ڈاکٹر سے کہا۔

☆======☆======☆

''پاکستان کے معیاری وقت کے مطابق رات کے نو بج چکے ہیں۔ آج کراچی کے قریب لاہور سے کراچی جانے والی ریل گاڑی میں بم کے دھماکے کی وجہ سے چالیس افراد جاں بحق اور سو کے قریب زخمی ہو گئے۔ جن میں سے تیس کی حالت نازک بتائی جاتی ہے۔ وزیر اعظم اور صدر نے اپنے الگ الگ پیغامات میں حادثے پر دلی رنج و غم کا اظہار کیا اور کہا ہے کہ اس واقعے کے ذمہ دار افراد کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔

حادثے کی تحقیقات کے لئے ہائیکورٹ کے جج کی نگرانی میں ایک کمیٹی قائم کر دی گئی ہے جو جلد ہی حکومت کو اپنی رپورٹ پیش کرے گی۔ حکومت کی طرف سے اس بات کا بھی اعلان کیا گیا ہے کہ مرنے والوں کے لواحقین کو پچاس پچاس ہزار روپے اور زخمی ہونے والوں کو پچیس پچیس ہزار روپے معاوضہ ادا کیا جائے گا۔''

☆======ختم شد======☆